

اُردو کے مزاحیہ افسانے



انتخاب و مقدمہ

ڈاکٹر مظہر احمد

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

اردو
کے مزاحیہ افسانے

(انتخاب و مقدمہ: ڈاکٹر مظہر احمد)

اردو کے مزاحیہ افسانے

انتخاب ومقدمہ: ڈاکٹر مظہر احمد

پتہ: 2128 ایم۔پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی۔۲
E-mail: mazhar.ahmed@hotmail.com

اشاعت : 2009ء

طباعت : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

ناشر : ایم۔آر پبلی کیشنز
3871، چوتھی منزل، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

ISBN:81-88413-69-0

M.R.PUBLICATIONS

Communication Address:
3871, 4th Floor, Kalan Mahal,
Daryaganj, New Delhil-110002

Shop
1645, Patuadi House
Daryaganj, New Delhil-110002
Cell: 9810784549, 9211532140
E-mail: abdus26@hotmail.com

Urdu ke Mizahia Afsaney Price: Rs.220/- $10
By: **Dr. Mazhar Ahmad** Library Edition : Rs.340/- $ 14

انتساب

اُستادِ محترم

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی صاحب

کی خدمت میں

فہرست

اردو کے مزاحیہ افسانے

انتخاب و مقدمہ
ڈاکٹر مظہر احمد

ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

مقدمہ

مولانا الطاف حسین حالؔی نے ''مزاح'' سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لئے (نہ کہ کسی کا دل دکھانے کے لئے) کیا جائے۔ ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا یا ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے۔ جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہوجاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفہ وحکما بلکہ اولیاء وانبیاء نے بھی کیا ہے۔ اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جودت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہو جاتا ہے''۔ (مقالاتِ حالی۔ مولانا حالؔی، مضمون ''مزاح''، ص۱۳۹)۔

اس اقتباس میں مولانا حالؔی نے مزاح کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، جس کی مدد سے ہم انسانی فطرت کے اس خاص پہلو کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ بقول حالؔی مزاح کا مقصد اگر کسی کا دل دکھانا، یعنی اسے تکلیف دینا، اس کا مذاق اُڑانا یا کسی پر پھبتی کسنا، یا پھکڑ پن پر اُتر آنا (یہ تمام اوصاف مزاح کی خامیوں میں شمار ہوتے ہیں) نہ ہو بلکہ محفل کو زعفران زار بنانا ہو تو ایسا مزاح ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، یعنی فرحت وراحت پہنچانے والا اور ایک سہانی خوشبو کی لپٹ یعنی ایک انبساطی کیفیت کا پروردہ ہوتا ہے۔ یعنی مزاح کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس سے دلوں کو فرصت ملتی ہے اور محفل پر شگفتگی طاری ہو جاتی ہے چنانچہ یہ مشاہدہ عام ہے کہ ایسی محفل جس میں کوئی ظریف اپنی لن ترانیوں سے لوگوں کے دلوں کو

گدگداتا ہے تو وہاں موجود وہ اشخاص جو داخلی پریشانیوں کا شکار ہو کر ایک دائمی حزن کی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں، چند ساعتوں کے لئے ہی سہی، اس مزاح کی گرفت میں آجاتے ہیں اور یوں مزاح نگار ایک اہم فریضہ کی ادائیگی کا سبب بنتا ہے۔ یعنی وہ پژمردہ دلوں کو تابندگی دیتا ہے۔ عمدہ، برجستہ اور باموقع مزاح ذہن و دل کو تیزی و چستی عطا کرتا ہے اور یوں مردہ دل بھی جی اٹھتے ہیں۔ یہ صورتِ حال مزاح نگار کی تقدیر کے لئے ساعتِ نیک ثابت ہوتی ہے۔ وہ ہر دل عزیزی اور مقبولیت کے مدارج طے کرتا چلا جاتا ہے۔

قدرت نے انسان کو ''ہنسی'' نام کی ایک ایسی بیش بہا دولت عطا کی ہے کہ جس کے سبب وہ اپنی تلخاب زندگی، ناکامی و نامرادی، پژمردگی اور بے چارگی کی کیفیات سے چٹکارا حاصل کرتا رہتا ہے۔ وہ خود پر بھی خندہ زن ہوتا ہے اور اپنے حالات پر بھی۔ آس پاس کے تغیرات پر بھی قہقہہ لگاتا ہے اور زندگی کی ناکامیوں اور ناتمامیوں پر بھی ہنستا ہے۔ عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن پر بھی مسکراتا ہے اور زائد توانائی کے اخراج کے لئے بھی قہقہے لگاتا ہے اور یہی ہنسی جب کسی فنکارانہ اظہار کا ذریعہ بنتی ہے تو مزاح پیدا ہوتا ہے۔

مزاح کسی عمل، خیال، صورتِ حال، قصے، لفظ یا جملے کے مضحک پہلو کو دریافت کر کے اسے ادبی شکل میں پیش کرنے کا نام ہے۔ بقول اسٹیفن لیکاک:

> ''مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے۔ جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے''۔ (بحوالہ اردو ادب میں طنز و مزاح۔ وزیر آغا)

لیکاک مزاح نگار کے موضوع سے ہمدردانہ تعلق کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب تک زندگی کی ناہمواریوں پر ہمدردانہ نگاہ نہیں ڈالی جائے گی تب تک اعلیٰ مزاح کے نمونے سامنے نہیں آئیں گے۔ اسی لئے مزاح نگار کے یہاں مشاہدے، دیدۂ بینا اور حقیقتوں کے ادراک کے ساتھ ساتھ صحیح و غلط میں توازن اور اس کے عرفان کی صلاحیتوں کا ہونا لازمی ہے۔

مزاح زندگی کی تلخیوں اور غموں کی شدّتوں کو کم کر دیتا ہے۔ بقول مشتاق احمد یوسفی:

> ''قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے دار سہی لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جاسکتا۔ نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے ہاں! ریگستان کے شدائد کم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز، اندوہ وانبساط، کرب ولذت کی منزلوں سے بے نیازانہ گزر جانا بڑے حوصلے کی بات ہے۔(تزکِ یوسفی، زرگزشت، ص۳)

☆☆☆☆

اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت زمانۂ قدیم سے موجود ہے، شاعری میں جعفر زٹلی اور نثر میں مرزا غالبؔ کے خطوط اس کی ابتدائی اشکال ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ طنز ومزاح کوئی صنفِ سخن نہیں بلکہ ایک طرز یا اسٹائل ہے لہٰذا اس کے ارتقا کی تاریخ دراصل مختلف اصناف ادب کے ارتقا کی تاریخ میں مضمر ہے داستان، ناول، انشائیہ، خاکہ، مضمون، افسانہ وغیرہ میں طنز ومزاح کے نقوش بکثرت ملتے ہیں اور جب ہم اردو نثر میں طنز ومزاح کی روایت کی بات کرتے ہیں تو دراصل ان اصناف کے حوالے سے ہی کرتے ہیں (تقریباً یہی صورتِ حال شاعری کی بھی ہے) یوں تو داستانوں میں بھی طنز ومزاح کے نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر باضابطہ اور باشعور کاوش کے تعلق سے خطوط غالبؔ کو ہی نقشِ اوّل کہا جاسکتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں طنز اور مزاح دونوں طرزوں کو بخوبی برتا اور اس طرح پیش رووٴں کے لئے ایک مثال قائم کی۔

بعد از غالبؔ عہد جدید کے تقاضوں کے تحت ۱۸۷۷ میں اودھ پنچ کے اجرا کے ساتھ اردو میں اس نوع کے ادب کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جانے لگی اور بڑی تعداد میں شعراو مصنفین نے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے اس طرزِ خاص کا استعمال کیا۔ ہنسی

ہنسی میں اصلاح کے پہلو تلاش کر لینا، کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ کر فرد و سماج پر طنز کرنا اس دور کے ادبا کا خاص شیوہ تھا۔ مغربی ادب کے اثرات نے بھی طنز و مزاح کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ مزاحیہ ناول اور مضامین بکثرت لکھے جانے لگے۔ محمد حسین آزاد کا مزاحیہ کردار ''خوجی'' اور منشی سجاد حسین کا ''حاجی بغلول'' اسی دور کی یادگار ہیں اور پھر تو مزاحیہ کرداروں (ہم زادوں) کا سلسلہ طنز و مزاح میں عام ہو گیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اردو ادب میں اس طرز کے نمونے سنجیدہ ادب کے علی الرغم اعتبار کی سند پانے لگے اور بڑی تعداد میں ادبا نے معیاری اور اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا۔ یہاں ناموں کو دہرانے اور ان پر جستہ جستہ تبصرے کرنے کا موقعہ نہیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بھی طنز و مزاح نے فروغ پایا۔ طنز کے افادی پہلو نیز سماج میں پھیلی برائیوں اور کمیوں پر اس کے صف آرا ہونے کی صلاحیت نے ترقی پسندوں کو اس جانب متوجہ کیا اور عظیم طنزیہ ادب وجود میں آیا۔ اس طنزیہ ادب کے پہلو بہ پہلو خالص مزاح کے نمونے بھی کثرت سے نظر آنے لگے۔

جہاں تک مختلف اصناف میں طنز و مزاح کی آمیزش کا تعلق ہے تو ہمارے یہاں باقاعدہ مزاحیہ ناول نگاری کی روایت موجود ہے۔ مزاحیہ مضامین کا سلسلہ تو از اول تا آخر جاری ہی ہے۔ خاکہ میں طنز و مزاح ایک ناگریز عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز سفر ناموں، انشائیوں وغیرہ میں بھی اس نوع کے ادب کے نمونے موجود ہیں۔ اردو افسانے کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ طنز ایک غالب عنصر کی حیثیت سے ہمارے افسانے کی فضا پر حاوی ہے۔ خاص کر ترقی پسند افسانے کا ایک خاص اسلوب یہی طنز ہے جو فرد و سماج میں در آنے والی خامیوں، برائیوں، کجیوں کے خلاف صف آرا ہوتا ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو مزاحیہ افسانے کی روایت بھی موجود ہے۔ جن میں طنز کے مقابلے مزاح کا عنصر غالب ہے اور جن کا مقصد محفلوں کو زعفران زار بنانا اور مردہ دلوں میں زندگی کے آثار پیدا کرنا ہے۔ اردو میں دو قسم کے مزاحیہ افسانہ نگار ہیں۔ اوّل وہ جنہوں نے باقاعدہ مزاحیہ افسانہ

نگاری کی اور اپنی تخلیقات اسی عنوان کے تحت اخبار و رسائل میں شائع کرائیں نیز مزاحیہ افسانوں کے مجموعے بھی شائع کیے۔ ان جواں مردوں میں چودھری محمد علی ردولوی، ظریف دہلوی، سید رفیق حسین، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، کرشن چندر، وجاہت علی سندیلوی، شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر، مسعود مفتی، جمال درانی وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ دوسری قسم ایسے تخلیق کاروں کی ہے۔ جنہوں نے اپنے مزاحیہ افسانے، مضامین کے مجموعوں میں ضم کر دیئے اور اس طرح ان کی شناخت دشوار ہوگئی۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اردو میں مزاحیہ مضمون کی روایت اتنی مستحکم ہوگئی کہ اکثر تخلیق کاروں نے اپنے مزاحیہ افسانے بھی اسی عنوان کے تحت شائع کرادیئے کہ ان میں زندگی کی ہماہمی، کرداروں کی عمل داری اور مکالموں کی چستی کے ساتھ ساتھ ایک ممکنہ وحدتِ تاثر بھی موجود ہوتا تھا اور انہیں باآسانی مزاحیہ افسانہ کا عنوان دیا جاسکتا تھا۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ ایسے مضامین جن میں کہانی کے تمام عناصر موجود ہوں اور افسانے کے ایک اہم جز یعنی وحدتِ تاثر کی واضح پہچان ہو نیز کہانی بامعنی و بامقصد اختتام سے بھی ہمکنار ہو، ایسے مزاحیہ مضامین دراصل، افسانہ کے ذیل میں رکھے جانے چاہئیں اور ہم نے ایسے ہی کئی مضامین/افسانوں کو اس انتخاب میں جگہ دی ہے۔

وہ کون سے عناصر ہیں کہ جن کے سبب افسانہ مزاحیہ ہوسکتا ہے۔ ہماری ناقص رائے میں افسانے کے اجزائے ترکیبی یعنی پلاٹ، کردار، مکالمہ، نقطۂ عروج، وحدتِ تاثر میں سے زیادہ سے زیادہ اجزاء کا مضحک ہونا ہی افسانے کو مزاحیہ کے ذیل میں لے آتا ہے۔ ایسی کہانی جو اپنے جزئیات میں واقعات کا ایک ایسا تانا بانا بنتی ہے، جس سے ہنسی کو تحریک ملے، افسانے کو مضحک بناتی ہے۔ واقعہ کی مضحکہ خیزی، ضمنی واقعات میں لطائف کی آمیزش بھی افسانے کو مضحک بنانے میں معاونت کرتی ہے۔ مزاحیہ کرداروں کے ذریعے بھی مزاح نگاروں نے واقعہ نگاری کی ہے اور ان کی مضحک عادتوں، حرکات وسکنات اور مضحک تبصروں کے ذریعے افسانے کی فضا کو شگفتہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ صورتِ

حال کی ڈرامائیت اور واقعہ کی ترتیب میں اُلٹ پھیر سے بھی مزاحیہ افسانے کی تخلیق ممکن ہے اسی طرح چھوٹے چھوٹے واقعات کے تسلسل یا لطائف کے پے بہ پے استعمال نے بھی مزاحیہ افسانے کے اسلوب کو جنم دیا ہے۔ ایک سنجیدہ کہانی کو مزاحیہ اسلوب میں بیان کردینے سے بھی مزاحیہ افسانہ نگاری کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔ زبان و بیان کی ندرتوں، الفاظ کے الٹ پھیر، مضحک تشبیہہ واستعارات وعلامات کا استعمال، نیز مزاحیہ مکالموں کے ذریعے بھی افسانہ نگار افسانے کو مضحک بناسکتا ہے۔ دراصل کہانی کے ساتھ افسانہ نگار کا Theatment اور اس کا اسلوب ہی واقعہ نگاری میں اہمیت کے حامل ہیں۔ نیز فرد وسماج اور زندگی پر اس کے بے لاگ تبصرے جن میں مزاح کے پس منظر میں اصلاح کا پہلو چھپا ہوتا ہے۔ مزاحیہ افسانے کو کامیاب بناتے ہیں۔ ہمارے انتخاب میں شامل اکثر افسانے ان ہی خصومیات کے پروردہ ہیں اور یہی ان کی موجودگی کا جواز ہے۔

☆☆☆☆

ہمارے انتخاب میں شامل پہلا مزاحیہ افسانہ چودھری محمد علی ردولوی (پ ۱۸۸۲ء) کا بعنوان ''میٹھا معشوق'' ہے۔ چودھری صاحب کا نام نامی کس تعارف کا محتاج ہیں اور نہ یہاں ہمارا مقصد ان کے حالاتِ زندگی اور دیگر کوائف پر اظہار خیال کرتا ہے کہ اہل نظر ان کے نام اور کام سے کماحقہ، واقف ہیں، یہاں صرف ان کے افسانے کا مختصر تعارف اور انتخاب میں شمولیت کے جواز پر ہی روشنی ڈالی جائے گی۔ ''میٹھا معشوق'' عنوان ہی دامن دل اپنی طرف کھینچتا ہے، اور قاری ایک زیرِ لب تبسّم سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ مگر افسانے کی قرأت ایک مختلف صورت حال ہمارے سامنے لاتی ہے۔ افسانے کا واحد متکلم یعنی مصنف اپنے ایک قریبی دوست کا قصہ اس چیلنج کے ساتھ سنانا شروع کرتے ہیں کہ ''بھلا بتایئے تو اس کا ہیرو کون ہے''۔ یہ ایک طویل سفر کی کہانی ہے، جو کئی منزلیں طے کرتے ہوئے لکھنؤ پر اختیام پذیر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب اپنے پورے ساز وسامان کے ساتھ محوِ سفر ہیں اور زادِ راہ کے لئے مٹھائی کی ایک ٹوکری بھی ساتھ ہے کہ مرزا صاحب کو مٹھائی بہت پسند ہے، اور اسی

لئے اس کے چوری ہو جانے کا خدشہ ہر وقت ان کے حواس پر سوار رہتا ہے۔ لہٰذا سفر کی منزلوں پر مٹھائی کی حفاظت کا نہایت سخت انتظام کیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب مزاجاً شکی ہیں۔ اس لئے نوکر کے بجائے مٹھائی کی حفاظت پر منشی جی معمور کئے جاتے ہیں۔ پہلی رات کی صبح منشی جی یہ جانکاہ خبر مرزا صاحب کو سناتے ہیں کہ مٹھائی کا کچھ حصہ کھالیا گیا ہے۔ شک ملازم پر ہی ہوتا ہے مگر ثبوت نہ ہونے کے باعث خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔

اگلی رات بھی مٹھائی پر ہاتھ صاف کیا گیا کبھی کسی جانور پر شک کیا گیا اور کبھی کسی اور شخص پر مگر نوکر پر سب سے زیادہ شک کیا گیا کہ اسی نے مٹھائی کی چوری کی خبر دی تھی۔ باز پرس کرنے پر بھی نوکر کی چوری پکڑی نہ جا سکی اور اس کشمکش میں قافلہ لکھنؤ پہنچ گیا جہاں مرزا صاحب کو ایک مقدمے کی پیروی کرنی تھی۔ ایک بار پھر اپنی عزیز اور لذیذ مٹھائی کو نوکر کے حوالے کر کے وہ کچہری تشریف لے گئے۔ مگر چوری کا خدشہ لگا رہا اور مقدمے میں دل نہیں لگا۔ عجلت میں مقدمے کے کاغذات بھی گھر بھول آئے۔ کاغذات لینے جب گھر واپس آئے تو نوکر چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا جو نہایت ہوشیاری سے پنجوں کے بل چل کر کتے کے پاؤں کے نشان بھی بناتا جا رہا تھا اور مٹھائی پر ہاتھ بھی صاف کرتا جا رہا تھا۔

افسانے کا آخری حصہ جہاں نوکر چوری کرتے پکڑا جاتا ہے۔ اپنی جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ مضحک منظر نگاری کی بھی عمدہ مثال ہے۔ افسانے کے اس کلائمکس پر آ کر قاری کو شگفتگی کی ایک خوشگوار فضا کا احساس ہوتا ہے اور یوں یہ افسانہ تبسمِ زیرلب کا موجب ہو جاتا ہے۔

افسانے کے درمیان مصنف ناظرین سے براہ راست مخاطب ہو کر قصے کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ بھی کرتا جاتا ہے۔ محاوروں، ضرب الامثال اور کہاوتوں کے عمدہ استعمال نے افسانے کو زبان و بیان کی سطح پر بھی اہم بنا دیا ہے۔ لکھنوی تہذیب و زبان کی عمدہ عکاسی بھی افسانے کو مؤثر بناتی ہے۔ بے تکلف گالیوں (مغلظات نہیں) نے بھی افسانے کی فضا کو مزاحیہ بنانے میں تعاون دیا ہے۔

ہمارے انتخاب کا اگلا افسانہ بعنوان ''گھر ہے جس کے مصنف آوارہ (۱۸۹۰ـ۱۹۸۷) ہیں۔ مختصر سا یہ افسانہ اپنی شگفتہ فضا، مزاحیہ مکالموں کے ساتھ ساتھ پلاٹ کے پُر از مزاح ہونے کے سبب انتخاب میں شامل ہوا ہے۔ اس کی کہانی یوں ہے کہ دو دوست جن میں ایک حکیم صاحب اور دوسرے ان کے مصاحب چُنن ہیں، مکان بنانے کا پروگرام ترتیب دے رہے ہیں۔ افسانہ مکالمہ کی فارم میں تصنیف کیا گیا ہے اور دونوں دوستوں کی گفت وشنید کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ حکیم صاحب عالمِ تخیل میں اپنے خوابوں کا محل تعمیر کرتے جاتے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ جس کی مدد سے کچی زمین پر مکان کا خیالی نقشہ بھی بناتے جاتے ہیں۔ چُنن میاں ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور پھر جوش میں آکر خود بھی حکیم صاحب کے برابر میں اپنے مکان کا سنگِ بنیاد رکھ دیتے ہیں، مختلف نقشوں کے ذریعے زمین پر، زمین آسمان کے قلابے ملاتے ملاتے اچانک پرنالوں کے رخ اور ان سے گرنے والے پانی پر تنازعہ شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ لڑائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بات ہی بات میں نوبت کورٹ کچہری کی آجاتی ہے۔ چنانچہ چُنن صاحب زمین پر بنے ہوئے خوابوں کے محل کو پاؤں سے روندھ کر گھر کے مسئلے کو ہی تمام کر دیتے ہیں۔

مکالموں کی برجستگی اور زبان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کہانی کے فطری بہاؤ نے اس افسانے کو کسی قدر اہم بنادیا ہے۔ خیال پلاؤ پکا کر اسے طول دینا اور پھر نوبت فساد کی آجانا، الم کے ساتھ ساتھ طرب کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ واقعہ کی مضحکہ خیزی افسانے کی مجموعی شگفتگی میں اضافہ کر رہی ہے۔

علامہ مضحک دہلوی کا طویل مزاحیہ افسانہ ''عینک اُتر جانے کے بعد'' صرف یہ کہانی بیان کرتا ہے کہ ایک یک چشم شخص کی شادی ہوتی ہے اس کے والدین نہایت محبت کے ساتھ بہو گھر لاتے ہیں۔ لڑکا چونکہ باعیب ہے لہٰذا زن مریدی میں ہی عافیت محسوس کرتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں پر ہر وقت ٹکی ہوئی عینک سے بہو تنگ آجاتی ہے اور بار بار حیلے بہانے سے اُسے اتار دینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر رشید (کہانی کا ہیرو) عینک کو

اپنی آنکھوں سے الگ نہیں کرتا کہ ایسا کرنے پر اس کا بھینگا پن ظاہر ہو جائے گا اور وہ بیوی جو شوہر پر دل و جان سے فریفتہ ہے، اُس سے نفرت کرنے لگے گی۔

علامہ مضحک دہلوی کا قلم اس وقت اپنے جوہر دکھاتا ہے کہ جب وہ عورتوں کے مکالمے قلمبند کرتے ہیں، بات بات میں مزاح، لفظ لفظ میں شرارت اور شوخی، دلّی کی عورتوں کے محاوروں اور ضرب الامثال کے برجستہ استعمال نے بھی اس افسانے کو اہم اور منفرد بنادیا ہے۔ واقعات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اور مناظر کی جزئیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے علامہ کا قلم بیباک اور مضحک ہو جاتا ہے۔

افسانے کا دلچسپ اور پر از مزاح حصہ وہ ہے کہ رشید میاں یک چشم ہونے کے سبب نیز آنکھوں پر عینک لگائے رکھنے کی وجہ سے بات کسی سے کرتے تھے اور دیکھتے کسی اور کی طرف تھے۔ کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ کے مصداق ان کی بیگم شک وشبہ میں گرفتار ہو جاتی ہیں کہ باورچی خانے میں رشید بات بیگم سے کرتے تھے مگر دیکھتے "ماما" کی طرف تھے۔ رقابت کا جذبہ سر پڑھ کر بولتا ہے اور بیگم ناراض ہو جاتی ہیں۔ صورتِ حال بجائے خود مضحک ہے اور علامہ نے اپنے اسلوب بیان کی بے ساختگی سے اور بھی مضحک بنادیا ہے۔

افسانے کے آخر میں بیگم میکے جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ رشید مجبوراً سسرال چلے آتے ہیں، ایک صبح بیگم خدا کے حضور دعا کرتی ہیں کہ میرے میاں کی ٹیڑھی نگاہ کو سیدھا کردے اشارہ ماما کی طرف ہے، زار و قطار رونا شروع کرتی ہیں۔ رشید گھبرا کر اٹھتے ہیں اور جلد بازی میں عینک لگانا بھول جاتے ہیں اور اس طرح بیگم پر حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ بقول علامہ

"لے دیکھ میاں کی ٹیڑھی نگاہ اور اپنے مغالطہ سے آگاہ ہو جا۔"

علامہ مضحک دہلوی کا مذکورہ افسانہ کوئی وسیع پلاٹ تو نہیں رکھتا مگر مضحک واقعہ نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ عورتوں کی ٹکسالی زبان، دہلوی زبان و تہذیب کی نمائندگی، پختہ اسلوب اور اندازِ بیان سے مزاح نگاری کے اوصاف نے اسے خاصے کی چیز بنادیا ہے۔

انتخاب میں شامل اگلا افسانہ بعنوان "ولی کامل" از ظریف دہلوی (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۵ء)

ہے، ظریف دہلوی، دہلوی زبان واسلوب کے ایک منفرد ادیب ہیں۔ جنہوں نے باقاعدہ مزاحیہ افسانے تصنیف کرکے اس صنفِ خاص کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ افسانہ ''ولی کامل'' ان کے کامیاب مزاحیہ افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی ندرتوں کے ساتھ ساتھ کہانی کے جزوی مضحک پہلوؤں سے ظریف دہلوی نے کامیاب مزاح نگاری کی ہے۔ کہانی یوں ہے کہ ایک شخص کو ۱۰۴ ڈگری بخار ہے وہ اپنی بیوی اور ڈاکٹر سے اس بخار کے سبب بہکی بہکی باتیں کررہا ہے۔ اہلیہ کو شبہ ہے کہ ان کے شوہر کو سرسام ہوگیا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر اس سے انکار کررہا ہے، مریض اپنے وصال یعنی انتقال کے متعلق پیشن گوئی کرتا ہے اور پھر اپنے مرنے کا قصہ بیان کرتا ہے۔ سرسام کی حالت میں وہ ایک پُر مزاح کہانی سناتا ہے۔ جس میں اس کے جنازے کے جلوس کا احوال بھی شامل ہے۔ چونکہ ولی کامل ہے لہٰذا مرید بطورِ تبرک اس کی داڑھی کے بالوں کو کھینچ کھینچ کر الگ کردیتے ہیں اور پھر جنازہ واپس لے لیا جاتا ہے کہ اللہ کے دربار میں ایسے ولی کا داڑھی کے بغیر جانا مناسب نہیں۔ بیگم اپنی چوٹی کاٹ کر ولئی کامل کے منہ پر بطور داڑھی لگادیتی ہیں۔ اس ہیئتِ عجیب کو دیکھ کر منکر نکیر حیران ہوجاتے ہیں۔ مگر حضرت جبرئیل یہ کہہ کر کہ اللہ کے خاص الخاص بندے ہیں انہیں خدا کے حضور لے کے جاتے ہیں۔ یہ تمام واقعات دیوانے کی بڑ معلوم ہوتے ہیں اور سرسام میں مریض کا یوں بہک جانا عام مشاہدہ ہے۔ مگر مریض کے ذریعے اس مضحکہ خیز واقعہ کا بیان افسانہ کو دلچسپ اور مضحک بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

مریدوں کے ذریعے داڑھی کا ایک ایک بال نوچ لینا اور اس کے تدارک میں بیگم کا اپنی چوٹی کاٹ کر داڑھی کی جگہ چپکا دینا واقعے کی مضحکہ خیزی ظاہر کرتا ہے اور قاری کے لبوں پر ایک پرکیف مسکراہٹ کا موجب بنتا ہے۔

سید رفیق حسین (۹۵-۱۸۹۴-۱۹۴۷ء) کا افسانہ ''حضت وہ تو نکل گئے'' مزاحیہ فنتاسی کی عمدہ مثال ہے۔ افسانے کا تانا بانا ایک تانگے والے کی روداد کے اردگرد گھومتا ہے۔ جسے لکھنؤ میں مصنف اور ان کے ایک دوست نے دن بھر کے لئے کرایے پر

سیر کے لئے ٹھہرایا تھا۔ افسانے کا مرکزی کردار غبن میاں دورانِ سفر ایک نہایت دلچسپ مزاحیہ کہانی بیان کرتا ہے۔ ابتدا میں غبن میاں کی زبان کی ندرت کہ جو ہر لفظ میں نون غنہ کا اضافہ کرتے جاتے ہیں، مزاحیہ صورت حال پیدا کرتی ہے۔ غبن میاں بار بار تانگہ رکوا کر افیون کے چھینٹے بھی اُڑاتے جاتے ہیں اور اپنی نہایت دلچسپ اور بعید از فہم کہانی بھی سناتے جاتے ہیں۔ دونوں مسافر ابتدا میں کہانی میں دلچسپی نہیں لیتے مگر پھر کہانی میں اُن کی دلچسپی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے غبن میاں اپنے اُستاد کے ہوا میں اُڑنے کی ریاضت کی کہانی سناتے ہیں۔ اُستاد نے ہوا میں اڑنے کی اتنی ریاضت کر لی ہے کہ ان کا وزن گھٹتے گھٹتے انتہائی کم ہو گیا ہے اور نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ اکثر انہیں رسّیوں سے باندھ کر رکھنا پڑتا ہے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ ہوا میں اوپر کی طرف اُٹھنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہانی کا راوی انتہائی دلچسپ انداز بیان کے ساتھ کہانی سناتا چلا جاتا ہے اور افیون کے نشے میں اضافہ بھی کرتا چلا جاتا ہے۔

کہانی کا اختتام نہایت مضحک صورتِ حال پر ہوتا ہے کہ تانگے والے کے استاد ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہو کر فضا میں بلند ہو جاتے ہیں اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ افسانے کے عنوان کا جواز بالکل آخر میں واضح ہوتا ہے کہ جب غبن میاں یہ الفاظ ادا کرتے ہیں کہ اے حضت وہ تو نکل گئے، اور اس پر مسعود کا یہ تبصرہ کہ کیوں جی اُستاد اب بھی چلے جا رہے ہوں گے؟ نہ معلوم کہاں تک چلے گئے ہوں گے، نہ معلوم کب تک چلے جائیں گے"۔ وقتاً فوقتاً غبن میاں کا افیون کے چھینٹے اُڑانا، کہانی کی فنتاسی پر دلالت کرتا ہے کہ افیونی دون کی لینے لگتا ہے اور بے سروپا اور غیر حقیقی باتیں مبالغے کے ساتھ بیان کرنے لگتا ہے۔ بعید از حقیقت اس واقعے میں کہانی کا تجسّس بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے اور نقطۂ عروج کی مزاحیہ صورت حال نے اسے ایک دلچسپ مضحک افسانہ بنا دیا ہے۔

سید رفیق حسین نے لکھنوی زبان و تہذیب کی عمدہ نمائندگی بھی اس افسانے میں کی ہے۔ غبن میاں کے نون غنہ والے تلفظ سے ابتدا میں عملی مزاح نگاری بھی کی ہے۔ نیز

روزمرہ اور محاوروں کا نہایت برجستہ استعمال بھی اس افسانے کی خصوصیت ہیں۔

ہمارے انتخاب میں شامل اگلا افسانہ یکّہ از عظیم بیگ چغتائی (۱۸۹۵۔۱۹۴۱ء) ہے۔ عظیم بیگ چغتائی اردو طنز و مزاح کا ایک معتبر نام ہے، انہوں نے اپنے مزاحیہ افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اس نوع کے ادب میں خوب افسانہ کیا۔ ان کے مزاج میں فطری بہاؤ تھا اور وہ اپنے موضوعات عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی بوالعجبیوں اور معمولی واقعات کی نیرنگیوں سے اُٹھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں مزاحیہ پلاٹ کی اہمیت زیادہ ہے اور مضحک واقعات کا تسلسل ہمہ وقت قہقہہ زار بن کر سامنے آتا ہے۔ افسانہ ''یکّہ'' کی کہانی صرف اتنی ہے کہ مصنف ایک نواب صاحب اور ان کی نازک اندام اہلیہ کے ساتھ موٹر پر محوِ سفر ہے کہ اچانک موٹر خراب ہو جاتی ہے اور ان تینوں کو مجبوراً ایک یکّے پر اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا ہے۔ نواب صاحب اور ان کی اہلیہ کی یہ یکّہ پر پہلی سواری ہے۔ حُسنِ اتفاق کہ راستہ ناہموار ہے۔ چنانچہ یکّے کی روانی اور راستے کی ناہمواری ہر ہر موڑ پر مزاحیہ صورت حال سامنے لاتی ہے اور ان دونوں کی حالت مضحکہ خیز ہوتی چلی جاتی ہے، مصنف بھی تکلیف میں ہے، چونکہ خدمت گار ہے لہٰذا برداشت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

راستے میں یکّہ کئی بار اُلٹ جاتا ہے اور ان تینوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے اور عظیم بیگ چغتائی اس ابتری میں مزاحیہ مناظر و حالات کا ایک تانتا سا باندھ دیتے ہیں، کبھی نواب صاحب کا گھٹنا مصنف کی پیٹھ پر نوکیلی شے بن کر چبھنے لگتا ہے تو کبھی بیگم صاحبہ کی ساڑی پہیّے میں پھنس جاتی ہے اور بقول مصنف دروپدی کا سا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی یکّہ گڑھے میں آکر اُلٹ جاتا ہے اور یوں مزاحیہ مناظر کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جو سفر کے اختتام پر تمام ہوتا ہے۔

مشاہدے کی تیزی، بیان پر گرفت، منظر نگاری اور زبان و بیان اور الفاظ کے اُلٹ پھیر سے عظیم بیگ چغتائی نے مزاح نگاری کا کام لیا ہے۔ عملی مذاق کے ساتھ ساتھ مندرجہ بالا اوصاف نے ان کے فن کو جلا بخشی ہے۔

چراغ حسن حسرت (۱۹۰۴۔۱۹۵۵ء) کا مختصر سا افسانہ ''خاندانی قبرستان'' بھی مزاحیہ افسانوں میں شمار کیا جانا چاہئے۔ افسانہ مزاحیہ متانت اور ظریفانہ سادگی ادا کی عمدہ مثال ہے۔ بنیادی طور پر چراغ حسن حسرت فکاہیہ صحافت میں اپنے قلم کے جوہر کھلاتے ہیں اور یہ افسانہ بھی ان کے فکاہیہ کالم کی ہی دین ہے۔ افسانے کی کہانی یوں ہے کہ ایک سرکس کے مالک کو ایک لمبا تڑنگا شخص اپنا پالتو شیر بیچنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے کھانے کی عادت سے پریشان ہے لہٰذا جلد سے جلد اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ کھانے کی عادت عام عادت نہیں بلکہ خاص الخاص ہے، کہ وہ اپنے مالک کے تمام رشتے داروں کو ایک ایک کر کے اپنا لقمہ بنالیتا ہے۔ سب سے پہلے خالہ کا نمبر آتا ہے اس کے بعد ساس اور لڑکا اور پھر شریکِ حیات شیر کے کھانے کی عادت کی نذر ہو جاتے ہیں۔

شیر کو بیٹے کا مزار کہنا اور اُسے لٹا کر وہ دعائیں مانگنا جو تدفین کے وقت مانگی جاتی ہیں۔ مزاحیہ صورتِ حال کی عمدہ مثال ہے۔ شیر کو بیٹے کی موئی مٹی کی نشانی کہنا بھی خالی از لطف نہیں، جنازے میں شیر کا ساتھ ساتھ جانا اور اس کے گلے میں ہار کا ڈالا جانا بھی اس تخئیلی کہانی کو دلچسپ بناتا ہے۔ اہلیہ کے لقمۂ اجل بننے کے بعد شیر کو خاندانی قبرستان کہنا بھی انتہائی مزاحیہ انداز بیان ہے اور یہ جملہ کہ اسے بیچنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنا خاندانی قبرستان بیچ ڈالے، متین وسنجیدہ انداز بیان میں پوشیدہ مضحک صورت حال پر دلالت کرتا ہے۔

کنہیالال کپور (۱۹۱۰۔۱۹۸۰ء) کا افسانہ ''شہید'' ایک جیب کترے کے بہ حسن اتفاق ''شہید'' بن جانے کی روداد کو طنز و مزاحیہ پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ ماتا دین ایک جیب کترا ہے اور تحریک خباثت کے جلوس میں جیب کاٹنے کی غرض سے داخل ہو جاتا ہے۔ مگر اچانک بھگدڑ مچ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، حالانکہ وہ غربت کی وجہ سے کئی روز کا فاقہ کش ہے اور یہی اس کی ہلاکت کی اصل وجہ ہے۔ مگر تحریک خباثت کے رہنما اسے ایک عظیم الاشان لیڈر کا خطاب دے کر اسے شہید اعظم بنا دیتے ہیں۔ شہر کے

اخبارات اس پر خاص نمبر شائع کرتے ہیں اور ایک لاوارث جیب کترے کے جنازے میں لاکھوں آدمی شرکت کر کے اسے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ افسانے کے آخیر میں کلو شیخ جو ماتا دین کا ہم پیشہ ہے تعزیتی مٹینگ میں ایک شخص کی جیب کاٹ کر ماتا دین کو یوں خراج عقیدت پیش کرتا ہے کہ "سالا شہید کہیں کا۔"

کنہیالال کپور نے افسانے میں تمثیلی ناموں کا استعمال برائے طنز کیا ہے، تحریک خباثت، نفرت روڈ، گرگٹ روڈ، اخبار "ابلیس" "حقارت"، تمثیلی نام ہیں، جن کے ذریعے مصنف افسانے کے شگفتہ اور پر مزاح ماحول کو قدرے سنجیدہ اور طنزیہ بنا دیتا ہے۔

ماتا دین کی موت کے بعد اسے ایک عظیم رہنما قرار دے دیا جاتا ہے اخبار حقارت، اسے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ "آپ نہایت شریف الطبع انسان تھے۔ اگر انہیں فرشتہ سیرت کہا جائے تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا، آپ کی زندگی بنی نوع آدم کی بھلائی کے لئے وقف تھی۔ آپ کی وفات سے ہمیں مجموعی طور پر سخت صدمہ پہنچا ہے"۔ اخبار کے یہ الفاظ اور آخیر میں خباثت تحریک کے ایک رہنما کا خراج عقیدت "تضاد" کی ایک ایسی مضحک صورتِ حال سامنے لاتا ہے جو مجموعی طور پر اس افسانے کو شگفتہ تحریر کے ذیل میں لے آتی ہے۔ کنہیالال کپور کے اس افسانے میں طنز کی ایک زیریں لہر بھی کام کر رہی ہے اور اس طرح ہنسی ہنسی میں وہ تیکھی و ترش بات بھی کہہ جاتے ہیں۔ واقعے کی تفصیلات و جزئیات کے ساتھ ساتھ سیرت کے تضاد نے اس افسانے کو اہم بنا دیا ہے۔

انتخاب کا اگلا افسانہ بعنوان "رضائی" از شوکت تھانوی (۱۹۰۵۔۱۹۶۳ء) ہے۔ یہ افسانہ ایک مختصر سے واقعہ پر مبنی ہے، جس میں مصنف ایک ریل کے سفر کے دوران مزاحیہ صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے اور اپنی مقابل سیٹ پر نہایت حسین و جمیل رضائی میں دبکی ہوئی ایک خیالی دوشیزہ کے ساتھ عشق کے پلاؤ پکانے اور طرح طرح سے اس کی دلجوئی کے بہانے تلاش کرنے لگتا ہے اور دل ہی دل میں اُسے اپنی شریک حیات بنانے کے خواب دیکھنے لگتا ہے، پورا افسانہ اس خیالی پلاؤ کی روداد ہے۔

اس افسانے کی ایک اہم خصوصیت راوی کا شگفتہ انداز بیان ہے، جس نے ایک معمولی سے غیر مزاحیہ واقعہ کو اپنی زبان اور اسلوب سے دلچسپ اور لائق قرأت بنا دیا ہے۔ راوی رضائی میں خوابیدہ ''ناہید درخشاں'' سے شادی خانہ آبادی کے منصوبے بناتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے بہ زعمِ خود بے حد پُر اعتماد نظر آتا ہے اور دوسرے مسافروں کی کم عقلی اور کم سوادی پر اظہار افسوس بھی کرتا ہے۔ افسانے کے اختتام تک راوی کی یہ حرکتیں حماقتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

افسانے کا اختتام مضحک ہونے کے ساتھ ساتھ افسانے کی پہلی قرأت میں ہمیں چونکاتا بھی ہے اور ہنساتا بھی ہے۔ راوی اسٹیشن پر گاڑی میں در آنے والی بھیڑ سے ''دوشیزہ'' کو بچاتا ہے اور بالآخر رضائی میں جنبش ہوتی ہے اور وہاں سے بجائے حسین وجمیل دوشیزہ کے ایک بزرگ استغفر اللہ کہتے ہوئے برآمد ہوتے ہیں۔ افسانہ کلائمکس تک آکر اچانک راوی کے احمقانہ خیالی پلاؤ اور رضائی سے ایک بوڑھے کے برآمد ہونے سے مضحک ہو جاتا ہے۔ عملی مذاق اور مزاحیہ صورتِ حال کہ جو راوی کی غلط فہمی پر مبنی ہے افسانے کو شگفتہ اور قاری کو متبسّم کر دیتی ہے۔ شوکت تھانوی چونکہ شاعر بھی ہیں لہٰذا اپنی نثری تحریروں کو پیروڈی کے نگینوں سے آراستہ بھی کرتے رہتے ہیں اس افسانے میں بھی غالبؔ کے ایک معروف شعر کی پیروڈی یوں کی ہے۔

ہائے اس اون کے کمبل کی یہ قسمت غالبؔ جس کی قسمت میں ہو محبوب کی سردی کھونا

ہمارے انتخاب میں شامل اگلا مزاحیہ افسانہ کرشن چندر (۱۹۱۵۔۱۹۷۶ء) کا بعنوان ''مینڈک کی گرفتاری'' ہے۔ کرشن چندر کے عام یعنی سنجیدہ افسانوں میں طنز ایک زیریں لہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی سحر انگیز تحریر میں متعدد افسانے تخلیق کیے ہیں جو طنزیہ ادب کی عمدہ مثال ہیں۔ اس کے علی الرغم انہوں نے باضابطہ مزاحیہ افسانے بھی تحریر کیے ہیں چنانچہ دو مجموعے ''جشن حماقت''، اور ''کرشن چندر کے مزاحیہ افسانے'' ان سے منسوب ہیں۔

ہمارے انتخاب میں شامل ان کا دلچسپ افسانہ فنتاسی کے ذیل میں آتا ہے۔ جہاں انہوں نے مینڈکوں کی دنیا میں داخل ہوکر انسانی افعال واعمال، قول وعمل کے تضاد اور دیگر رویّوں پر ہنسی ہنسی میں طنزیہ وار کئے ہیں۔لیکن مزاح طنز پریوں غالب ہے کہ اسے پہچاننا قدرے مشکل ہوجاتا ہے۔افسانے ''مینڈک کی گرفتاری'' کی کہانی یوں ہے کہ ایک مینڈک راجا کے محل میں جا کر ان کے لڑکے کے ہاتھوں گرفتار ہوجاتا ہے اور دوران قید، پیش آنے والے واقعات کی تفصیلات بعداز رہائی اپنے ساتھیوں کو سناتا ہے۔اس کہانی کی جزئیات میں انسانی عادت واطوار، اس کی جبلتوں اور خصلتوں پر خوب نکتہ چینی کی گئی ہے اور نہایت معصومانہ انداز میں انسانی زندگی کی بوالعجبیوں پر رائے زنی کی گئی ہے۔افسانے کے اکثر مقامات کی سیر کرتے ہوئے قاری شگفتگی اور شوخی کے نت نئے انداز سے گزرتا ہے۔

مذکورہ افسانے میں کرشن چندر نے مینڈکوں کی دنیا کے خدوخال کی تشکیل کرتے ہوئے اکثر اس کا تقابل انسانی دنیا سے کیا ہے اور یوں اس افسانے کو نہایت دلچسپ اور مضحکہ خیز بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔اس نوع کی تحریروں کا سلسلہ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔مگر بیانیہ پر بے پناہ گرفت، کہانی کی بُنت اور فضا سازی میں کرشن چندر سبقت لے جاتے ہیں۔

انسان کی خودغرضی، مطلب پرستی، تعصب، بدعملی پر ہلکے پھلکے وار کرنے کے بعد آخیر میں انسان کی عظمت کے ذکر کے ساتھ افسانہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ انسان کی ازلی وابدی دردمندی اسے عظیم بناتی ہے اور بقول مینڈک ''انسان روسکتا ہے اور اسی لئے وہ مینڈکوں سے بڑا ہے''۔غرضیکہ کرشن چندر کا یہ افسانہ مزاحیہ افسانوں میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

افسانہ ''تربوز'' از وجاہت علی سندیلوی (۱۹۱۶۔۱۹۹۷ء) افسانے کی مجموعی مزاحیہ فضا، مضحک صورت حال اور کردار کی بوالعجبیوں کی وجہ سے ہمارے انتخاب کا حصّہ بنا ہے۔افسانے کا آغاز اس تبصرے سے ہوتا ہے کہ بڑے آدمی میں بڑائی کتنی ہی ہوانسانیت

کم ہی ہوتی ہے۔ یعنی دولت وثروت آ جانے کے بعد انسان پچھلی حیثیت یا اوقات بھول جاتا ہے اور اپنے عہدے یا شہرت کے نشے میں انسانیت کے درجے سے بھی گر جاتا ہے۔ اس تبصرے کے بعد وجاہت علی سندیلوی ایک افسانہ بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ جس میں اپنے اسکول کے دوست کے باثروت ہونے کے بعد خود غرض اور مطلب پرست ہونے کی کہانی مزاحیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

کہانی مختصراً یوں ہے کہ مصنف اپنے پرانے دوست جواب ایک عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہیں، سے ملنے اور اپنے ایک دوست کے بیٹے کی سفارش کرنے جاتے ہیں تو حسب توقع ان کی ملاقات پہلے بڑے آدمی کے اردلیوں سے ہوتی ہے اور وہاں انہیں خاصا ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ بالآخر رشوت کے سہارے مصنف اپنے پرانے دوست کی بارگاہ میں باریابی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ مگر بڑا آدمی اپنی بے تکی اور بے معنی باتوں میں الجھا ہوا ہے۔ ''تربوز'' کھاتا جاتا ہے اور گفتگو بھی کرتا رہتا ہے چونکہ معمولی ذہانت کا حامل ہے لہٰذا اپنی بے سروپا باتوں سے مصنف کا خون کھولاتا جاتا ہے، بار بار تربوز کا ذکر لے آتا ہے۔ اس پوری صورت حال میں مصنف کے چٹکیلے تبصرے افسانے کو طنز و مزاح کی فضا سے ہمکنار کردیتے ہیں۔

بڑے آدمی کی غائب دماغی، تکبّر اور خوشامد پسندی کی عادت پر وجاہت علی سندیلوی نے ہنسی ہنسی میں طنز کیا ہے۔ مصنف کے نام ''تہذیب'' اور ''تربوز'' کی صوتی ہم آہنگی نے واقعات کو مزید مضحک بنادیا ہے۔ یہ افسانہ مزاحیہ مکالمہ نگاری، تشبیہات واستعارات کی ندرت اور زبان وبیان کی انفرادیت کی وجہ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔

کرنل محمد خاں (۱۹۱۲۔۱۹۹۹ء) مزاحیہ واقعہ نویسی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی معرکۃ الآرا تصانیف، ''بجنگ آمد'' اور ''بہ سلامت روی''، اسی نوع کی تحقیقات ہیں انہوں نے مزاحیہ مضامین بھی قلم بند کیے ہیں، جن میں ان کا ایک افسانہ بعنوان ''یوسف ثانی'' بھی شامل ہے۔ افسانہ ''یوسف ثانی'' کی کہانی یوں ہے کہ مسعود کا دوست یوسف جو قطعی اسمِ بامسمّیٰ نہیں ہے یعنی خاصا بدصورت ہے، لڑکی دیکھنے کے لئے مسعود کو یوسف بنا کر

لڑکے والوں کے شہر لے جاتا ہے۔ مسعود دوستی کی خاطر پھنس جاتا ہے اور وعدہ وفا کرنے کی کوشش میں عجیب تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ دونوں دوست دلہن کے گھر مہمان ہوتے ہیں جہاں ان کی خوب خاطر تواضع ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور دلہن کی اداؤں کے بیان کے پسِ پشت کرنل محمد خان نے مزاحیہ واقعہ نگاری کا ایک تانا سا باندھ دیا ہے۔

لڑکی کے دیدار کے بعد مسعود اس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور اسے اپنی بیگم بنانے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں اور طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکانے لگتے ہیں۔ مگر چونکہ نقلی دولہا ہیں لہٰذا مجبورِ محض ہیں۔ دلہن کا پورا خاندان موسیقی کا دیوانہ ہے جبکہ مسعود اس سے نابلد ہیں، لہٰذا ان کا خوب مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ یوسف (اصلی) ستار بجانے لگتے ہیں تو حمیدہ (دلہن) ان کی موسیقی کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور یوں مسعود کے بجائے یوسف محض ستار بجانے کے بموجب پسند کر لئے جاتے ہیں اور مسعود خالی ہاتھ لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ آخر میں یہ عقدہ کھلتا ہے کہ لڑکی والے بھی مسعود کی طرح خاندانی گویّے ہیں۔

کرنل محمد خاں کا یہ افسانہ زبان وبیان پر ان کی قدرت کے ساتھ ساتھ مزاحیہ پلاٹ سازی، اندرونِ خانہ خواتین کی چھیڑ چھاڑ اور مضحک واقعہ نگاری کے باعث اہمیت کا حامل ہے، بیانیہ میں اشعار اور مصرعوں کی برجستہ آمیزش نے بھی اسے وقیع بنا دیا ہے۔

ہمارے انتخاب کا اگلا افسانہ ''بلڈ پریشر'' از شفیق الرحمٰن (۱۹۲۰ء-۲۰۰۰ء) ہے۔ شفیق الرحمٰن دورِ جدید کے صفِ اوّل کے مزاح نگار ہیں۔ وہ قدرت سے حسِ مزاح لے کر آئے ہیں اور ان کے مضامین وافسانے مزاحیہ اسلوب نگارش کی عمدہ مثال ہیں۔ انہیں لطیفہ در لطیفہ کا فن خوب آتا ہے اکثر ان کے مضامین پے بہ پے لطائف پر ہی مبنی ہوتے ہیں جنہیں چند کرداروں کے اردگرد تخلیق کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ مضحک واقعات کا ایک تسلسل بلکہ سیلاب پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس زود نویسی اور سطحیت نے ان کے فن پر سوالیہ نشان بھی لگایا ہے مگر اس سب کے باوجود زندگی سے ان کی رمق اور انسانی نفسیات پر ان کی گہری نظر نے ان کے فن کو اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔

انتخاب میں شامل ان کے افسانے "بلڈ پریشر" کی کہانی یوں ہے کہ چند دوست ایک دوست کے یہاں مہمان ہیں۔ رات بیتی جارہی ہے آخری بس کے روانہ ہونے کا وقت قریب آرہا ہے اور موضوع گفتگو ہے "قنوطیت و رجائیت"، رجائیت پسند زندگی کے ہر لمحے اور ہر موقع پر خوشی حاصل کرنے کا درس دے رہا ہے جبکہ دوسرے شخص کا خیال ہے کہ حساس انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ بحث کے دوران شیطان (شفیق الرحمٰن کا محبوب کردار) ایک قصہ سناتا ہے کہ بلڈ پریشر کا مریض ہے اور ڈپریشن یا قنوطیت کا شکار۔ اس قصے کا لبِ لباب یہ ہے کہ اسے تمام دنیا، حسین، آباد اور خوش نظر آرہی ہے۔ خوبصورت ہم جماعتوں میں بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ دوشیزائیں بھی اس پر نظرِ کرم ڈال رہی ہیں۔ قصہ طویل ہے اور ہر واقعہ، ہر کردار اور ہر شے اس کی رنگین و دلفریب و شگفتہ ہے۔ اس طرح قنوطیت سے رجائیت کا سفر تمام ہوتا ہے۔ مگر اصل قصہ یہ ہے کہ شیطان نے اپنی عینک کے شیشے بدلوائے ہیں یعنی اب ان کی آنکھیں دھندلا نہ دیکھ کر صاف دیکھ رہی ہیں اور اسی وجہ سے ان کا بلڈ پریشر بھی نارمل ہو گیا ہے۔ دوست احباب اس قصۂ طولانی کے مضحک انجام پر خفا ہوتے ہوئے بس پکڑنے کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں جو نکل چکی ہے۔

شفیق الرحمٰن نے اس افسانے میں اپنے پسندیدہ اسلوب سے اجتناب برتتے ہوئے باقاعدہ ایک کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ اکثر وہ محض طویل لطائف کے سلسلہ کو ہی مضمون، انشائیہ یا کہانی کا نام دے دیتے ہیں۔ کرداروں کے نام بھی دلچسپ ہیں۔ شیطان ان کا ایک دلچسپ اور جان دار کردار ہے۔ غرض مزاحیہ اسلوبِ نگارش، ساتھ ساتھ کہانی کے اُتار چڑھاؤ کے اعتبار سے یہ افسانہ اہمیت کا حامل ہے۔

محمد خالد اختر (۱۹۲۰۔۲۰۰۲ء) کا معروف افسانہ "زیبرا اسکیم" مزاحیہ "فنتاسی" کے ذیل میں آیا ہے۔ دراصل یہ فنتاسی چچا عبدالباقی کی بر خود غلط، مضحکہ خیز اور دوراز فہم اسکیموں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، یعنی محمد خالد اختر نے اس کردار کو مرکز بنا کر کئی قابل ذکر مزاحیہ افسانے تخلیق کیے ہیں۔ ان مزاحیہ افسانوں میں دو کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلا چچا عبدالباقی دوسرا ان کا منہ بولا بھتیجا ''بختیار'' جوان مزاحیہ افسانوں کا راوی بھی ہے۔

کہانی کا مرکزی خیال جسے چچا عبدالباقی کے خرافاتی ذہن کی دین کہا جا سکتا ہے۔ اپنے آپ میں مضحک اور نا قابل یقین فعل ہے۔ مگر یہ نا قابل عمل مہم یعنی افریقہ سے زیبروں کی دستیابی، کہانی کے مجموعی ماحول کو خوشگوار کرنے کے ساتھ ساتھ مضحک بنا دیتی ہے۔ چچا عبدالباقی کی برخود غلط خود اعتمادی بھی افسانے کی فضا کو اہم بناتی ہے۔ کہانی مختصراً یوں ہے کہ چچا عبدالباقی چڑیا گھر میں زیبروں کے حسن کی طرف نگاہ ڈال کر ایک زیبرا برآمد کمپنی کھولنے کی تجویز رکھتا ہے۔ اس کے خیال میں کراچی کی وکٹوریہ میں گھوڑے کے بجائے زیبرے جوتے جائیں تو ایک نہایت کامیاب اور منافع بخش بزنس شروع کیا جا سکتا ہے۔ چچا نے اپنے بھتیجے بختیار خلجی کو کسی طرح روپیہ فراہم کرنے پر راضی کر کے انہیں نیربی جا کر زیبرے درآمد کرنے کے لئے بھی راضی کر لیا۔ لیکن عین وقت پر پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے بعد دو شکاری بھائیوں نے ان سے رجوع کر کے انہیں زیبرے فراہم کرنے کی پیش کش کی اور طرح طرح کے منصوبوں اور پروگراموں کے تحت چچا سے موٹی رقم لے لی اور نہایت مکاری سے عام گدھوں پر دھاریاں ڈال کر اور اندھیرے میں انہیں چچا کے حوالے کر کے فرار ہو گئے۔ چچا نے جب نام نہاد زیبروں کو دھلوایا تو ان کی دھاریاں بھی دُھل گئیں تب انہیں اپنے ٹھگے جانے کا احساس ہوا۔

افسانے میں واقعات کا تسلسل، مصنف کی جا بجا رائے زنی، چچا کی سادگی اور بھتیجے کی چشم پوشی۔ نیز واقعات کی جزئیات قابل غور ہیں۔ چچا عبدالباقی بنیادی طور پر سادہ لوح، قدرے بے وقوف انسان ہیں۔ ایک کے بعد ایک اپنی بے وقوفانہ اسکیموں پر عمل درآمد کرتے ہوئے ٹھگے جاتے ہیں۔ اس افسانے میں انہیں بے وقوف بنا کر رقم اینٹھنے والے بھی ہے۔ جو لوگوں کی سادگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں آسانی سے بیوقوف بنا جاتے ہیں۔

محمد خالد اختر کے افسانوں کے کرداروں کو دو اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے وہ

کردار جو نیک، سادہ دل، اور قدرے معصوم ہیں اور اپنی معصومیت کی وجہ سے ہی مضحک صورت حال میں گرفتار ہوتے رہتے ہیں ظاہر ہے ان میں چچا اور ان کے بھتیجے بختیار خلجی خاص ہیں۔ دوسرے قسم کے کرداروں میں وہ مکاّر، موقع پرست اور عیار لوگ ہیں جو ان سادہ لوحوں کو بآسانی ٹھگ لیتے ہیں۔ ان متضاد صفات سے آراستہ کرداروں کے باہم تصادم سے جو مزاحیہ حالات پیدا ہوتے ہیں وہی ان افسانوں کا موضوع بنتے ہیں۔ کامیابی عیاروں کی قسمت میں آتی ہے مگر جیت سادہ لوحوں کی ہی ہوتی ہے اس معرکۂ خیر وشر میں فتح تو شر کی ہوتی ہے مگر قاری کی تمام تر ہمدردیاں ہارنے والوں کی طرف ہی ہوتی ہیں۔

محمد خالد اختر اسلوباً انگریزی سے متاثر ہیں چنانچہ جملوں کی ساخت پر اس کے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں، رواں دواں طرز تحریر کے بجائے اکھڑی اکھڑی غیر مانوس زبان بھی ان کے بیانیہ کا خاصہ ہے۔

ہمارے انتخاب میں شامل اگلا افسانہ بعنوان ''ترپ چال'' از مسعود مفتی (پ ۱۹۳۴ء) ہے۔ یہ ایک عشقیہ تثلیث کی مزاحیہ داستان ہے۔ کالج کے پس منظر میں حسن (راوی) کا ہرفن مولا بھائی ''عرفی''، بلقیس (راوی کی محبوبہ) کو متاثر کر کے اسے اپنی طرف رجوع کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی تمام تر کوششوں میں نہایت مکر وفریب سے کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ افسانہ میں مختلف واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں اور مصنف کے انداز بیان کی شوخی کی بدولت مزاحیہ ماحول میں افسانہ آگے بڑھتا ہے۔ معاملہ چونکہ عشق کا ہے لہٰذا افسانے کا ماحول قدرے رومانی ہے۔ بلقیس کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی غرض سے عرفی ہر جائز وناجائز طریقہ استعمال کرتا ہے اور بڑی حد تک بلقیس کو تذبذب کا شکار بنا ہی لیتا ہے۔ عرفی کی یہ کوششیں، مختلف چالیں ہیں جنہیں وہ نہایت دانشمندانہ فریب سے بروئے کار لاتا ہے۔

مسعود مفتی کے مزاحیہ افسانوں کی ایک اہم خصوصیت ان کا اندازِ بیان ہے۔ وہ واقعات بیان کرتے ہوئے افسانے کے وحدتِ تاثر سے قدرے الگ جا کر بھی مزاحیہ

صورت حال یا مزاحیہ جملہ بازی کا موقعہ فراہم کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کا اسلوب کسی قدر مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب سے قریب ہو جاتا ہے۔ زیر نظر افسانے کی پوری فضا مختلف مناظر کے تانے بانے سے تیار کی گئی ہے۔

افسانے میں جابجا مضحک صورت حال کے ذریعے شگفتگی کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے حسن مصور ہے، اس کی تصویریں بلقیس کو بے حد پسند ہیں، عرفی مصوری سے تقریباً نابلد ہے اور مصوری سیکھنے کی کوشش میں مزاحیہ اشکال ہی بناپاتا ہے۔ لہٰذا موڈرن آرٹ پر اس کے احمقانہ تبصروں اور ان کی افہام وتفہیم کے ذریعے بھی مسعود مفتی نے مضحک صورت حال پیدا کی ہے۔

افسانے کے آخیر میں عرفی بھیّا اپنی ''مصورانہ صلاحیتوں'' کو بروئے کار لاکر بلقیس کو دام محبت میں پھنسا ہی لیتے ہیں اور یہی ان کی ترپ چال ہے۔ کہانی کا انجام نہایت ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے اور عاشق صادق کے بجائے رقیب روسیاہ کو کامیابی وکامرانی حاصل ہوتی ہے۔

مسعود مفتی کے انداز بیان میں ہلکی ہلکی گدگدی کا احساس ہوتا ہے۔ لفظوں کی تراش خراش سے بھی مزاح نگاری کرتے ہیں۔ زبان کی شوخی اور شگفتگی بیانیہ کو مستحکم بناتی ہے۔

مظفر حنفی کا مزاحیہ افسانہ ''مہمان'' بن بلائے مہمانوں کے موضوع کو مضحک بنا کر پیش کرتا ہے۔ مہمان کی زبانی لطیفوں کی آمیزش نے اس افسانے کے مجموعی ماحول کو نہایت شگفتہ ومضحک بنادیا ہے۔

بن بلائے مہمان کا داخل مکان ہو جانا اور میزبان کو دلچسپ باتوں میں الجھا کر تادیر ان کے یہاں قیام فرمانا۔ میزبان کے بجٹ کا بگڑ جانا اور مہمانوں سے بیزار ہو کر انتہائی قدم اُٹھانے کے بارے میں سوچنا، افسانہ کے تانے بانے کا اہم حصہ ہیں۔ مہمان کے لطیفے ماحول کو زعفران زار بناتے ہیں مگر اس شگفتگی کے ماحول میں افسانے کا موضوع یعنی بن بلائے مہمان کا چلے آنا۔ ایک المیہ صورت حال پیدا کرتا ہے۔ افسانے کے آخیر

میں، عقدہ کھلتا ہے کہ مہمان قریبی عزیز نہیں بلکہ ماموں جان کے سالے کے شناسا ہیں۔

کہانی کا اینٹی کلائمکس مزاحیہ صورت حال کو پیش نظر لاتا ہے کہ مہمان خود اپنے گھر کے مہمانوں سے تنگ آ کر میزبانوں کے یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ کہانی کے ہیرو بھی اسی عمل کو دہرانا چاہتے ہیں تاکہ مہمان سے چھٹکارا مل جائے۔ مگر مہمان بزرگوار کو اس کی اطلاع مل جاتی ہے اور وہ اگلے دن واپس اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

مظفر حنفی نے بن بلائے مہمانوں پر طنز کرنے کے لئے مزاح کو بطور حربہ استعمال کیا ہے۔ افسانے کے شگفتہ ماحول، مزاحیہ مکالمہ نگاری اور لطیفہ در لطیفہ کی تکنیک نے اس فرسودہ موضوع میں تازگی پیدا کردی ہے۔

جمال درّانی (م ۱۹۹۹ء) کا افسانہ ''سرکار بنام سوہنی مہیوال'' بنیادی طور پر ایک فنتاسی ہے، جس میں مصنف نے عالم تخیل میں سوہنی مہیوال کے قصے کو مضحک انداز میں پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مہیوال پر سوہنی سے عشق کرنے اور اسے اغوا کرنے کا مقدمہ عدالت میں چلایا جاتا ہے۔ جس میں وکیل صفائی کی زبان سے نہایت مزاحیہ انداز میں پورے قصے کی جزئیات بیان کی جاتی ہیں۔ مہیوال کو اسمگلر کہہ کر اسے سوہنی کے عشق میں مبتلا دکھایا جاتا ہے یہاں مزاحیہ انداز بیان، مضحک صورتِ حال اور تحریر کی شگفتگی نے افسانے کو مزاحیہ رنگ دے دیا ہے۔

عدالت کی کارروائی کے دوران کوتوال کا بیان، مہیوال کی کوتوال کے ہاتھوں پٹائی تو عام واقعات ہیں۔ مگر کوتوال کا انٹروگیشن کے بہانے سوہنی کو دو دن کے لئے اپنے گھر لے جانا واقعہ کو سنگین ہونے کے ساتھ ساتھ مضحک بھی بنا رہا ہے۔ عدالتی مکالموں کے ساتھ افسانہ آگے بڑھتا ہے اور آخر میں قاضی القضات فیصلہ سناتے ہیں۔ مہیوال لائق تعزیر ٹھہرتا ہے۔ تلا (سوہنی کا والد) نکاح خواں اور گواہ کم عمری میں سوہنی کا نکاح کرانے کے جرم میں معتوب ہوتے ہیں۔ بکرم سنگھ کوتوال بھی مجرم گردانا جاتا ہے۔ وکلا کے لائسنس ضبط ہوجاتے ہیں کہ انہوں نے دورانِ مقدمہ نازیبا اور ناشائستہ زبان استعمال کی۔ مگر سوہنی کے لئے جو سزا تجویز

کی جاتی ہے وہ اس پورے مقدمے پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہے اور قاضی صاحب کی بدنیتی پر ہی دلالت کرتی ہے۔ نیز اس پوری روداد کو مزاحیہ رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ بقول قاضی:

''سوہنی کی کم سنی، معصومیت اور حسنِ ملیح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے،
اس کے لئے تا برخواست کچہری کی سزا کافی سمجھی جاتی ہے۔ وہ عرصہ
دو سال تک پروبیشن پر ہمارے حرم میں زیرِ نگرانی رہے گی''۔

پرویز ید اللہ مہدی کا مزاحیہ افسانہ ''عمر بھر کا ساتھ'' ایک غلط فہمی سے شروع ہوتا ہے۔ افسانے کی ہیروئن نازش گھر میں آنے والے ایک اجنبی کو اپنا ہونے والا شوہر سمجھ کر اسے سمجھانے اور شادی سے باز رہنے کی کوشش کرتی ہے اور اس سلسلے میں جہیز اور لڑکے والوں کے لالچی ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی بات کہتی چلی جاتی ہے اور اُس کی بات سننے سے گریز کرتی ہے، لڑکا (اجنبی) آہستہ آہستہ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ لڑکی جدید ماحول کی پروردہ ہے اور جہیز وغیرہ کے خلاف ہے اور دورانِ گفتگو وہ اسی بات پر زور دیتی رہی ہے۔ اس کی جذباتیت تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے، رسم ورواج، کھوکھلے سماج اور بزدل نوجوانوں کو اس صورتِ حال کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ اجنبی نہایت معصومیت مگر انہماک سے نازش کی باتیں سنتا رہتا ہے۔ اچانک ایک ملازمہ آکر یہ راز کھولتی ہے کہ جس شخص سے نازش لن ترانیاں کر رہی ہے، وہ اس کا منگیتر نہیں تو عجیب صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

نوجوان اپنا تعارف کراتا ہے کہ وہ دراصل الیکٹرک ڈپارٹمنٹ میں انسپکٹر ہے اور میٹر بدلنے کی غرض سے اس کی گھر آیا تھا۔ وہ لڑکی کی بے باکی اور صاف گوئی سے متاثر ہوکر اس سے شادی کی تجویز پیش کرتا ہے اور یوں افسانے کا خوش کن انجام ہوتا ہے۔

افسانہ میں شگفتگی کا پہلو وہ غلط فہمی ہے، جس نے دو اجنبیوں کو ہمیشہ کے لئے ایک کر دیا۔ افسانے کے مختلف حصّوں میں سبک ظرافت کی خوشبو بھی متاثر کرتی ہے۔

ہمارے انتخاب کا اگلا افسانہ سلمٰی یاسمین نجمی کا ''کوئے ملامت'' ہے۔ یہ افسانہ بھی سابقہ افسانے کی طرح غلط فہمی سے پیدا ہوئی مضحک صورتِ حال کی نمائندگی، مکالموں،

تبصروں اور مناظر کے پے بہ پے استعمال سے کرتا ہے۔ کہانی یوں ہے کہ مصنفہ کا ایک ان دیکھے نوجوان کے ساتھ رشتہ طے ہوتا ہے۔ بار بار اصرار کرنے پر لڑکے والے ایک فوٹو ارسال کر دیتے ہیں۔ جس میں دولہا میاں گنجے سر کے ساتھ کوٹ ٹائی پہنے براجمان ہیں۔ اس مضحکہ خیز تصویر پر تمام گھر والے حیران و پریشان ہیں۔ مزاحیہ تبصروں سے مصنفہ کے ہونے والے شوہر کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ پھبتیاں کسی جاتی ہیں، چچا پھکنا اور شیخ چلی کے سے خطاب دیئے جاتے ہیں اور کسی طرح مصنفہ کو اس شادی سے باز رہنے کے لئے کہا جاتا ہے، مگر کچھ عرصے بعد شادی ہو ہی جاتی ہے اور دلہن تمام تر وسوسوں کے ساتھ سسرال روانہ ہو جاتی ہے۔

حجلۂ عروسی میں بظاہر ایک انجان مگر وجیہہ شخص کو دیکھ کر مصنفہ کو شک گزرتا ہے کہ کہیں کوئی بدمعاش تو داخل نہیں ہو گیا۔ مغالطے میں ہونے والے مزاحیہ مکالمے افسانے کو شگفتہ بناتے ہیں۔ بالآخر طویل مزاحیہ مکالمے اور غلط فہمی کے بعد یہ عقدہ کھلتا ہے کہ دراصل دولہا وہی وجیہہ نوجوان ہے اور جو تصویر بردکھوے کے لئے بھیجی گئی تھی، سات سال پرانی تھی۔

اندرون خانہ ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ قریبی رشتوں کی آپسی چشمک اور نسائی مکالموں کی برجستگی کے ساتھ ساتھ مزاحیہ بیانیہ کی عمدہ مثال یہ افسانہ، زبان و بیان میں شوخی و شگفتگی بھی رکھتا ہے۔

غلط فہمی پر مبنی اور مزاحیہ بیانیہ کی مثال ہمارے انتخاب کا آخری افسانہ آمنہ اقبال کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ''پکائی تھی کھیر'' کے عنوان سے اس افسانے کی کہانی یوں ہے کہ آصف اپنے دوست اشفاق کو لڑکی دکھانے کے لئے اپنے شہر بلاتا ہے، دونوں جگری دوست ہیں اور چونکہ لڑکی امریکن ہے اور اشفاق ایک عرصے امریکہ میں رہ چکے ہیں لہٰذا لڑکی دیکھنے کے لئے موزوں ترین شخص ہیں، لڑکی آصف کے پڑوس میں رہتی ہے۔ آصف اس کے بے پناہ حسن سے حد درجہ متاثر ہیں، حالانکہ ابھی اس کے دیدار دور ہی سے نصیب ہوئے ہیں۔ مگر ان کا عشق پورے عروج پر ہے۔ دونوں دوست گھر کے چمن میں بیٹھے باتیں کرتے ہیں، اس حسینہ کا دیدار بھی ہوتا ہے، وہ اپنا کتا ٹہلانے چھت پر آتی ہے مگر اس بار بھی دونوں

دوست اُس کے دیدار سے محروم رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس حسینہ کا کتا آصف کی کوٹھی میں آجاتا ہے۔ پیچھے پیچھے وہ حسینہ بھی داخل ہوتی ہے اور اچانک یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ حسینہ ایک خوبرو مرد ہے۔ واقعہ کا تانا بانا مزاحیہ ہے۔ انداز بیان میں شوخی و شگفتگی ہے۔ مکالمے بھی مزاحیہ ہیں کلائمکس تک آتے آتے افسانہ کا مضحک انجام قہقہہ کا موجب بنتا ہے۔

☆☆☆☆

ہمارے ایک فاضل دوست جو خیر سے خاصے پڑھے لکھے واقع ہوئے ہیں، نے ایک دن یونہی ہم سے دریافت کیا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ مزاحیہ افسانوں کے انتخاب پر کام چل رہا ہے، انہوں نے قدرے تعجب سے ہماری طرف دیکھا اور دوہرایا "مزاحیہ افسانہ" اور پھر یوں گویا ہوئے کہ ذرا بتاؤ تو سہی اردو میں مزاحیہ افسانہ کی کیا روایت ہے اور کن مصنفین نے اس صنفِ خاص میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس سوال پر ہم انگشت بہ دنداں رہ گئے کہ بظاہر ایک باہوش وحواس (ادب کے مطالعے کے حوالے سے) شخص مزاحیہ افسانوں کی روایت سے اس حد تک بیگانہ ہوسکتا ہے۔ دراصل اس بیگانگی کے پسِ پشت وہی غلط فہمی کارفرما ہے، جس کا ذکر ہم نے گذشتہ صفحات میں کیا کہ بیشتر مزاحیہ افسانے، مضامین وانشائیوں کے اژدہام میں گم ہوکر رہ گئے ہیں اور مزاحیہ افسانوں پر کوئی کام بھی منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ دوسری اہم وجہ عوام وخواص کی وہ غلط فہمی ہے کہ جس کے تحت وہ طنز ومزاحیہ ادب کو دوئم بلکہ سوئم درجہ کا ادب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ عہد قدیم سے عصر حاضر تک سنجیدہ ادب کے دوش بدوش اعلیٰ طنز ومزاحیہ ادب پروان چڑھتا رہا ہے اور شاعری میں جعفر زٹلی سے دلاور فگار تک اور نثر میں مرزا غالب سے مشتاق احمد یوسفی تک اس نوع کے ادیبوں نے موضوع مواد، اسلوب اور ہیئت کے نت نئے تجربے بھی کئے اور انہیں عظمتوں سے بھی ہمکنار کیا۔ طنز ومزاحیہ نثر کی تاریخ میں ایسے کئی ادبا بھی موجود ہیں جنہوں نے باقاعدہ مزاحیہ افسانہ نگاری کی اور ان کے متعدد مجموعے اشاعت کے مراحل سے گزرے مگر بعض ایسے مزاح نگار بھی ہیں کہ جن کی تخلیقات (افسانے) رسائل کی فائیلوں میں دب کررہ گئیں اور منظر عام

پر نہ آسکیں۔ پچھلے زمانے میں غلام احمد فرقت کاکوروی نے طنز و مزاح کا ایک جامع اور معتبر انتخاب شائع کیا تھا جو اب تقریباً نایاب ہے۔ اس انتخاب میں انہوں نے کئی مزاحیہ افسانوں کو شامل کیا۔ سوغات کے مدیر محمود ایاز صاحب نے کئی گم شدہ مزاح نگاروں کو از سرِ نو روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیا اور سوغات (دورِ دوم) میں کئی اہم گوشے شائع کئے اور یوں کئی صاحبِ طرز مزاح نگار جو ہمارے حافظوں سے اوجھل ہو گئے تھے از سرِ نو منظرِ عام پر آ گئے، زبان و ادب کے ایسے خدمتگار شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆

اس کتاب کی تحریک کا سہرا دراصل استاد محترم ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی صاحب کے سر ہے کہ ایک ملاقات میں انہوں نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں مزاحیہ افسانوں کے انتخاب پر کام کروں، چنانچہ میں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ یہ تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے انتخاب کے سلسلے میں مجھے متعدد کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔ کام نہایت صبر آزما ثابت ہوا۔ اکثر کتابیں یا تو دستیاب نہیں تھیں یا ان کے لئے لائبریوں کی گرد آلود فضا میں سانس لینا پڑتا تھا۔ تقریباً سال بھر کے مطالعے کے بعد یہ بیس افسانے منتخب کئے۔ مگر اس دوران دوسرے کاموں (ادبی) میں بھی اُلجھتا رہا اور یوں یہ کام پسِ پشت چلا گیا، بالآخر اب یہ کام اختتام تک پہنچا ہے۔ اُمید ہے کہ ادب کے سنجیدہ اور ''غیر سنجیدہ قارئین'' کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا۔ یہاں یہ امر بھی زیرِ غور رہے کہ کوئی بھی انتخاب مکمل اور جامع نہیں ہوتا، ممکن ہے کہ کوتاہیاں ہوئی ہوں۔ لہٰذا امید کرتا ہوں کہ اہل نظر حضرات اپنی رائے اور مشوروں سے نوازیں گے۔

اس موقع پر مجھے اپنے اساتذہ میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی مرحوم، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی مرحوم، پروفیسر فضل الحق مرحوم کی یاد بے طرح آرہی ہے کہ وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرماتے اور دعائیں دیتے تھے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔ اُستاد محترم ڈاکٹر شریف احمد صاحب کی عنایتوں اور احسانات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ کس کس

کا ذکر کیا جائے۔ ان کا دامنِ شفقت میرے لئے ہمیشہ وا رہتا ہے خدا کرے ان کی عنایتوں اور کرم فرمائیوں کا سلسلہ تادیر قائم رہے۔ استاد محترم ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی کی کرم فرمائیاں میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں۔ خدا انہیں صحت وتندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔ دیگر اساتذہ میں سید ضمیر حسن دہلوی صاحب، سید نیاز احمد صاحب، عبد العزیز صاحب کی دعائیں میرے شامل حال ہیں۔ حلقۂ یاراں کا سلسلہ وسیع ہے میں یہاں نام لیکر تقدیم وتاخیر کے مسئلہ میں الجھنا نہیں چاہتا۔ یہ تمام احباب میری حوصلہ افزائی کا باعث ہیں۔ میری اہلیہ ڈاکٹر طلعت گل شکریے کی حقدار ہیں کہ اکثر میری کئی ذمہ داریوں کو خود نبھا کر مجھے آزاد رکھتی ہیں اور یوں میری مشکلات کو آسان کر دیتی ہیں۔

دہلی یونیورسٹی لائبریری، ذاکر حسین کالج لائبریری (ایوننگ، مورننگ) کے احباب کا شکریہ کہ انہوں نے کتابوں کی رسائی میں میری بے پناہ مدد کی۔ داراشکوہ لائبریری (اردو اکادمی) کی لائبریرین نذہت مہدی رضوی خصوصاً شکریہ کی مستحق ہیں کہ کتب ورسائل کی فراہمی میں وہ میری بے پناہ مدد کرتی ہیں۔ لائبریری کے دیگر اراکین کا بھی شکریہ کہ انکی محبتیں میرے ہر کام میں شامل رہتی ہیں۔

حضرات اس طول کلامی کے لئے معافی کہ میں تادیر آپ کے اور ان مزاحیہ افسانوں کے بیچ حائل رہا۔ چنانچہ اب یہ دیوار گرا چاہتی ہے۔ آیئے ساتھ مل کر ان افسانوں سے لطف اندوز ہوں اور اگر ان کے مطالعے سے کسی ایک پژمردہ دل میں بھی شگفتگی کے آثار نمودار ہو گئے تو میں سمجھوں کہ محنت وصول ہوئی۔

مظہر احمد

۲۲ر ستمبر ۲۰۰۸ء

چودھری محمد علی ردولوی

میٹھا معشوق

اللہ بخشے، مرزا صاحب کا دماغ بذلہ سنجیوں کا ذخیرہ تھا۔ زبان چٹکلوں کی پوٹ تھی پھر بھی عمر بھی اتنی پائی کہ دوسرے کے پاس اتنا سامان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ انداز بیان کچھ ایسا تھا کہ سیدھی سیدھی بات روز مرہ کے واقعات جب کہنے لگتے تھے تو ہندوستان کی داستانیں مات تھیں، نہ معلوم کس طرح کا اُلٹ پھیر لفظوں کا ہوتا تھا کہ جملوں میں نئے معنوں کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔ فقروں میں اصلی معنی کے ساتھ دوسرے پہلوؤں کی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ جیسے نگینے کی چھوٹ پڑتی ہے۔ اختصار کے بادشاہ تھے ایک دن ایک شاعر صاحب کہنے لگے میں بہت کم کہتا ہوں۔ مرزا صاحب بولے، خیر غنیمت ہے۔ ان کا طول بھی ایسا ہی دل آویز ہوتا تھا۔ کسی نے مزاج شریف پوچھا کہنے لگے۔ اگر شکر نہیں بھی ہے تو شکایت کی مجال کس کو ہے۔

ایک قصہ خود اپنے خاندان کا بیان کرتے تھے، مگر میں وہ زبان کہاں سے لاؤں گا۔ فرمانے لگے کہ غدر کے بعد ہمارے ایک دادھیالی عزیز تھے۔ لکھنؤ سے فاصلہ پر رہتے تھے۔ اُن کا مقدمہ فائنانشلی میں تھی۔ ریل اُس وقت تک نکلی نہیں تھی۔ لوگ شکرم اور اونٹ گاریوں پر سفر کرتے تھے۔ اُمرا کہاروں کی ڈاک بٹھا کر چلتے تھے۔ متوسط حال لوگ اپنے گھر کی رتھ بہلیوں پر معہ نوکروں چاکروں کے آہستہ خرام بلکہ مخرام کی چال چلتے تھے۔ انھیں حضرات میں مرزا صاحب کے چچا بھی تھے، خود بہلی پر اور مصاحبت میں مختصر ریاست کے دیوان منشی بخت بلی کائستھ جن کے بغیر چھوٹی بڑی ریاست کا ہونا ویسے ہی ناممکن تھا، جیسے اُن کی ماش کی دال بے ہینگ کے ہو۔ جلو میں کارکن صاحب جن کو نائب کہہ لیجیے ٹٹو پر ایک لٹھ بند سپاہی اور دو نفر ہمراہی جن میں ایک بڑے مرزا صاحب کا خدمت گار اور دوسرا نائب صاحب کا نیم سائیس اور نیم خدمت گار اور وقت ضرورت باورچی بھی۔ میری گستاخی کی جسارت معاف ہو۔ اس جگہ میں اپنے پڑھنے والوں کا

امتحان لینا چاہتا ہوں بھلا بتایئے تو اس کہانی کا ہیرو کون ہے'' اتنے کے بیچ موری جیند یا ہراتی'' ہے۔ انہی لوگوں میں مگر تنکے اوٹ پہاڑ۔ اگر آپ بوجھ گئے تو ہم بھی قائل ہیں۔

بہلی کے سازو سامان میں بچھونے، لالہ کی لوٹیا، مرزا صاحب کا لوٹا، جانماز، مختصر سامان مطبخ، ایک عدد توا اور ایک دو پتیلیاں، کچھ دال مسالے کی پوٹلی، بہلی کے پیچھے جال میں۔ مسل مقدمہ کی دیوانجی کی بغل میں، مگر لالہ صاحب اور بڑے مرزا صاحب کے درمیان میں اور گاڑی بان کے پیچھے یہ کون چیز رکھی ہے۔ حضرت اس کو نہ پوچھئے یہی تو قصے کی جان ہے اگر یہ نہ ہوتی تو کہاں ہم، کہاں آپ، کہاں یہ کہانی۔ بڑے مرزا صاحب کے ایسے ہزاروں سفر کر گئے ہزاروں سفر کر رہے ہیں اور لاکھوں سفر کریں گے مگر ہر مسافر کی کہانی تھوڑے ہی لکھی جا سکتی ہے۔ داستان گو اور قدر دانوں کو جمع کرنے والی وہی ہے جو بہلی کے بیچوں بیچ میں بڑی حفاظت سے رکھی ہے۔ یہ مٹھائی کی ایک ٹوکری ہے جس میں کم سے کم دس بارہ سیر مٹھائی ہوگی۔ اس پر ایک پرانی چادر سلی ہوئی ہے اور انداز سے سوغات معلوم ہوئی ہے تین دن دو راتوں کا سفر ہے۔ خدا خدا کر کے پہلا دن کٹا۔ سرا کی صورت دکھائی دی۔ کمریں کھلیں۔ اسباب اُتارا گیا۔ لالہ نے عرض کی کہ اِن کے ایک عزیز کا گھر سرائے سے تھوری ہی دور پر ہے۔ اگر بڑے مرزا صاحب اجازت دیں تو یہ وہیں سور ہیں۔ ضروری سامان مثل حقہ بچھونے کے کوٹھری میں اُتارا گیا۔ باقی بھٹیاری کی سپردگی میں دیا گیا۔ اتنے میں بھٹیاری پان کھائے مُنہ لال کیے، مسکراتی سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میاں مٹھائی میرے یہاں نہ رکھتے تو اچھا ہوتا۔ میرے لڑکے بہت شریر ہیں، کھانے پینے کی چیز رکھنے والا میرا گھر نہیں۔ اگر نقصان ہو گیا تو میں کہاں سے پورا کروں گی۔ بڑے مرزا صاحب پریشان ہو گئے۔ بیساختہ اپنے خدمت گار پر نگاہ جمائی اور پھر کارگن صاحب کی طرف بے بسی سے دیکھا اور زبانِ حال سے بولے کہ بتاؤ اب کیا کیا جائے جب کوئی کچھ نہ بولا، فرمانے لگے کہ مٹھائی اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتی۔ اپنے خدمت گار کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ جب تک یہ مردود یہاں ہے، مٹھائی کی ٹوکری اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتی۔

ملازم:۔ (نہایت بے باکی سے جس میں گذشتہ اور موجودہ جھوٹے سچے الزامات کی شکایت بھی پائی جاتی تھی) ہم آپ کی کوٹھری کے پاس نہ جائیں گے ایسی مٹھائی کی طرف ہم پھر

کے بھی نہ دیکھیں گے، راستے میں چھوڑ کر چلے جانا نمک حرامی ہے مگر گھر پہنچ کر میاں ہمارا حساب ہو جائے پیچ پی، ہزار نعمت کھائی۔ اب ہم نوکری نہ کریں گے۔ چار آدمیوں کے بیچ میں جب دیکھو آپ ہم کو چوری لگاتے ہیں۔ ہاتھ بیچا ہے کوئی ذات نہیں بیچتی ہے۔ جب آبرو ہی نہ رہی تو نوکری کس کام کی۔ اپنے گھر کے سوکھے ٹکڑے ہم کو بہت ہیں۔ جہاں کام کریں گے وہیں پیٹ پل جائیگا۔ بڑے مرزا صاحب، نائب صاحب کی طرف اس طرح مخاطب ہوئے گویا انھوں نے ملازم کی باتیں سنی ہی نہیں اور کہنے لگے کہ شیخ جی یہ مٹھائی کہاں رکھوائی جائے۔

شیخ جی:۔ آپ کو اگر ایسا ہی خیال ہے تو منشی بخت بلی کے ساتھ کر دیجئے صبح کو لیتے آئیں گے ہاں ہاں ٹھیک ہے لالہ تم یہ ٹوکری لیتے جاؤ اس طرح پہنچ سکتی ہے۔ نہیں تو یہ مردود ضرور کھا جائے گا۔

ناظرین! ایسے بدتمیز بدنیت نوکر کو دیکھنا مرزا صاحب ہی کا کام تھا کیونکہ بجائے ہمارے آپ کے مرزا صاحب ہی کا ہاتھ پتھر کے نیچے دبا تھا۔ گھر میں ایک نوجوان لڑکی رہتی تھی۔ اس سے اور بڑے مرزا صاحب سے کچھ لگا سگا ہو گیا تھا۔ بیچارے بھاری بھرکم۔ مہذب شائستہ، ذی عزت آدمی تھے مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے اور اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں رذیل شریف سب میں مساوات ہو جاتی ہے۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کاندریں راہِ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

چیز اچھی تھی جیسے گھورے کا گلاب، نہ پگڑی میں لگاتے بنے نہ توڑ کر پھینکے بنے۔ اس لئے یہی ٹھہری تھی کہ ایک ٹٹی کی آڑ ضرور ہونی چاہیے اور یہ ملازم صاحب وہی ٹٹی تھے۔ جن کے آڑ میں شکار ہوتا تھا چونکہ ان واقعات سے تینوں فریق واقف تھے۔ اس وجہ سے آپ ہی کہیے کہ اس تثلیث میں تفریق کیونکر ہو سکتی تھی۔ رات کو لوگوں نے آرام کیا اور صبح اندھیرے منہ چلنے کا پاتر اب ہوا۔ مگر منشی جی کو آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ مرزا صاحب کا ملازم دوڑا گیا۔ منشی جی آئے تو مگر بہت پریشان اور شرمندہ۔

منشی جی:۔ حضور ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ جو سزا دیجئے کم ہے۔ مجھ سے ایک چوک ہو گئی۔

مرزا صاحب:۔ کیا چوک ہو گئی ہے۔

منشی جی:۔ چُوک حضور یہ ہوگئی ہے کہ جب آپ کا خدمت گار پہنچا تو میں نے اپنے عزیز سے کہا کہ مٹھائی اندر سے منگواؤ اور میں بیٹھ کر داتون کرنے لگا۔ اتنے میں ٹوکری میں کتے نے مُنھ ڈال دیا۔

بڑے مرزا صاحب:۔ایں، یہ کیسے ہوا۔(خدمت گار کی طرف اشارہ کرے) اور یہ کہاں تھا۔
منشی جی:۔ یہ بھی وہیں تھے۔ اُنھوں نے ہی دوت دوت کہا، مگر وہ مُنھ ڈال چکا تھا۔
بڑے مرزا صاحب:۔ اجی بالکل غلط کتا وتا کچھ نہیں۔ یہ اسی بے ایمان کی حرکت ہے۔ تم منشی جی اس کو کیا جانو یہ بڑا حرامزادہ ہے۔ حرامخور، نمک حرام آدمی ہے۔
ملازم:۔ آپ ہم ہی کو کہتے ہیں دیکھئے کپڑا دانت سے پھٹا ہے کہ نہیں اگر میں دوت دوت نہ کرتا تو سب کھا جاتا۔

بڑے مرزا صاحب:۔ کچھ نہیں ایک ہی طرف تو خراب ہوئی ہے اس نے کپڑا دانت سے پھاڑ ڈالا ہوگا اور پھر دوت دوت چلایا ہوگا۔ اجی میں اس کے ہتھکنڈوں سے خوف واقف ہوں۔ بھٹیاری سے کہو کہ جلدی سے اس کو بی دے یہ مٹھائی خراب وراب نہیں ہوئی ہے۔
لیجئے صاحب دوسرے دن کا سفر شروع ہوا اور شام کو بجائے سرائے میں سونے کے میدان میں پراؤڈالنے کی ٹھہری۔ چاندنی آدھی رات کے پہلے پہلے کھیت کر آئے گی۔ چپقلش سے یہ کھلے میدان کی ہوا کہیں خوش گوار ہے بہلی ایک طرف کھڑی کی گئی اور بیل اور گھوڑا درختوں سے باندھے گئے۔ گاڑی بان اور سائیس جانوروں کی حفاظت کے لیے نکل گئے، باقی مٹھائی کی رکھوالی کرنے لگے۔ بیچ میں مٹھائی کی ٹوکری اور اس کے ایک طرف بہ نفس نفیس خود مرزا صاحب کا بستر لگا۔ دوسری طرف نائب صاحب، تیسری طرف منشی جی کا اور چوتھی جانب سپاہی تعینات ہوا۔ یہ دیکھ کر خدمت گار نے اپنا مختصر بچھونا بہت دور ہٹ کر لگایا۔ رات کو دو کا عمل رہا ہوگا کہ دور سے آواز آئی دوت دوت، مرزا صاحب اُٹھ بیٹھے اور نائب صاحب سے کہنے لگے شیخ جی دیکھتے ہیں آپ کتا اسی سالے کو دکھائی دیا اور کسی کو نہیں۔
خدمت گار:۔ میاں آپ گالی دے رہے ہیں۔ وہ دیکھئے کالا کالا جا رہا ہے خیر رات کو بھاگتا ہوا کتا کسی کو کیا دکھائی دیا ہوگا مگر ٹوکری کا کپڑا پھر اُس طرح پھٹا ہوا پایا گیا اور مٹھائی بھی

اِدھر اُدھر پڑی دیکھی گئی۔ کُتے اور آدمی کا مسئلہ دوبارہ تازہ ہوا۔ آج بھٹیاری تو تھی نہیں لیکن سوئی دھاگہ سپاہی کے بٹوے میں نکل آیا اور مرزا صاحب نے خود گانٹھ گونٹھ کر ٹوکری کو درست کیا اور شام وشام بخیر وخوبی لکھنؤ پہنچ گئے۔

لکھنؤ سے دو چار کوس پہلے جب بڑے مرزا صاحب ایک خاص ضرورت سے ارہر کے کھیت کی طرف تشریف لے گئے تھے اور خدمت گار لوٹا لے کر ساتھ گیا تھا اس وقت منشی جی اور سپاہی میں مٹھائی کی باتیں چھڑیں تھیں اِن دونوں آدمیوں کو مٹھائی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے یہ لوگ بہتر رائے قائم کر سکتے تھے۔ منشی جی کا خیال تھا کہ مرزا صاحب اتنے شوق سے مٹھائی کی سوغات لے کر چلے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ کُتے والی بات ثابت ہو جائے کیونکہ پھر تو مٹھائی پھینک ہی دینا پڑے گی۔ سپاہی اس کے خلاف تھا مگر اس کی بھی رائے بدل چکی تھی کہ نائب صاحب کا ملازم آ گیا اور اس نے آہستہ سے کہا کہ خدمت گار نے مٹھائی کی دو ڈلیاں مجھ کو بھی دی ہیں۔ اب معاملہ صاف ہو گیا مگر مرزا صاحب سے کسی نے نہیں کہا۔ بہر حال لکھنؤ پہنچ کر مٹھائی رات کو سرائے کی کوٹھری کے اندر قفل میں رکھی گئی اور رات ہی سے صبح کو کچہری کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ منشی جی کسی اور کام سے بھیجے گئے اور خود مرزا صاحب مع نائب صاحب کے عدالت کو چلے۔ احتیاطاً خدمت گار علیہ ماعلیہ کو ساتھ لے لیا کہ مٹھائی اس کے دست برد سے بچی رہے۔ عدالت کے دروازے پر خدمت گار سے بستہ مانگا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کوٹھری ہی میں رکھا ہے۔ مٹھائی کی تباہی اور نیز لذت تینوں آدمیوں کی نگاہوں میں پھر گئی مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ وہی خدمت گار واپس بھیجا گیا اور سخت حکم دیا گیا کہ اُلٹے پاؤں واپس آئے مٹھائی کا خیال بار بار آیا۔ مگر مجبوری تھی۔ اب مرزا صاحب کی اُلجھن نہ پوچھئے، بیچارے پریشان حال سراسیمہ اِدھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ کیوں جی شیخ جی اگر پکار ہو گئی تو کیا ہو گا۔ مقدمہ تو خاک میں مل ہی چکا غضب تو یہ ہے کہ جو کوئی سُنے گا کیا کہے گا کہ گئے تھے مقدمہ لڑنے اور مسل گھر ہی چھوڑ آئے ہمارے مد مقابل وطن پہنچ کر کیا کیا ہنسی اُڑائیں گے۔ قصّے کو کیسا کیسا مشہور کریں گے۔ نمک حرامی کی انتہا کر دی۔ اب گھر پہنچتے ہی اس مردود، بے ایمان، مربی کُش محسن سوز، مار آستین کو نکال ہی دیں گے اور بُری طرح نکالیں گے۔ بھلا میں کہتا ہوں کہ دوسرے فریق سے مل تو نہیں گیا ہے اور جو

مسل سرا میں بھی نہ ہوئی تو یہ بڑا بے وقوف ہے اس کا اعتبار تو شاید دشمن بھی نہ کریں۔

شیخ جی:۔ جی نہیں اتنے دنوں کا رہا سہا ہے ایسا تو کیا کرے گا، دیکھئے معلوم ہوا جاتا ہے اگر پیشی کے وقت تک نہ آیا تو کوئی نہ کوئی ترکیب نکالی ہی جائے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔

بڑے مرزا صاحب:۔ پریشان کیسے نہ ہوں سب کی کرائی محنت غارت غول ہوئی جارہی ہے نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ اُوپر سے۔ خدا کرے ابھی پکار نہ ہو

مرزا صاحب یہ دعائیں مانگ ہی رہے تھے کہ قیامت کا صور پھنک گیا۔ مرزا فلاں بنام فلاں کوئی حاضر ہے۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ کلیجہ اُچھلنے لگا، ہاتھ پاؤں برف ہو گئے حواس یہ جا وہ جا۔ خدمت گار سے جا ملے۔

بڑے مرزا صاحب:۔ اب کیا ہو گا شیخ جی۔

شیخ جی:۔ چلئے تو عدالت سے عذر کریں گے۔

خدا نے خیر کی کہ وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ تاریخ بڑھ گئی۔ جان میں جان آئی۔ باہر نکلے کچھ خوش، کچھ غصہ لمبے لمبے قدم رکھتے چلے کہ مسل کی خبر لیں۔ سرا کے پھاٹک پر نائب صاحب کا نوکر دکھائی دیا۔

بڑے مرزا صاحب:۔ اور وہ کیوں نہیں آیا۔

نوکر:۔ اُس نے کہا میرے پاؤں میں موچ آگئی ہے تم لے کر جاؤ۔

بڑے مرزا صاحب:۔ شیخ جی مٹھائی کی خیر نہیں معلوم ہوتی۔

دور ہی سے کوٹھری کی کنڈی اُتری ہوئی اور دروازہ بھڑا ہوا دکھائی دیا۔ مرزا صاحب نے چال بدل دی اور دبے پاؤں چلنے لگے۔ دراڑ سے بھڑ کر ملاحظہ کیا۔ دیکھتے کیا ہیں پلنگ پر رنگ برنگ کی مٹھائی کا چورا اور ٹکڑے بکھرے ہوئے بہار دکھا رہے ہیں۔ ٹوکری کا گریبان پہلے ہی تارتار ہو چکا ہے اور رقیب روسیاہ کا منہ اور جیبیں پھولی ہوئی ہیں اور وہ پانچوں اُنگلیاں زمین پر رگڑ رگڑ کر صاف چادر پر موقع موقع سے کُتے کے پاؤں بنا رہا ہے۔ دروازہ کھلا دھڑ سے چٹاخ پٹاخ چپٹ پٹ۔ دھم پٹ تڑ۔ بھلا بے اندھی رانڈ کے جنے! آج پکڑا گیا نا۔

گھر

برسات کی رُت، بھیگی ہوائیں، سویرے سویرے دو صاحب بستی کے باہر کچی سڑک پر باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ایک۔ ’’بس تو بھائی چمّن ہم نے سوچا کہ اب بنا ہی ڈالیں۔‘‘

دوسرا۔ ’’بہت ٹھیک سوچے حکیم جی۔ دُور کی کوڑی لائے‘‘

حکیم۔ ’’پھر ہم نے کہا لاؤ بھئی چمّن سے بھی پوچھ لیں، دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں‘‘

چمّن۔ ’’میں کیا کہوں گا حکیم جی۔ ہاں میں ہاں ملاؤں گا تمہاری۔‘‘

حکیم۔ ’’تو بے رائے؟‘‘

چمّن۔ ’’پکّی۔‘‘

حکیم۔ ’’سوچی سمجھی؟‘‘

چمّن۔ ’’اجی روپئے میں سترہ آنے۔‘‘

حکیم۔ ’’دیکھو پھر نہ کہنا حکیم جی اینٹ چونے میں کہاں روپیہ جھونک دیا۔‘‘

چمّن۔ ’’لو اور سنو۔ یہ اُلٹی گنگا میں بہاؤں گا!‘‘

حکیم۔ ’’ہاں یہ کہنے کو نہ ہو کہ سدا کے یار، چولی دامن کا ساتھ ایک جگہ رہے سہے، اب مرنے کو بیٹھے تو جنگل جا بسایا۔‘‘

چمّن۔ ’’حکیم جی گھر بن جائے تب بتاؤں گا۔ میں تمہیں کب چھوڑنے والا ہوں۔‘‘

حکیم۔ ’’بس تو آؤ کہیں ذرا بیٹھ لیں‘‘ —— دونوں بیٹھ جاتے ہیں ’’ذرا اپنی چھڑی تو دینا بھئی، سوچا یہ ہے کہ‘‘ —— زمین پر نشان ڈالتے ہوئے —— ’’یہ رہا زمین کا ٹکڑا —— یہ پورب میں بُدھ سین کی امری ہے..........‘‘

چھٹن۔ ''جانتا ہوں آگے چلئے۔''

حکیم۔ ''اور دیکھو بھئی پچھم میں۔''

چھٹن۔ ''پٹوا تال پڑتا ہے بڑی مرغابی گرتی ہے جاڑوں میں۔''

حکیم۔ ''اور یہ جنوب میں برساتی نالا ہے۔ اور اِدھر شمال میں کئی بیگھے خالی زمین پڑی ہے، جس پر.........''

چھٹن۔ ''ٹھیرنا ٹھیرنا حکیم جی، اس پر کچھ نہ بنانا۔''

حکیم۔ ''چلئے نہیں بناتے۔ اچھا یہ تو ہوگئی چار دیواری۔ اب ذرا بھیتر آؤ۔''

چھٹن۔ ''آگئے پورب رُخ دروازہ رکھا ہے نہ؟''

حکیم۔ ''خوب دیکھا۔ ہاں تو یہ چبوترہ دے کر دالان در دالان، اور یہ رہے بغلی کمرے۔''

چھٹن۔ ''چلئے چلئے ٹھیک بن رہا ہے، جاڑے گرمی کا تو یہ انتظام ہولیا اب رہی۔''

حکیم۔ ''برسات؟ تو بھئی برسات میں چھت پر کھپریل میں سویا کریں گے۔''

چھٹن۔ ''ٹھیک ہے۔ مچھر پتو سے بچاؤ ہوگا ہلکی ہلکی پھوہار۔ چھم چھم کرتی بوندیں۔ دُور دُور بجلی کے کوندے حکیم جی گھر نہیں، بہشت بنا رہے ہو بہشت۔''

حکیم۔ ''اور کیا۔ اچھا چبوترے سے اترے تو دیکھو یہ — یہ رہا باورچی خانہ اور یہ اس سے ملی ہوئی ناج پانی کی کوٹھری اور ایندھن لکڑی کی بکھاری ہوگئی......اور......اور یہ...... یہ صدر دروازے سے لگی ہوئی بیٹھک......آپ اٹھو بیٹھو......مہمان ٹھہرالو۔ اور جب چاہو کیواڑ بند کردو مردانے کا زنانہ ہوگیا۔ کہو بھئی کیا کہتے ہو۔''

چھٹن۔ ''کہوں؟ حکیم جی تم نے گھر بنایا تو بھئی ہم نے بھی بنا ڈالا چلو یہی سہی، خالی زمین کا آج ہی بیعانہ دیا۔ کل رجسٹری کرائی اور پرسوں تمہارے پڑوس میں نیو رکھ دی۔''

حکیم۔ ''چھٹن ہوش کی باتیں کرو۔ کیا سچ مچ؟''

چھٹن۔ (ہنس کر) ''اجی تو آپ سے کچھ دب کر ہیں......یہ گھر تو اب بنے گا۔''

حکیم۔ ''یوں نہیں چھٹن......یہ لو اپنی چھڑی......گھر کی داغ بیل چلو ہماری اتری دیوار

تمہیں خوب ملی۔"

چھُنّن۔ "ہاں دیکھو تو کیا ڈولڈا لاتا ہوں"......(چھڑی سے زمین پر نقشہ بناتے ہوئے)......" دیکھو یہ دیواریں ہوئیں...... یہ تین در کا دالان اور یہ آمنے سامنے کمرے، ہمارے آدمی ہی کتنے ہیں۔لڑکا، اس کی بہو، ان دونوں کے لیے بہت ہے۔ بڑا سا آنگن رکھوں گا۔ یہ اِدھر فصل کی ترکاری بولی اور ایک آدھ نیبو کا پیڑ لگایا اور ہاں تم جو بھولے حکیم جی وہ اس گھر میں ہوگا۔ یہ دیکھو پکّا کنواں۔"

حکیم۔(ہنس کر) "اتو ہی سمجھا کئے تم ہمیں۔ارے چل بھیا میرے گھر کا نقشہ دیکھ یہ رہا اکیس ہاتھ پانی کا تلی توڑ کنواں۔"

چھُنّن۔" ارے سچ! ٹھیک کہتے ہو حکیم جی۔ بس تو پھر آجاؤ ہمارے گھر میں۔گرمی برسات لڑکا اور بہو کوٹھے پر سویا کریں گے۔ برساتی بنا دوں گا۔

حکیم "وہاں کس رُخ؟ برسات کا پانی کدھر گرے گا؟"

چھُنّن۔"ادھر اُتر کو......اور کہاں۔"

حکیم۔"یعنی میری چھت پر؟"

چھُنّن۔"ہاں ہمارے پرنالے گریں گے۔"

حکیم۔"یہ تو نہ ہوگا۔"

چھُنّن۔"اور کہیں نہیں گر سکتے۔"

حکیم۔"گریں نہ گریں اپنی بلا سے میری چھت پر نہیں گر سکتے۔ قانون کھلا ہوا ہے۔"

چھُنّن۔"یہ قانون وانون اپنے گھر بگھاریئے حکیم جی...... یہ چھُنّن کے پرنالے ہیں اب تو بن چکے اور اُتر کو آپ ہی کی چھت پر گریں گے۔"

حکیم۔"میں نالش ٹھونک دوں گا۔تعمیر رکوا دوں گا۔عدالت کو موقع پر لے آؤں گا۔"

چھُنّن۔" ٹھیک ہے مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ گھر بنے گا۔اس میں برساتی بنے گی۔ برساتی کے پرنالے اُتر والی چھت ہی پر گریں گے، کر لیجئے کیا کرتے ہیں۔"

حکیم۔" میں تمہیں قید کرا سکتا ہوں۔ یہ زمین ہی نہیں خرید نے دوں گا۔ اس کے

خریدنے کا حق مجھے ہے۔"

چھٹن ۔ "کر کے دیکھو، ہاروں گا، اپیل لڑوں گا۔ وہاں بھی ہاروں گا۔ بورڈ تک جاؤں گا...... پرتالے تو حکیم جی وہیں گریں گے جہاں چھٹن کے منھ سے نکلا ہے۔"

حکیم ۔ چھٹن کے منھ سے نکلا تو جھک مارا چھٹن نے۔"

چھٹن ۔ "حکیم جی کپڑوں میں رہئے کہے دیتا ہوں۔"

حکیم ۔ "نہیں تو؟"

چھٹن ۔ "بنا بنایا گھر بگاڑ دوں گا۔"

حکیم ۔ (ہنس کر) "تم؟ وہ کیسے؟ دیکھوں تو سہی۔"

چھٹن ۔ (پانوں سے زمین پر بنا نقشہ رگڑ کر) "ایسے! یہ لو اپنا گھر اور یہ مٹا تو اپنا گھر بھی مٹا۔"

حکیم ۔ "ارے او جاہل آدمی یہ کیا کیا؟"

چھٹن ۔ نہ جانے ہم تم دونوں اس وقت کہاں تھے۔ حکیم جی یہ زمین تو میونسپلٹی کی ہے"

☆☆☆

علامہ مضحکؔ دہلوی

عینک اتر جانے کے بعد

(۱)

''میں کہتی ہوں کہ موا گھر نہ ہوا سرائے ہو گیا اور جو رونہ ہوئی اُجڑی بھٹیاری ہو گئی......
رشیدؔ کی اماں نے یہ جملہ کچھ ٹیڑھے ترچھے ہو کر ''قوسین ابرو'' کو بقدر وسعت اُوپر تان کر اور اپنی پچپن سالہ پیشانی پر تین سے زاہد بل ڈال کر کہا۔

''کیوں، کیوں، کیا ہوا خیریت تو ہے؟......'' رشید کے ابا نے لڑکھڑائی آواز میں خلال کو دانتوں میں دباتے ہوئے پوچھا۔

''یہ اور خوبی ہے کہ چندرانے بھی لگے، جیسے ننھے نادان بچارے کچھ جانتے ہی نہیں۔''
رشیدؔ کی اماں نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

''ارے بی کچھ بتاؤ گی بھی یا اس وقت کا سب کھایا پیا خون پانی کر دو گی''۔رشیدؔ کے ابا نے خلال اُگالدان میں پھینکتے ہوئے کہا۔

''اچھی کہوں کس سے، کوئی پوچھنے سُننے والا بھی ہو، آخر دیوار پا کھوں سے کہوں؟'' رشید کی اماں نے گلا پھلا کر گردن کو لچکاتے ہوئے کہا۔

''تو میں سُن تو رہا ہوں اور کس طرح سنوں، برابر تو پوچھے جا رہا ہو۔تمہاری عقل بھی تو سیدھی ہو۔'' رشیدؔ کے ابا نے حُقہ کی نَے منہ میں لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں عقل تو بس اللہ نے مردوں کو دی ہے۔عورتیں بچاریاں تو ٹھیکے کی بنی ہیں اور یہ جو بیسیوں عورتیں دنیا کے ملکوں میں مردوں پر حکومتیں کر گئیں یہ سب کی سب عقل کی ٹیڑھی ہی تھیں۔'' رشیدؔ کی اماں نے اچھی خاصی سیاہ آنکھوں کو ایک دم سے سفید کر کے کہا۔

''ہاں صاحب ہاں۔آپ کی حکومت برحق، تسلیم ہے، آخر اس تمہید کو ختم کرو اصلی بات

بتاؤ۔'' رشید کے ابا نے کھانس کر حقہ پیتے ہوئے کہا۔

''اور کیوں جناب سیدھی عقل کے مرد، صاحب میں کہتی ہوں کہ دنیا بھر میں تو فرنگی عقل کا شہرہ ہے، یہ اُن کی عقلوں کو کیا ہوا جو انھوں نے عورتوں کو اپنی ملکہ اور بادشاہ تسلیم کر لیا۔'' رشید کی اماں نے پٹاری پر دُھر پیٹ بجاتے ہوئے کہا۔

''ارے بی آج کچھ بلّی لانگ گئی ہو، کریلا کھا گئی ہو، میں تو کہہ چکا عورت کی حکومت تسلیم ہے، زمین پر نہیں بلکہ مردوں کے ''اقلیم قلب پر'' قصہ ختم ہوا۔ وہ بات تو بتاؤ جس کا یہ دیباچہ ہے۔ وہ قصہ تو کہو جس کا یہ عنوان ہے۔''

کچھ اس موقع پر ہی نہیں ہزار ہا دفعہ دیکھا گیا کہ اس سے زیادہ سنگین موقعوں پر مرد و زن کی خوفناک لڑائیاں صرف عورتوں کی حکومت کا اقرار کر لینے سے دم بھر میں ختم ہو جاتی ہیں۔ مرد کا اعترافِ شکست بھی ایک ایسا تعویذ ہے کہ جس کے اثر سے خونی سے خونی لڑاکا سے لڑاکا ''عورت'' اس طرح قابو میں رہتی ہے جیسے ''زیر بند'' لگانے سے مُنھ زور اور ہر دم ''الف'' ہو جانے والا گھوڑا۔ رشید کے ابا نے اِدھر اعترف شکست کیا اُدھر بڑی بی کی تمام کھنچی اور تنی ہوئی رگیں اور تمام اینٹھے ہوئے اعصاب آنِ واحد میں ریشم کی طرح ملائم ہو گئے گویا ایک درجن شیشی ایمبورو کیشن کی مالش کر دی گئی۔ خونخوار اور خوفناک چہرہ ''خندۂ گل'' بن گیا۔ بڑی بی مارے خوشی کے پھول کر کپا ہو گئیں۔ آخر مسکراہٹ ضبط نہ کر سکیں، مُسکرا کر بولیں۔

''بس تمھیں یہ ہی دنیا دکھلاوے کی باتیں آتی ہیں۔ وہی کہاوت ہے کہ مارتے بھی جاؤ اور پیار بھی کرتے جاؤ۔ رشید کی اماں نے فاتحانہ مسرّت کے ساتھ کہا۔

''مارنے کی بھی خوب کہی، ہاں تمھیں قسم خدا کی، بات تو بتاؤ کہی کیا ہیں''۔ رشید کے ابا نے تین سیکنڈ لمبا دم حقہ کا لگانے کے بعد کہا۔

''تم خدا کے واسطے اس دوزخ کے دھوئیں کو تو بند کرو۔ اوں ہوں، مارے دھوئیں کے دم گھٹا جاتا ہے۔'' رشید کی اماں نے دوپٹے سے ناک اور منھ بند کرنے کے بعد مصنوعی کھانسی کھانستے ہوئے کہا۔

''اوہو معاف کرنا، کم بخت یہ طلب ایسی لگی ہے۔ مگر کیا خدا کی قدرت ہے کہ حقّہ کا مزا

بھی آتا ہے تو تمہارے ہی سامنے۔" رشید کے ابا نے جبراً وقہراً ہنسکھ سرکاتے ہوئے کہا۔

"اچھی دیکھنا تم میرے ٹوکنے سے گھڑی گھڑی بات پوچھنے کا تقاضا مجھ سے کرر ہے تھے، آخر تم نے کیوں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی ہے اور تمہیں کیوں نہیں گھر کی کسی بات کا خیال آتا۔" رشید کی اماں نے پوچھا۔

"گھر کی بات؟ واہی وا۔ گھر کی بات گھر والی جانے میں تو دو کوڑی کا مزدور ہوں، میرا کام تو صرف مزدوری کرنا اور پیسہ پیدا کرنا ہے۔" رشید کے ابا نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں، بس تمام دنیا کے غم اور فکر میری ہی جان کے لیے ہیں۔ اچھا میں گھر والی سہی مگر تم بھی تو ماشاء اللہ بچوں کے وارث ہو، آخر ان کی فکر کس کے ذمہ ہے۔" رشید کی اماں نے پوچھا۔

"بچوں کے وارث کی خوب کہی، اے بی نیک بخت، بچے میرے وارث ہیں یا میں اُن کا۔ تم نے تو غضب کیا سارے کا سارا قانونِ وراثت ہی اُلٹ دیا۔

"اے ہے، اس قانون وانون کو رہنے دو، میرا دم اُلٹتا ہے۔ میں تو بڑے بوڑھوں کے قول کو قانون سمجھتی ہوں، دنیا جانتی ہے کہ بچوں کا وارث باپ، اور وہ خیر سے ہیں کون سے سینکڑوں بچے، لے دے کر ایک پھوسڑا اللہ نے دیا ہے، اس پر بھی تمہارا یہ حال ہے کہ دم دم میں رسیاں تڑاتے ہو، کانوں پر ہاتھ رکھتے ہو، کیا یہ بچہ میں کہیں سے پکڑ لائی ہوں یا مانگے کا ہے۔"

"اوہو تمہارا مطلب رشید سے ہے، پھر میں اُس کی طرف سے کیا غافل ہوں۔ خدا کا شکر ہے، کھانا پینا، پہننا، اوڑھنا، تعلیم سب کا خیال تو ہے کون سی بات رہی جاتی ہے۔" رشید کے ابا نے کہا۔

رشید کے ابا بچارے تمام خدمات بیان کرتے رہے، مگر رشید کی اماں منہ بنا بنا کے تکلے کی منڈیا ہلاتی رہیں۔ آخر بڑے میاں بھی ایک دم سے چیخ اُٹھے۔ "ارے بی تو کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو، نیک بخت تم ہی بتا دو کہ کیا اور کام باقی رہ گیا۔"

"اے ہے تو جز بز کیوں ہوئے جاتے ہو، بیس پچیس برس شادی کو ہوئے لو آج یہ موقعہ

ملا کہ گھڑی دو گھڑی دل کی باتیں کروں تو بڑے میاں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ چراغ پا ہوئے جاتے ہیں۔اب بھی کیا جوانی کا خون باقی رہ گیا جو ذرا سی بات میں ایک رنگ آئے اور ایک جائے۔'' رشید کی اماں نے کومل اور تیور سروں میں یہ جملہ ادا کیا۔

''اچھا صاحب اچھا، لو پھر ہم ہارے تم جیتیں۔اب بتاؤ کہ کیا منشا ہے؟'' رشید کے ابا نے چند ''پسماندہ'' دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''منشا کیا ہے۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تمہارے ماں باپ نے تم کو لکھایا، پڑھایا، کھلایا، پلایا اور بس، آخر یہ لونڈی کہاں سے آگئی۔''

رشید کی اماں نے آخری جملہ کچھ اس چمک اور ٹھاٹھ سے کہا کہ رشید کے ابا کا بلند آہنگ قہقہہ پوری قوت کے ساتھ نکل پڑا۔ دس دفعہ اُفوہ، اُفوہ کہنے کے بعد بڑے میاں کی ہنسی مال گاڑی کی طرح ہچکولے کھا کھا کر رُکی اور بولے۔

''اب میں سمجھا!!!! اچھا رشید میاں کی شادی سے مطلب ہے، تو بیگم صاحب میں اس میں کیا کروں، اے بی کہیں بیویاں بازار میں بکتی ہوں تو لاؤ میں خرید کرلا دوں، جیسا نمونہ دو دُوکان دُکان دیکھتا پھروں، بانگیاں اور بھاؤ تم کو دکھاؤں، بتاؤں، اس کے بعد سودا چکا کرلاؤں۔''

''سبحان اللہ کیا کہنے ہیں۔اسی طرح تمہارے کنبہ میں شادیاں ہوتی آئی ہیں۔'' بڑی بی نے ہاتھ مٹکا مٹکا کر کہا۔

''مجھے تو کہتی ہو اور خود بات بات پر بُور کے لڈو کی طرح بکھری جاتی ہو۔آخر تمہارے پاس تو پچاس قسم کی عورتیں آتی جاتی رہتی ہیں، کچھ پتہ ٹھکانا بتاؤ میں بھی دوست احباب سے تذکرہ کروں، جانچ پڑتال کی جائے اللہ میاں کہیں نہ کہیں جوڑا ملا ہی دے گا''۔رشید کے ابا نے خوب جما جما کر کہا۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے کوشش ضرور کرنی چاہئے،لڑکا ماشاءاللہ اب سیانا ہو گیا ہے آج کل کا زمانہ خدا کی پناہ، شیطان سماتے دیر نہیں ہوتی۔'' رشید کی اماں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بات تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی، مگر......''

''اگر مگر کیا؟'' رشید کی اماں نے کہا۔

''یہ ہی زمانہ کی ہوا کو کہتا ہوں، ہمارے ہوش میں شادی بیاہ کے قانون کچھ اور تھے اب کچھ اور ہیں۔ ایک طرف لڑکوں کا مطالبہ ہے کہ ''بیوی'' حسین نیک تعلیم یافتہ ملے۔ اِدھر ماشاء اللہ لڑکیوں کا بھی فرمان ہے کہ ''دولھا'' خوبصورت مادرزاد زن مُرید۔ خدمت گذار، پیسہ والا، عیش کرانے والا، آزادی کا حامی، پردے کا مخالف۔ عرض وہ سب کچھ ہو جسے ''کوڑیا غلام'' کہا جاتا ہے۔ نیک بخت بیوی! جب ہم اپنے صاحبزادے کے لیے اپنے مطلب کی ''بیوی'' تلاش کریں گے تو پھر ادھر کا مطالبہ بھی ادا کرنا ہوگا اور یہاں ہمارے صاحبزادے ذرا...... آ آ آ''۔

رشید کے ابا نے'' آ'' پر اس طرح ٹھہر کر کہا جس طرح اونٹ منزل پکڑ لیتا ہے اور اس طرح گلے کے اندر ہی اور اس لفظ کی تکرار کی جس طرح کوئی نستعلیق گویا ''بلمپت'' سروں میں تان لگاتا ہے۔

''میں کہتی ہوں کہ آخر کو ''مگھم'' میں بات کہنے کا کیوں مرض ہے۔'' ''ہمارے صاحبزادے ذرا۔ اس سے کیا مطلب کیا ہمارے بچے میں کوئی خدانخواستہ ''فی'' ہے۔ اگر ہے تو مجھ میں اور تم میں دونوں میں ہوگی۔'' رشید کی اماں نے کہا۔

''نہیں نہیں، توبہ، توبہ، اس سے یہ مطلب نہیں کہ لڑکے کی صورت شکل ماشاء اللہ سب ٹھیک ہے۔ مگر ذرا...... آ آ آ۔''

''پھر وہی آ آ آ، لگائی، بڑے میاں صاف دل کھول کر کیوں نہیں کہتے، کیا یہاں کوئی غیر ہے۔'' رشید کی اماں نے کہا۔

''کہہ تو رہا ہوں ذرا......''

''کیا مطلب ہوا، کالا کلوٹا ہے، بدصورت ہے، کانٹرا کھدرا ہے......''

''نہیں بی، تمہاری زبان میں اللہ نے ''پنجاب میل'' کی روانی اور آر نمبر ۱۰۱'' کی سی طراری دی ہے، نہ کنواں دیکھتی ہے نہ کھائی۔ کانٹرا کھدرا کون کہتا ہے مگر ہاں ذرا آنکھوں میں......''

''ہاں ہاں کہہ دو اندھا ہے، چوپٹ دیدے ہیں۔'' رشید کی اماں نے چیخ کر کہا۔

''لاحول ولاقوۃ، نہ خدا رسول کا خوف نہ ڈر، جو مُنہ میں آیا اُگل دیا۔ ارے بی آنکھوں میں......''

''اے ہے۔بس رہنے دو۔ بڑے میاں۔ ہوش کی لو۔'' آنکھوں میں آنکھوں میں لگائی۔ کیا خدانخواستہ آنکھوں میں بیماری ہے۔ ہاں ذرا سا فرق ضرور ہے، آنکھیں بھینگی ہیں خدا کی دین......''

''اب تم جو جی چاہے مطالبہ مطالبہ چیخو، ہم نے تو یہی دیکھا کہ کالے کلوٹوں کو چاند کا ٹکڑا بیویاں ملتی ہیں، غضب خدا کا لڑکے ذات کے لیے بھی اب یہ قیدیں ہوگئیں۔ رہا پیشہ اور علم، اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ کیا میرا بیٹا نخاس کا گھوڑا ہے کہ اُس کی رگ رگ ٹٹولی جائے گی۔ کوئی قربانی کا جانور ہے جو بوٹی بوٹی دیکھی جائے گی۔'' رشید کی اماں نے ایک سانس میں اتنی لمبی تقریر سے ہانپتے ہوئے کہا۔

''تم تو بیگم صاحب اب بیل کے جون میں آ گئیں سمجھو، جو سامنے آیا سینگ جھکا دئے''

''اللہ نے تمہاری زبان کا تانتواں توڑ دیا ہے۔ جو چاہے بناؤ تمہارے پالے پڑی تو آدمی سے جانور ہوگئی۔'' رشید کی اماں نے بسورتے ہوئے کہا۔

''ارے بی ہٹو بھی، تم تو اب ایسی تنک مزاج ہوگئیں، ہاں وہ بات دھوری رہ گئی۔ میں نے کہا کہ آج کل کی لڑکیاں بغیر پَر کے اڑتی ہیں، شاید کل کلاں کو کوئی آدمی یا مشاطہ اِدھر اُدھر سے بَر دکھاوے کے لیے آئے تو اچھا ہے اپنا معاملہ مضبوط ہے۔ میں نے اس کی ترکیب سوچ لی ہے، آج ہی انشاءاللہ بوس کمپنی سے میاں رشید کے لیے خوبصورت رنگ کی عینک لادوں گا، اُس سے آنکھوں کو آرام بھی ہوگا اور ''بھینگے پن'' کا عیب بھی جاتا رہے گا......''

رشید کے ابا کچھ اور بولتے مگر باہر سے موکلوں کی بے ہنگام آواز نے گھبرا دیا۔ ''وکیل صاحب، وکیل صاحب'' کے شور نے پریشان کردیا۔ بیوی کو جلدی جلدی خوش کر کے بھاگے۔

(۲)

لیجیے میاں رشید کی شادی کے سامان پوری سُرعت کے ساتھ شروع ہیں، بات ٹھیرنے کے ''واقعات'' اور اُس کے تذکرے کو اس افسانے سے یوں محذوف سمجھ لیجیے جیسے مسئلۂ ارتقاء کی چند گم شدہ کڑیاں'' حضرات!!! جب باوجود اس نقص کے آپ نے بندر سے انسان تسلیم کر لیا تو پھر یہ بھی مان لیجیے کہ ماں کے اصرار اور تقاضے نے ''باپ'' میں سعی و کاوش کی ایسی روح پھونکی۔ ''بیوی'' نے میاں کی ایسی کنجی پھیری کہ میاں رشید'' کتھرا'' ہوگئے۔ پھر باپ کی

کوششیں یہیں پر ختم نہیں ہوئیں، میاں رشید کوا یکٹر کی طرح اس طرح سجایا گیا اور ایسا بنایا گیا کہ اُن کی ''احولیت'' اور آنکھوں کا ''بھینگا پن'' بھی پوشیدہ ہو گیا کیوں جناب یہ کچھ تعجب کی بات ہے، کیا آپ نے مشاہدہ نہیں کیا'' آرٹ'' اور نقاشی نے دم بھر میں'' مس رحمو جان'' کو گھڑ گھڑا کر'' گلفام'' بنا دیا اور'' مسٹر رانا'' کو'' نوشابہ''۔ یہ تسلیم ہے کہ یہ آرٹ شبے مانند کے ذیل میں تھا، مگر ذرا اور نگاہ کو وسعت دیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ ریناٹڈ نے ''لیڈی بس'' کو اپنے قصہ کی وسعت بھر لارڈ...... کی صورت میں پیش کیا اور بڑے بڑے مبصر دھوکا کھا گئے۔ میاں رشید کے لیے کیا مشکل تھا کہ اس ارتقا اور ''ندرت'' پر زمانے میں ایسی عینک لگائے رہتے جو سب کو دیکھتے مگر ان کی آنکھوں کو کوئی نہ دیکھتا۔

مگر آہ قدرت کی ستم ظریفی، ایک طرف تو انسان کو مسجودِ ملائک بنا دیا دوسری طرف اسی غریب کو ظلوماً جہولاً کا خطاب عطا ہوا۔ باپ نے میاں رشید کی ''احول'' آنکھوں کو دنیا سے چھپا دیا۔ مگر وہ زاویۂ نظر'' نہ درست کر سکے، اور میاں رشید میں یہ عیب البتہ ضرور باقی رہ گیا کہ وہ دیکھتے کہیں تھے اور بات کسی سے کرتے تھے۔

کجا می نماید کجا می زند

وکیل صاحب اس نقص کو دور کرنے میں بھی کوتاہی نہ کرتے مگر انسان کا مادرزاد ''جہل'' اور اس کی مجبوریاں حائل ہوئیں چنانچہ میاں رشید اتنے عیب دار ضرور رہ گئے کہ ع

نشانہ کس کا لیتے ہیں کسے زخمی بناتے ہیں

اب رہی میاں رشید کی شادی تو وہ غیر معمولی تو ضرور تھی، مگر وہی ہندوستانی رسومات کا مرقع تھی جس کو آپ نے صدہا دفعہ آرائش محفل اور چہار درویش میں پڑھا ہوگا۔ اس لئے صدہا دفعہ کی کھائی دعوت میں اور ایسی دعوت جس میں اب ''قند مکرر'' کی حلاوت مفقود ہو چکی ہے آپ شریک ہو کر کیا کریں گے لہٰذا بہ طریق اختصار اور حکیم اقلیدس کے ارشاد کی تعمیل میں فرض کر لیجیے کہ شادی ہو گئی شادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماں باپ اور بیٹے کی مدنی زندگی میں اچھا خاصا انقلاب پیدا ہو گیا۔ وکیل صاحب ابھی تک صرف ایک لڑکے کے باپ تھے اب خسر بھی ہو گئے بڑی بی یوں ہی ہر وقت اچھی خاصی مصروف رہتی تھیں، اب صبح سے شام تک ''بہو کے دانہ

گھاس'' رکھ رکھاؤ کی فکر دامن گیر ہوگئی۔

میاں رشید کی یہ حالت کہ اب کھونٹے سے بندھ گئے۔ یوں تو پڑھنے لکھنے کے بعد پھر آزاد تھے، اب سیر سپاٹے، دوستوں کے ساتھ مٹر گشت، سنیما، تھیٹر، غرض سارے شوق آن واحد میں ضبط ہوتے چلے گئے، بیوی ابھی حجاب کی حالت میں تھیں کہ اماں نے اُن کی طرف سے مطالبات حقوق میں کمی نہ کی شروع ہی سے تاکید تھی کہ بیٹا بیویوں کو اکیلا چھوڑ چھوڑ کر نہیں جاتے۔ اکیلی دلہن پر آسیب کا اثر ہو جاتا ہے۔ پرائی لڑکی کو گھر بیاہ کر لائے ہو، اب اس کے آرام، آسائش، دل بستگی کے تم ذمہ دار ہو۔ بڑی بی کا حکم تھا کہ یہ جو ایک کھلونا تم بعوض مبلغ ساڑھے تین ہزار معجّل اور ساڑھے تین ہزار مؤجل'' کے خرید کر لائے ہو، اسی سے دن رات کھیلا کرو۔

''نقاب پوش'' کھلونے کا یہ حال کہ جیسے تھان بدلہ ہوا گھوڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اپنے گھر سے صرف تین کام سیکھ کر آئی ہیں اور سوائے کم کھانے، کم بولنے اور تین گز لمبا گھونگھٹ نکالے رہنے کے اور کچھ آتا ہی نہیں۔ یہ مراحل بھی اللہ نے طے کر دیے اور ''حجابِ نو عروساں'' رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے غائب ہونے لگا۔ وکیل صاحب نے ''دیوان خانہ'' اور بڑی بی نے اپنا حجرہ سنبھالا۔ دم کے دم میں ''صنوبر'' نے سارے گھر پر قبضۂ مخالفانہ کر لیا۔ اندر باہر سب اُن کے محتاج اور وہ سب کی ''حاکم'' ہوگئیں۔

بڑی بی نے گھر کے کام کاج سے جبریہ ''پنشن'' پائی اور سوائے چھالیا کترنے کے تمام مشاغل سے فرصت حاصل کر لی۔ صبح کی نماز کے بعد ''بہو کا سلام'' لینا اور پھر دس پانچ منٹ بیٹے کو ''زن مُریدی'' کا درس دینا۔ بڑی بی کے لیے جزوِ عادت تھا۔ ماں کے سعادت مند بیٹے نے بھی بڑی بی کے تعمیل ارشاد میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اماں غضب خدا کا مکتب کا بچہ بھی بہت سے کام ''میاں جی'' کی بغیر مرضی کے اور بغیر پوچھے کر ڈالتا ہے۔ مگر رشید کبھی بیوی کے بغیر اجازت پیشاب یا پاخانہ بھی نہ گیا ہوگا۔ پھر بتایئے کہ ایک سنجیدہ کالج کا طالب علم صاحبزادہ جب اتنا بیوی کا بھوکا ہو کہ اُس کو اونٹ کے گلے کی بلّی بنا لے تو کون سی وہ بیوقوف اور ناسپاس بیوی ہوگی جو اس چھپر پھاڑ کر دی ہوئی حکومت سے انکار کر جائے یا رضا مند ہو۔ صنوبر کو اپنے گھر رخصت ہوتے وقت تو یہی سبق دیا گیا کہ دُنیا میں اگر خُدا کے بعد کسی کو سمجھے تو

''شوہر'' کو، مگر وہ غریب کیا کرے، جس آستانہ پر وہ اپنی ''جبین نیاز'' کو ٹکا دینا چاہتی تھی وہ ہستی خود خادم ہوئی جاتی تھی۔ اللہ بھلا کرے اس عشق نما محبت کا، اس وفور کا جس نے مسجود کو ساجد اور مخدوم کو خادم بنا دیا۔

آہ، اے جنت سے نکالے ہوئے انسان یہ ہی تو ذرا ایسا نکتہ تھا حفظ مراتب کا، اور یہی تو ایک راز تھا۔ ''الرجال قوامون علی النساء'' کا اس کو بھی تو نے نہ سمجھا اور غریب بیوی کو ''لیلیٰ'' بنا ڈالا تو پھر آ، اب تو بھی قیس بن جا۔ اے ظالم تو نے ''ازدواج'' کی ریشمین ڈوری کو عشق کے ''خاردار تار'' سے بدل ڈالا ہے تو پھر اس کی جراحت کو بھی دیکھ لیجیو۔

یوں تو ''میاں بیوی'' کا رشتہ بھی ایسا نکلا ہے کہ جس میں آپس کی بے تکلفی اور ارتباط بقول شخصیکہ ''سب دیگر'' سے شروع ہو جاتا ہے مگر یہاں تو میاں رشید نے اپنی وارفتگی اور دیوانگی سے بچاری صنوبر کا وہ سارا سبق جو اس نے ''راہ نجات'' اور ''بہشتی زیور'' سے حاصل کیا تھا، فراموش کرا دیا اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اس کو تمام وہ قلمی کتابیں اور نسخے جو زمانہ سلف میں لیلیٰ اور شیریں نے پڑھی تھیں حفظ کرا دیں۔ پھر کیا تعجب ہے، جو صنوبر نے بھی اسی زبان میں گفتگو شروع کر دی جو اس نے پڑھی۔ کیوں صاحب دُنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی بچہ پیدا.......... ولایت میں، ہوش سنبھالے ولایت میں، بڑا ہو ولایت میں، اور پھر ہندوستان آتے ہی ''بھاشا'' میں تقریر کرنے لگے۔ اور ''رسوئی'' یا دسترخوان پر بیٹھ کر نوالے مارنے لگے جی نہیں۔ وہ تو وہی زبان بولے گا، جو اس کو سکھائی گئی اور اُسی طرح کھائے گا جس طرح کھاتا چلا آیا ہے۔ اب آپ اس کی ''ھی'' کرنا چاہیں گے تو پھر اس کے لیے ذرا زمانہ اور وقت کی ضرورت ہے۔ صنوبر نے جس گھر میں گھونگھٹ اُٹھایا، وہاں چھوٹتے ہی رشید کو اپنی پرستش میں مصروف پایا اور اس درجہ مصروف پایا کہ جو قواعد اپنے گھر سے سیکھ کر آئی تھی وہ سب حرف غلط کی طرح مٹ گئے اور اب بجائے پرستش کرنے کے خود پرستش کی جانے لگی آپ کو حیرت نہ ہونی چاہیے، جب آپ دیکھیں کہ آج رات کو کھانا کھانے کے بعد جب وکیل صاحب کی محلسرائے میں رات منائی جانے لگی۔ بڑے میاں اور بڑی بی اپنے اپنے گھونسلوں میں پہنچ گئے تو میاں رشید نے بھی اپنا کھلونا سنبھالا۔ میاں بیوی اپنے خلوت گاہ میں مصروف راز و نیاز ہیں کہ ایک دم سے ایک چمکیلی آواز نے فضا کے سکوت کو

توڑا یعنی صنوبر نے ذرا معشوقانہ ترشی کے ساتھ رشید سے کہا:۔

''اچھی میں کہتی ہوں یہ کون سا فیشن ہے کہ رات کو بھی اندھیری آنکھوں پر چڑھی ہے آخر یہ کون سی بیماری ہے کہ دن رات تیلی کے بیل کی طرح گھٹا ٹوپ چڑھائے بیٹھے ہیں اُتارو اس کو، میں نے سو دفعہ کہہ دیا کہ مجھے یہ ایک آن نہیں بھاتا۔''

کیوں صاحب یہ کوئی معمولی حکم تھا۔ پھر کیا عینک اُتار دینا رشید کے لیے آسان تھا۔ عینک اگر خوشنمائی یا شوق کے لیے لگائی گئی ہوتی تو دم بھر میں اُتار کر ''تعمیل ارشاد'' میں پھینک دی جاتی، وہاں تو ع

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

عینک محض عیب پوشی کی غرض سے لگائی گئی تھی۔ آج اگر تعمیل ارشاد میں یہ پردہ راز اُتار کر پھینک دیا جاتا تو پھر ''احولیت'' کا راز افشا تھا، بھینگا پن ظاہر ہو جاتا، بچارے رشید کی نظرِ جاناں میں کیا قدر رہ جاتی۔ آج تک تو میاں رشید بیوی کے عاشق زار تھے، ابھی عینک اُتارنے کے بعد ''موا بھینگا'' بن کر رہ جاتے۔ سوچتے تھے کہ کیا جواب دوں، کس طرح ٹالوں، ادھر یہ بھی خیال تھا کہ دنیا کو ارتقاء نے پہلے ہی بوزنستان بنا ڈالا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے سوچتے ہی سوچتے یہ نیک بخت بندر سے بنی ہوئی انسان ایک جھپٹا رسید کرے اور عینک لے بھاگے تو سب کیا دھرا بے کار ہوگا، جو کچھ قدر ہوتی ہے وہ بھی جاتی رہے گی، گھبرا کر بولے۔ ''آخر تمہارا غریب عینک نے کیا بگاڑا۔ تم کیوں اس پر اصرار کرتی ہو۔''

''پھر وہی اصرار، میں کر رہی ہوں یا تم، میں کہتی ہوں کہ رات کا وقت ہو گیا عینک اُتار ڈالو، اب بھی دھوپ رکھی ہے جو تمہیں ستائے گی اور تم مانتے نہیں بس یہی ہوگا کہ ایک دن چپکے سے چھپا دوں گی۔ پھر دیکھوں تم کہاں سے لاؤ گے''۔ صنوبر نے تیور بدل کر دلبریانہ انداز سے کہا۔

''آخر اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ میرے آرام کی چیز ہے اگر چھپا دو گی مجھے تکلیف پہنچاؤ گی۔'' رشید نے دانت نکال کر کہا

''واہ یہ بھی خوب آرام کی چیز ہے جس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہو۔'' صنوبر نے چندرا کر کہا۔

''بہت خوب، اے بی عینک تمہارے آس نہ پاس، تمہیں تکلیف خوب ہوتی ہے۔''

رشید چاہتے تھے کہ اسی طرح باتوں باتوں میں پھسلالوں، آج اس قصہ کو ختم کردوں کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچ مچ رات کو عینک چھپادی جائے اور صبح پھر آنکھیں چار ہوں اور سب بھانڈا پھوٹ جائے۔ انھوں نے کچھ اور اس معاملہ کو چھیڑنا چاہا ادھر صنوبر نے ''اے ہے دماغ نہ چاٹو مجھے نیند آرہی ہے۔'' کہہ کر اپنا پلنگ سنبھالا۔

(۳)

صاحب بُرا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میاں رشید نے بیوی کو مُنہ لگا کر، سر چڑھا کر تو ایسی غلطی نہیں کی جیسی اپنا ''مادرزاد۔'' خداداد'' ''عیب چھپا کر کی۔ کیوں صاحب اگر میاں رشید بھینگے تھے تو اس میں اُن کی کیا ذمہ داری۔ جیسا پیدا کیا گیا، ہو گئے۔ ہاں اگر غلطی کہیے تو ماں باپ کی تھی کہ بچپنے سے فکر نہ کی، شاید آنکھیں ٹھیک ہو جاتیں اور یہ غضب کیا کہ بیوی سے اس عیب کو چھپایا اور ایک بلا مول لی۔ ادھر بیوی نیک بخت کو بھی بیچ پڑ گئی کہ وہ عینک اُتروا کر چھوڑے گی خیریت ہوگئی کہ صنوبر کو نکاح سے پہلے ضد نہ سوار ہوئی ورنہ نکاح کبھی نہ ہوتا اور رشید کبھی شوہر نہ بنتے جب تک عینک نہ اُتار دی جاتی۔ صنوبر کی ضد کا کیا علاج، مُلّا کی دوڑ مسجد۔ رشید کو آج موقع ملا کہ ساری رام کہانی ماں سے بیان کی جائے۔

جناب والا چاہے جاڑا ہو چاہے برسات انسانوں میں ایک ایسا بھی فارغ قسم کا فرقہ ہے جو دوپہر کو سونا حلال اور جائز سمجھتا ہے۔ رشید کی والدہ بھی ہی اسی عقیدے کی پابند تھیں، آندھی جائے مینہ آئے مگر ان کا دوپہر کا دو گھنٹہ کا سونا نہ جائے۔ رشید آج صبح سے تخلیہ کی تاک میں تھے، ادھر بڑی بی نے اپنا تکیہ اور پاندان بغل میں دبایا اُدھر رشید بھی چپکے چپکے پیچھے ہولیا، بڑی بی نے تکیہ پلنگ پر رکھ کر بسم اللہ کہہ کر چاہا تھا کہ دراز ہو جائیں کہ رشید بولا ''اب آپ سو جائیں گی اور میرا قصہ یوں ہی رہے گا''

''اوئی بیٹا، مجھے ڈرادیا۔'' رشید کی اماں نے اُچھل کر کہا۔

''دن دہاڑے ڈرتے آپ ہی کو سُنا ہے، لیجئے آپ نے عینک لگوا کر ایک بلا میرے گلے باندھی۔ آپ کی بہو آج تین روز سے سر ہیں کہ عینک میرے سامنے نہ لگایا کرو۔ مجھے وحشت

ہوتی ہے۔ بلکہ اسی بات پر خفا ہیں اور کہتی ہیں کہ میں عینک چھپا دوں گی اب ذرا اس کا انتظام آپ ہی کیجیے، ورنہ پھر میرے بس کی بات نہیں۔" رشید نے کہا۔

"اچھی یہ انھیں کیا سوجھی، بولی یہ نئی طرح کی وحشت ہے۔ کل کو اُن کو اذان کی آواز سے وحشت ہوگی تو کیا دنیا کی مسجدیں پٹ ہو جائیں گی۔ شہر کے دیے گل کرو میری آنکھیں دکھتی ہیں۔" رشید کی اماں بولیں۔

"آپ جانیں آپ کی بہو جانیں، میرے کہنے پر تو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں، اور یہ سب کچھ آپ کا کیا دھرا ہے۔ بیوی کو ہوا سمجھنا آپ ہی نے سکھایا ہے۔" رشید نے ہنس کر کہا۔

"اوئی بیٹا ہوش کی دوا کر۔ تو بھی میرے اُوپر زورے توڑتا ہے۔ میاں جانے بیوی جانے، اچھا خیر دیکھو انشاء اللہ آج سے کل تک میں سمجھا دوں گی۔"

رشید ماں سے اپنا دُکھڑا رو کر بیوی کی عدالت عالیہ میں پہنچے تو وہاں دھر لیے گئے، پہلے تو "اچھی کہاں اُڑ گئے تھے، لو میں اکیلی بیٹھی ہوں۔" کا سوال ہوا پھر وہی عینک اور وحشت کا سوال۔ اس وقت رشید کو بھی کچھ دو چار تاؤ آن آن کر رہ گئے۔ خیریت ہوگئی ورنہ کچھ تعجب نہیں تھا جو محبت میں شکن آجاتی۔ مگر معاملہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر...... ہو کر رہ گیا۔ بیوی نے ادھر کروٹ لی، میاں نے کتاب سنبھالی، کتاب کیا پڑھنے کے لیے سنبھالی تھی۔ وہ صرف گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے چہرے کی نقاب تھی۔ مگر سچ ہے کہ آج شادی کو خیر سے نصف سال کا زمانہ ہو گیا رشید کو اب اپنی "غلامی اور بیوی کی "ملوکیت" کا احساس ہوا...... اماں اب چاہے روؤ چاہے دھوؤ، آخر کیا ہم نے کہہ دیا تھا کہ خدا کی دی ہوئی، پنچوں کی دی ہوئی "مشیر زندگی" سے ایسی کورانہ محبت کرنے لگو کہ بیوی اور میاں میں جو خط امتیاز لازم ہے وہ بھی مٹ جائے۔ رشید کو جب بیوی کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو پھر اضطراب کی یہ کیفیت تھی کہ پھیپھڑے آپ سے آپ "پکھال" کی طرح پھول رہے تھے، اچھی خاصی سانس لینے کی "انسانی آواز" فوں فوں بن گئی تھی۔ دو دو منٹ کے بعد خواہ مخواہ کروٹیں بدل رہے تھے اور ہر کروٹ پر لاحول اور توبہ توبہ کی تسبیح جاری تھی۔ گھڑی گھڑی تکیہ سرہانے سے پائنتی اور پائنتی سے سرہانے، اس طرح بدلا جا رہا تھا جیسے کوئی کمزور شطرنج کھیلنے والا چال چل چل کر پھیرا کرتا ہے۔ کھنکھار کر اُگالدان میں تھوکا جا رہا تھا۔ کبھی اوپر کا ہونٹ چبایا

جاتا تھا۔ کبھی نیچے کا۔ کبھی پلنگ کی پٹی پر انگلیاں مصروف طلبہ نوازی ہو جاتی تھیں، تو کبھی حلقوم اور ناک مصروف غنا۔ کبھی مکتب کے بچے کی طرح آگے پیچھے جھومتے تھے تو کبھی فلسفی اور "حال قال" والے درویش کی طرح دائیں بائیں..... تھوڑی دیر کے بعد "بڑی غلطی کی۔"..... "بڑی نادانی کی۔"..... اسی قسم کی ٹوٹی ٹوٹی غیر مسلسل آوازیں بگڑے ہوئے ریڈیو کی طرح آتی رہیں۔

اللہ نے بڑا کرم کیا اس بے چینی پر اور رشید کی تکلیف پر، کوئی پون گھنٹہ اسی سلسلہ میں لگا ہوگا کہ صنوبر نے کروٹ بدلنی چاہی کان کی بالی تکیہ میں پھنس گئی۔ بی صنوبر چوہے دان میں پھنسی ہوئی گلہری کی طرح چر چر کرنے لگیں، زیادہ زور کرنے کا ارادہ کیا تو "لوک" چرنے لگی۔ بیتاب ہو کر، اچھی اچھی" کا غل مچانا شروع کیا۔ صنوبر کی آواز کان میں پہنچتے ہی رشید نے وہی کیفیت محسوس کی جو سپاہی "گنتی کا بگل" سُن کر محسوس کرتا ہے۔ "سارا اضطراب"، "ساری تخیل" صنوبر کے طرز عمل کے خلاف "صدائے احتجاج" کا ہجوم اس طرح پھٹ گیا جیسے موجوں کے تھپڑے سے کائی۔ اس طرح غائب ہوگئی جیسے بدلی کی چھاؤں۔ رشید گھبراہٹ میں مع تکیہ کے صنوبر کے پلنگ کی طرف لپکے اور بدحواسی دیکھئے کہ سرہانے کی بجائے پائنتی پہنچ گئے اور صنوبر غریب کے پاؤں جھنجھوڑنے شروع کر دئے "بیگم بیگم خیر تو ہے، کیا ہوا کیا ہوا۔" کی مشین گن چھوڑ دی۔

"اچھی جلدی آؤ، ادھر آؤ، میری بالی کی گونج تکیہ میں پھنس گئی لوک پھٹی جاتی ہے۔" صنوبر نے "بچکانی" آواز میں بسورتے ہوئے کہا۔

رشید نے خدا خدا کر کے گونج تکیہ میں سے نکالی۔ صنوبر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان کہہ کر میاں کی طرف دیکھا تو وہی "لال ٹین" چڑھا سے سہمے کھڑے ہیں۔

دیکھئے اللہ کی شان، اس کی دین اس وقت میاں کی یہ خدمت۔ درد کی تکلیف اس کے بعد راحت اور آرام کا احساس کچھ عجیب طرح سے صنوبر کے دل میں گھر کر گیا۔ لگی گن گن کر میاں کو دعائیں دینے۔ آنسو پونچھتی جاتی تھی اور سینکڑوں دعائیں دیتی جاتی تھی۔ رشید میاں اب بھی نہ سمجھے، اس موقعہ کو، وقت کی نزاکت کو، جھاڑے کے ٹٹو کے پاس وقت بے وقت جب جایئے وہ یہی سمجھے گا کہ آیا "بمبوکاٹ" میں جوتے جانے کا وقت۔ اونٹ کی کمر پر جب

شفقت سے ہاتھ پھیر یگا اُس کو یہی احساس ہوگا کہ اب لدے۔بس بلبلانا شروع کردے گا۔ رشید کو کیا معلوم کہ اب کیا ہوگیا اور کیا ہوگا۔وہ گھبرا گھبرا کر بیگم کیا کہتی ہو بیگم میں تو تمہارا مطیع ہوں، خدمت گذار ہوں، یہ تو میرا فرض تھا۔دیکھوں کان میں جراحت تو نہیں آئی، زیادہ صدمہ تو نہیں پہنچا'' کہتے رہتے۔آخر پھر صنوبر ہی کو خیال آیا اُس نے میاں کو ٹوکا۔

''دیکھو مجھے کیوں گنہگار کرتے ہو، اپنی عاقبت بناتے ہو، میری بگاڑتے ہو، تم نے خواہ مخواہ مجھے بیجا سر پر چڑھا کر اپنی جناب میں گستاخ کرلیا اور میں اپنا ''بیوی'' ہونا بھول گئی۔ ادھر تین چار مہینے سے بالکل بے بہرہ بن گئی۔اب خیال آتا ہے، شیطان نے مہلت دی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ''عینک'' کے متعلق تم سے خواہ مخواہ اصرار کیا، مجھے معاف کردو فضول بات، تھی میری بیوقوفی تھی۔زبردستی تھی۔''

صنوبر اپنے لکچر اور میاں رشید، ''صرف وید'' میں غرق تھے کہ نیچے صحن میں سے بڑی بی نے للکارا۔

''بیٹی دلہن، آؤ نیچے آؤ۔چاء پیئیں، عصر کا وقت گذر چکا۔''

(۴)

کسی مُلاجی سے پوچھیئے کہ ''جمعہ'' کتنے دن بعد آتا ہے یا مہینہ بھر اور ایک سال میں کتنے ''جمعہ'' ہوتے ہیں۔وہ آپ کو فوراً بتادیں گے کسی ملازم سرکار سے پوچھئے کہ تمہاری پنشن میں اب کتنے دن ہیں وہ آپ کو جھٹ سے بتادے گا۔کسی لیڈر سے پوچھیئے کہ فلاں فلاں مقام پر کانفرنس کب کب ہوئی تھی اور کب ہوگی، وہ بھی آپ کی بتادیں گے، آہ، مگر آپ کی ستم ظریفی، اگر آپ سے پوچھا جائے اور صرف اسی قدر پوچھا جائے کہ میاں رشید کی شادی کو کتنا زمانہ ہوا تو مُنہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

جی، صاحب بہت اچھا اب یاد رکھئے کہ میاں رشید کی شادی کو اب ماشاءاللہ پورا ایک سال ہوگیا۔اس ایک سال کے عرصہ میں رشید نے مجنوں فرہاد کی سی محبت، غلاموں کی سی اطاعت ''پنڈتوں'' کی سی پرستش سب ہی کچھ کیا مگر تھے تقدیر کے اچھے کہ ''بیوی'' پھر ''بیوی'' ہوگئی اور سستے چھوٹ گئے، نہ صحرا نوردی کی نوبت آئی اور نہ ''جوئے شیر'' کی۔نہ نخاس میں بکے

اور نہ کوئی گھری ''سادھی'' کا حکم ہوا مگر جناب والا یہ سب کچھ تو ہوا، کیا اب ان کی ''تقدیر'' ہمیشہ کے لیے گردش سے فارغ اور بے نیاز ہوگئی، کیا وہ زمین جس پر وہ سانس لیتے ہیں۔ اب ''سیارہ''......''ثابت'' ہوگئی۔ کیا وہ آسمان جس کے نیچے وہ زندہ ہیں اب ''کج رفتار'' نہیں رہا۔ کیا وہ ''زمانہ'' جس کے اندر سے وہ گذر رہے ہیں اب انقلاب سے نا آشنا ہو گیا......استغفر اللہ۔ اماں کیا تقدیر اور کیا زمین و آسمان اور کیا زمانہ سب چیزیں پیدائشی چکرانے والی ٹھہریں تو بھلا وہ گردش سے کیسے بچتے، ابھی خدا خدا کر کے ''میاں'' ''میاں'' اور ''بیوی'' ''بیوی'' بنے تھے کہ ایک اور تازہ مصیبت نازل ہوئی۔

کیوں جناب کیا کوئی بچہ پیدا ہو گیا۔ جی نہیں، کیا کچھ آمدنی میں کمی آگئی، جی نہیں، آخر پھر کیا ہوا...... جناب ان کی اہلیہ محترمہ باوجود ''بیوی'' کے تمام تر حقوق، فرائض اور احساس کے بچارے رشید سے خفا ہوگئیں۔ یہ خبر کوئی معمولی نہیں ہے، آج ان حضرات سے پوچھیئے جو متاہل زندگی بسر کر رہے ہیں اور جن کی آسودہ پُر امن اور خوشگوار زندگی کا دار و مدار صرف ''افسر'' اور ''بیوی'' کی رضامندی ہے۔ میاں رشید ''افسر'' کی رضامندی سے بے نیاز تھے، مگر بیوی کی ناراضگی میں مبتلا۔

اِس دفعہ ان کی ''بیوی'' ایسی آزردہ ہوئیں کہ اندر ہی اندر برف کی طرح گھلنے اور بتاشے کی طرح بیٹھنے لگیں۔ رشید اس معاملہ میں معصوم ہوں یا قصوروار، یہ تو بعد کو فیصلہ ہوگا فی الحال تو بچارے بیوی کی اس حالت سے بالکل بے خبر اور نابلد تھے۔ بیوی نے یہ سوچا کہ ابھی حال میں مصالحت ہوئی ہے، میں میاں کو میاں بنا چکی ہوں۔ اگر اب حرف شکایت زبان پر لائی تو غضب ہوگا۔ پس لازم ہوا کہ اللہ پر بھروسہ کر کے چپکے چپکے غم کھایا جائے کہ اس سے فائدہ کی اُمید تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس بخشش کا کوئی سبب بھی تھا جی ہاں تھا کیوں نہیں، اس عالم اسباب میں بھلا کوئی چیز سبب سے خالی ہے۔ سبب جو کچھ بھی تھا وہ خلاف قانون قدرت عمل کرنے کا۔ یعنی میاں رشید کی حماقت کہ انھوں نے عینک کے ذریعہ اپنی مادرزاد احولیت کو چھپا لیا اگر نکاح کے کاغذ میں ''شوہر کے حلیہ'' اور ''شناخت'' کا دستور ہوتا تب بھی غنیمت تھا۔ بات ساری یہ تھی کہ جس دن سے میاں بیوی میں صلح ہوئی تھی اس دن سے بیوی نے میاں کی خدمت

کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا یہاں تک کہ خود باورچی خانہ میں روز جا کر میاں کے لیے کچھ کھانا پکایا کرتی تھیں خود کھانا کھلاتی تھیں۔ میاں رشید کو بیوی کے بغیر کب چین تھا، وہ جب تک کالج جاتے اس وقت تک بیوی دس پانچ دفعہ ہنس بول ضرور لیتے۔ بیوی نے جب سے باورچی خانہ سنبھالا، میاں نے وہیں بات چیت شروع کردی۔ بلکہ کھانا تک وہیں بیوی کے پاس کھاتے تھے۔ یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا جس بات نے بیوی کو زیادہ تکلیف پہنچائی وہ ''میاں رشید کا زاویہ نظر تھا۔ یعنی وہی ع

کجائی نماید کجامی زند

بات بیوی سے کرتے تھے، مگر چہرے کا رُخ پکانے والی ماما کی طرف رہتا تھا دو ایک دن تو بیوی نے ٹھنڈے پیٹوں دیکھا مگر آخر کب تک۔ بقول شخصیکہ بیوی کو سوکھے ٹکڑے کھانے اور پھٹے کپڑے پہنے منظور مگر میاں کی محبت میں ''اشتراک'' ناقابل برداشت۔ صنوبر کے دل میں گرہ بندھ گئی۔ وہ یقین کرنے پر مجبور ہوگئی کہ میاں میں اور ماما میں کچھ لگاوٹ ہے، پُرانی محبت ہے اور اب میری چھاتی پر مونگ دلنا چاہتے ہیں۔ یعنی ''ماما'' سے اس طرح گھل مل کر باتیں کرتے ہیں گویا مجھ سے بول رہے ہیں۔

جناب کس کے قلم میں طاقت ہے کہ جو صنوبر کے اس ''جلاپے'' کو صفحہ قرطاس پر لاسکے۔ آپ خود ہی اس کو قیاس کرلیجئے۔ بچاری صنوبر کے دل میں اس سے پہلے، دن عید اور رات شب برات تھی، اور اب، آہ اب میاں کی اس حرکت کو دیکھ دیکھ کر دن بارہ وفات اور رات محرم، صنوبر موم کی طرح پگھلنے لگی اندر ہی اندر گھن لگنے لگا عجیب طرح کا سہم سمایا۔ کچھ دن دیکھا آخر یہ ہی سوچا کہ میکے چلی جاؤں۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، نہ یہاں سامنے ہوں گی نہ یہ دیکھو ں گی، آخر ایک روز کا بہانہ کرچپکے سے ڈولی منگا رفو چکر......

صنوبر کا جانا کوئی نئی بات نہ تھی، زمانے بھر کی بیاہی بیویاں شہر کے شہر میں میکا اور سُسرال رکھنے والیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ میاں رشید کو اطمینان تھا، شام تک راہ دیکھی، جب بیوی نہ آئیں تو اپنے قلب مجبور کو دلاسہ دے کر سو رہے صبح کام دھندا کر پھر کالج گئے۔ یوں تو صنوبر بسا اوقات صرف دن بھر کے لیے جایا کرتی تھی، آج پورے پورے تین دن اور رات ہوگئے مگر

واپسی ندارد۔ معلوم نہیں کتنے دن کا واپسی کا ٹکٹ تھا۔ اب تو رشید کو بھی پریشانی اور جدائی کی تکلیف نے ستایا۔ صبر نہ ہوا شام کو اماں سے کہہ کر سسرال پہنچے۔ بیوی نے دیکھا تو خوش بھی ہوئیں اور مکدر بھی۔ خوش تو میاں کے آنے کی، اور رنج اپنے غم کے تازہ ہونے کا۔ ساس کو آداب کرنے کے بعد سیدھے صنوبر کے کمرے میں پہنچے اور بیٹھنے سے پہلے ہی چلنے کا تقاضا کیا۔

''واہ بیگم واہ، خوب ترسایا۔ آ کر بیٹھ گئیں، چلو میں سواری منگاتا ہوں۔'' رشید نے کہا۔

''واہ وا، تمہیں کیا خبر میری کیا حالت ہے، کیسی تکلیف ہے، میں ابھی نہیں جا سکتی کل ہی سے علاج شروع ہوا ہے۔ حکیم جی نے چڑھنے اترنے کو منع کیا ہے۔''

''علاج'' اور ''حکیم جی'' کا نام سُن کر ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، گھبرا گھبرا کر پوچھنا اور استفسار شروع کیا۔ بیوی نے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر ٹال دیا۔ بھلا مردوں کو عورتوں کی بیماریوں سے کیا واسطہ۔ رشید نے بھی سوچا کہ آم کھانے یا پیڑ گننے مطلب تو بیوی سے تھا، وہ مل گئی، نہ سہی وہ گھر یہ گھر سہی، شام کو روز یہیں آ جایا کریں گے۔

(۵)

وہ کہتے ہیں کہ ع:۔ جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا۔

وہی ہائی بی صنوبر کی ہوئی، یوں تو خدا کے فضل سے وہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔ مسلمان کی لڑکی تھی مگر اب جب سے میاں کی طرف سے یہ دغدغہ دل میں بیٹھا تھا کوئی وظیفہ اور دعا باقی نہ تھی جو عمل میں نہ آئی ہو، کوئی رات ایسی نہ تھی جس میں تہجد گذاری نہ کی گئی ہو۔ مگر تسخیر کس چیز کی ہوتی۔ بچارے رشید کے پاس اپنا ''دل'' کہا تھا وہاں تو ؎

دل چُرا لے جانے والا کون تھا ۔۔۔ آپ ہیں اور آنے والا کون تھا

اللہ اس مغالطہ کا بھلا کرے کہ جس نے صنوبر کو مفت کا بیمار ڈالا۔ رشید کا دل بھی چُرا لیا اور اب تسخیر کا عمل بھی جاری ہے۔ کون سمجھائے اور کون بتائے نہ کسی سے وہ کہیں، بقول ٹھٹھیکہ نہ منہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں، آج رات کو بھی ابھی صبح کی اذان نہیں ہوئی تھی کہ صنوبر اُٹھ بیٹھی۔ پاس ہی پلنگ پر میاں رشید نیند سے ہم آغوش تھے۔ ان کا آرام اور چین تو پہلو میں تھا، ان کی جاگے بلا، چپکے سے ضروریات سے فارغ ہو، نفل ادا کرنے شروع کئے اور پھر تسبیح پڑھتی رہی، نماز

ادا کی اور مصروف دُعا ہوئی صبح کا وقت نزول رحمت کا ہوتا ہے۔ میاں کو پہلو میں دیکھ کر صنوبر کا حضور قلب اور دو آتشہ ہو گیا۔ ادھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے کہ رونا آ گیا، خوب لہک لہک کر دعا مانگنی شروع کی الٰہی تو میرے میاں کو راہ راست پر لا، کا کلمہ جاری ہوا اور اے اللہ تو میرے میاں کی ٹیڑھی نگاہ کو سیدھا کر دے، کی تکرار جاری ہو گئی۔ اسی عالم بے خودی میں صنوبر کے مُنہ سے چیخ نکل گئی، زور زور رونے لگی، لیجئے دیکھ لیجئے "دل رابدل رہ است" کی کرشمہ سازیاں میاں رشید گھبرا کر اُٹھ بیٹھے، دیکھتے کیا ہیں کہ بیوی سجدے میں پڑی رو رہی ہیں اور اللہ میاں تو اپنے کرم سے میرے میاں کی ٹیڑھی نگاہ کو سیدھا کر دے۔" کا کلمہ جاری ہے۔ برداشت نہ کر سکے، گھبرا کر ننگے پاؤں بھاگے، جلدی میں عینک بھی نہ لگائی اور بیوی کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"بیگم بیگم۔ ہائیں ہائیں، خیر تو ہے، یہ کیا کر رہی ہو۔"

صنوبر اُچھل پڑی، سب خضوع وخشوع رخصت ہو گیا۔ غیر ارادی قوت کے ساتھ سر سجدے سے اُٹھ گیا، میاں کی آنکھ سے آنکھ مل گئی، دیکھتی کیا ہے کہ "میاں کی عینک غائب ہے، دونوں پتلیاں مرکز سے ہٹ کر گوشے میں آ گئی ہیں اور وہ بیوی کو اس شان سے دیکھ رہے ہیں کہ مُنہ دیوار کی طرف اور نگاہ بیوی کی طرف۔ صنوبر کو معلوم ہوا کہ کسی نے دل کو اس طرح پلٹ دیا جیسے توے پر روٹی الٹی جاتی ہے معاً کان میں آواز آئی:۔

لے دیکھ میاں کی ٹیڑھی نگاہ، اور اپنے مغالطہ سے آگاہ ہو جا۔"

☆☆☆

ظریف دہلوی

ولی کامل

''ڈاکٹر صاحب! دیکھئے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ بخار اس وقت بہت تیز معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ان کے دشمنوں کو سرسام تو نہیں ہو گیا۔''

ڈاکٹر:۔ آپ ایسی بولائی کیوں جاتی ہیں۔ کچھ ایسی زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ بخار بیشک ۱۰۴ درجے کا ہے مگر سرسام کا مطلق اندیشہ نہیں آپ بالکل نہ گھبرایئے۔

مریض:۔ سرسام! سرسام!!! ہاں ہاں سرسام، صمصام کے بھائی کا نام ہے۔ صمصام کو نہیں جانتے؟ لاحول ولاقوۃ! ارے میاں وہی صمصام الدین جو نہر میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ احتشام اور گلفام اُن کے بیٹے ہیں۔

بیوی:۔ ڈاکٹر صاحب! خدا کے لئے آپ کوئی ایسی دوائی دیجئے جو ان کا یہ بہکنا جائے آپ تو اب تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے پھر میں ہوں اور یہ پہاڑ سی رات، بس رات بھر یوں ہی بہکتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسے لال لال دیدے کر کے گھورتے ہیں کہ میرا دم فنا ہو جاتا ہے۔ اگر بُوا فہیمن اور نصیبن نہ ہوتیں تو جانے میرا کیا حال ہوتا!

مریض:۔ یہ کون بکواس کر رہا ہے؟ ڈاکٹر صاحب اس بیچاری کی باتوں کا خیال نہ کیجئے یہ پیدائشی دیوانی ہے۔ اچھا ایک بات بتایئے آپ حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ میں پاگل ہوں۔

ڈاکٹر:۔ ہرگز نہیں۔

مریض:۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یعنی آپ بتانا نہیں چاہتے۔

ڈاکٹر:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ہرگز پاگل نہیں ہیں آپ کا دماغ بالکل درست ہے۔

مریض:۔ اچھا جو کچھ میں کہوں گا آپ اُس پر یقین لائیں گے؟

ڈاکٹر:۔ کیوں نہیں۔

مریض:۔اچھا بتائیے میں کون ہوں؟

ڈاکٹر:۔آپ آدمی ہیں

مریض:۔آدمی تو آپ بھی ہیں اور یہ جو میری بیوی ہے بڑی اچھی لڑکی ہے۔آپ ہنستے ہیں۔کیوں ہنستے ہیں یہ لڑکی نہیں تو کیا ہے؟ آپ پھر ہنس رہے ہیں۔ارے میاں یہ تو سچ ہے کہ یہ چالیس برس کی ہے مگر ہے تو لڑکی،آپ ہنسے جارہے ہیں،سُنئے سُنئے ہنسی کو روکیے سُنئے،جب تک اِس کے ہاں کوئی بچہ نہ ہو یہ عورت نہیں کہلائی جاسکتی۔

ڈاکٹر:۔اب میں آپ کے سوال کا مفصل جواب دیتا ہوں۔سنئے آپ علی گڑھ کالج کے گریجویٹ ہیں،نہایت شریف خاندان کے ہیں۔آپ یہاں نہر میں ایگز یکٹو انجینئر ہیں۔آپ کو ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے،آپ کے پاس موٹر ہے آپ بہ نسبت ریل کے سفر کے موٹر کے سفر کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور اسی پر دُور دُور سفر کرتے ہیں آپ کی ڈاڑھی بہت لمبی اور گھن دار ہے اور ناف تک پہنچتی ہے اور جس وقت آپ ہیٹ لگا کر چلتے ہیں تو چہرے پر چھا جوں نور برستا ہے۔

مریض:۔آپ تو ہم سے اتنے واقف ہیں کہ ہماری بیوی بھی نہ ہوں گی۔اچھا جناب یہ تو آپ اقرار کرہی چکے ہیں کہ میں پاگل نہیں ہوں اور میرا دماغ صحیح و سالم ہے تو سنیئے آج چھ بجے شام کو میرا وصال ہے۔

ڈاکٹر:۔کیا کہا؟

مریض:۔میرے عزیز دوست! تو میرا ہم جماعت بھی ہے اور اب دو برس سے میری اور تیری نوکری بھی ایک ہی جگہ ہے۔تو میری عادت سے واقف ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ آج چھ بجے میں مر جاؤں گا۔

ڈاکٹر:۔ارے میاں ایسی جلدی کا ہے کی ہے،ذرا ٹھہر جاؤ،دو چار دن بعد ہی مر جانا۔

مریض:۔تم جانتے نہیں،رات کو میرے پاس حضرت جبرئیل آئے تھے۔وہ یہ خوشخبری لائے تھے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ بہت دنوں سے آپ کے وصال کے متمنی ہے اور اب اُس سے ہجر کے صدمے نہیں اُٹھائے جاتے اور سُو اُن کے جانے کے بعد میرا وصال ہوگیا۔راتوں رات میرے سارے مریدوں کو خبر ہوگئی صبح سویرے ہی میرے گھر میں ہزاروں مرید جمع

ہو گئے۔اب مشکل یہ ہوئی کہ کفن یہاں ملتا نہیں۔چھوٹی سی بستی ہے۔خیر نگر چودہ میل ہے۔تم تو جانتے ہی ہو وہاں تک کچی یا پکی سڑک تو ہے نہیں، فقط ٹرالی جاتی ہے خیر دو چار آدمی وہاں گئے اور کفن لے آئے اور درزی کو بھی ساتھ لیتے آئے۔خیر صاحب کفن سِلا اور ہمیں اُس میں لپیٹا۔مگر وہ ذرا چھوٹا رہا۔یعنی پاؤں ڈھکے تو سر کھلا رہ گیا اور سر ڈھکا تو پاؤں کھلے رہ گئے اب سب نے کہا کہ بھئی اب کیا کریں۔اب اگر ٹرالی پر گئے تو کل تک آئیں گے، اتنی دیر میں لاش سڑ جائے گی۔ایک آدمی نے کہا کہ ہمارے حضرت ولی اللہ تھے دُور دُور تک اُن کا شہرہ تھا۔ لاکھوں ان کے مرید ہیں اِن کا منہ کھلا رکھنا چاہیے تاکہ خلقت آپ کی زیارت سے مشرف ہو۔ سب کو یہ صلاح پسند آئی۔چنانچہ ہمارا منہ کھلا رہا اور ہم منہ کفن سے باہر نکالے چار کے کندھے پر سوار چلے۔اب ایک اور مصیبت آئی۔لاکھوں آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور جو آتا تھا ہماری ڈاڑھی کا ایک بال تبرک کے طور پر رکھ لیتا تھا۔ہم ولی تو تھے ہی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور خلقت کا یہ ہجوم دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔مگر ڈاڑھی کو لوگوں کے بے رحم ہاتھوں سے نہ بچا سکے۔نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں ہماری ڈاڑھی صفاچٹ ہوگئی۔جیسے کسی نے اُسترے سے مونڈ دی۔اب لوگوں نے کہا کہ بھئی ایسے ولی اللہ کا اللہ کے دربار میں بغیر داڑھی کے جانا مناسب نہیں ہے۔اب کیا کرنا چاہیے ہمارے جنازے کو ایک جوہڑ کے کنارے رکھ دیا اور سب بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔کسی نے کہا بھُٹے کے بال لگا دو۔کسی نے کہاں چوری (جس سے مکھیاں اُڑاتے ہیں) کی ڈنڈی انہیں لگا دو، مگر کسی بات پر فیصلہ نہ ہوا۔ آخر یہ قرار پایا کہ جنازے کو گھر واپس لے چلو اور اِن کی بیوی سے پوچھو وہی کچھ ترکیب بتائیں گی۔تو بھئی ہم پھر گھر میں گئے۔بیوی نے جو یہ ماجرا سُنا تو کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے تم ذرا ٹھیرو میں ابھی آئی۔اندر گئیں اور جھٹ ایک قینچی لے آئیں اور لپک کر اپنی چوٹی ہماری ٹھوڑی میں چپکا دی۔اب ہم پھر چلے۔اِدھر تو ہمیں قبر میں اُتار کر مٹی وٹی دے کر لوگ کھسکے اور اُدھر منکر نکیر آن موجود ہوئے ہمارا منہ کھلا ہوا تھا اور ڈاڑھی ہماری چھاتی پر پڑی ہوئی بل کھا رہی تھی۔آتے ہی اُن کی نظر ڈاڑھی پر پڑی، بڑے بھنائے کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے جس کی ایسی بلدار ڈاڑھی ہے اور سچی بات ہے کہ وہ ڈرے بھی۔دونوں تھر تھر کانپنے لگے ایک

دوسرے سے کہتا تھا کہ تو سوال کر اور پیچھے کھسکا جاتا تھا اب یہاں جو لگی دیر تو حضرت جبرئیل آئے اور ان سے کہا یہ تم دونوں کھڑے کیا کھسر پھسر کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ اللہ کے خاص الخاص بندے ہیں، اِن سے کچھ پوچھنے گچھنے کی ضرورت نہیں چنانچہ ہمیں بڑے ادب اور تعظیم کے ساتھ حق سبحانہٗ کے دربار میں لے گئے۔ وہاں ہم اللہ کے حکم سے کھڑے ہوگئے اور جناب باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے خاص الخاص بندے آ ہم تیرے لئے بہت دنوں سے بیقرار تھے۔

اتنا کہہ کر مریض بے ہوش ہوگیا۔ بیوی اتنی دیر میں کئی دفعہ بولنے کو ہوئیں مگر ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اب ڈاکٹر صاحب نے ایک دوا مریض کے حلق میں ڈالی اور اُن کی بیوی سے کہا کہ اب انہیں سونے دو۔ حیران نہ کرنا، صبح کو انشاءاللہ اچھے ہو جائیں گے۔

اِن باتوں کو مہینوں گذر گئے مگر اب تک ڈاکٹر صاحب انجینئر صاحب کو چھیڑا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کا وصال یاد ہے، اور دیکھنا تمہاری بیوی کے بال نکل آئے یا ابھی تک پر پیچ ہی ہیں۔

☆☆☆

سیّد رفیق حسین

حضّت وہ تو نکل گئے

میرا اور مسعود کا یہ خیال تھا کہ امتحان کے بعد ہم دونوں دو تین دن اور ٹھہریں گے اور اچھی طرح سے لکھنؤ کی سیر کریں گے۔ لیکن امتحان ختم ہونے سے پہلے ہی پیسے ختم ہو گئے۔ جس دن آخری پرچہ کر کے ہم ہوٹل میں واپس آئے تو واپسی کے ٹکٹوں کے علاوہ تین چار روپے اور باقی تھے۔ ناچار یہ قرار پایا کہ سامان درست کر کے سب تیار کر لیا جائے اور ایک تیز سواری پر بیٹھ کر یہاں کا امام باڑہ، گھنٹا گھر اور چوک کو ایک نگاہ دیکھ ہی آنا چاہئے۔ پھر آٹھ بجے رات کی گاڑی سے کوچ بول دیا جائے۔ جلدی جلدی سامان درست کر کے ہم دونوں امین آباد ہوٹل سے نیچے اترے۔ پارک کے نکڑ پر یکّوں اور تانگوں کا ہجوم تھا۔ اُدھر چلے۔ مسعود بر تھے کہ گھنٹوں کے حساب سے تانگہ ٹھیرا لو۔ میں نے ان کو مطلع کیا کہ وہ بے دال کے بودم ہیں۔ اس میں زیادہ خرچ ہو جائے گا۔ اس لئے فی الحال یکّہ پر ہی اکتفا کرنا چاہئے۔ اب یکّوں میں تلاش شروع ہوئی۔ مسعود صاحب نے ایک یکّہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں مضبوط اور تندرست جانور جتا ہوا تھا۔ میں نے ان سے انگریزی میں کہا کہ تم میں شئے لطیف کی کمی ہے۔ ورنہ تیز یکّہ نہ ڈھونڈھتے، اوّل تو یہ کرایہ زیادہ مانگے گا دوسرے آندھی پانی کی طرح گئے اور آندھی پانی کی طرح آئے۔ اس طرح کہیں سیر ہوتی ہے۔ آخر ایک یکّہ مطلب کا مجھے نظر ہی آ گیا، مٹیالہ چھوٹا سا ٹٹو۔ موٹڈی نیچے کیے تین ٹانگوں پر حالت مراقبے میں تھا۔ چھوٹے سے یکّے میں ٹھیٹ لکھنوی یکّے والے، پیچھے اس پر چار انچ کی دو پلی ٹوپی، چوڑی دار پائجامہ، انگرکھا پہنے، پیر سکیڑے گھٹنوں پر تھوڑی رکھے غین بیٹھے تھے۔ میں نے مسعود کی طرف غرور کے طور سے، ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھو وہ ہے یکّہ جس پر ہم چلیں گے۔"

مسعود بولے۔ "مالک اور گھوڑا دونوں افیونی۔" مجھے بہت بُرا معلوم ہوا۔ لیکن پھر بھی

میں نے تمکنت سے ان کو سمجھادیا۔ ’’میاں ابھی صاحبزادے ہو، ناسمجھ ہو۔ اینچی نہیں ہے۔ یادِ رفتگان میں غرق ہیں۔ اُجڑے ہوئے دربارِ اودھ کی نشانیاں ہیں۔ تم ان کی قدر و منزلت کیا جانو۔‘‘ یہ کہہ کر میں یکے کی طرف بڑھا اب سوچا کہ آواز دوں۔ جگاؤں تو کن لفظوں سے کہ تہذیب سے خالی نہ ہوں۔ محاورے کے خلاف نہ ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ ڈرتے ڈرتے سوتی ہوئی متبرک ٹھوڑی پر انگلی چھوائی تو یکے والے صاحب اس زور سے اچھل پڑے کہ میں بھی اچھل پڑا۔ یکہ بھی ہل گیا۔ ٹٹو کو بھی کچھ ہوش آ گیا۔ دُم کی چوری کو ایک دفعہ دائیں اور ایک دفعہ بائیں طرف ہلا کر پھر غوطہ میں پڑ گیا۔ یکے والے صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر لاحول اس پیاری قرأت سے ادا کی کہ اس میں چار عدد نون غنے شامل کر دیئے۔ میں نے داد دی۔ ’’سبحان اللہ آپ تو اچھے خاصے قاری ہیں۔ مگر اس وقت کی قرأت بے موقع ہے، میں تو انسان ہوں۔‘‘ بڑے میاں بہت بگڑے ’’وان ہ حضت وان ہ یہ بھیں کوئی انسانیت ہیں کہ اچھیں خاصیں بیٹھے بیٹھائیں مرد آدمی کو چوکاں دیا اور پھر اب فرماتے ہیں کہ لاحول نہ پڑھیں۔ ہم تو دو روپیوں کا آسراں لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ بڑے آئیں آکے چوکاں دیاں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ارے بھائی اسی واسطے تو چونکا دیا کہ کچھ مزدوری بھی کرو گے کہ سوتے ہی رہو گے۔ اچھا بتاؤ کتنے گھنٹہ ہوگا۔‘‘ بڑے میاں نے سنبھل کر فرمایا۔ ’’میاں گھنٹے کاں حساب تو فیشن والے تانگوں سے کیجئے۔ آپ کو چلنا کہاں ہے یہ تو فرمائیں۔‘‘ میں نے بتایا کہ ’’ہم لوگ پردیسی ہیں۔ شہر کی سیر کرنا چاہتے ہیں، چوک سے ہوتے ہوئے حسین آباد اور آصف الدولہ کا امام باڑہ دیکھتے ہوئے واپس آجائیں گے۔‘‘ معلوم ہوا کہ چار کوس کا چکر ہے۔ لیکن پردیسی ہونے کی وجہ سے ایک ہی روپیہ لے لیا جائے گا۔ میں خوش ہو گیا۔ لیکن مسعود کا منہ کلکتہ سلیپر کی طرح کھنچا ہی رہا۔ خیر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے یکے والے صاحب کا نام پوچھا معلوم ہوا کہ ’’عبن صاحب‘‘ میں نے کہا تو پھر اب چلئے۔ جواب ملا۔ ’’جیں تو چلتاں ہوں، آپ لوگ تیارر ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ بسم اللہ۔ عبن صاحب نے پینترا بدل کر فٹ بھر کی لکڑی میں بالش بھر کا بندھا ہوا تاگا گھوڑی کے کولھوں پر چٹ سے لگایا۔ ’’ٹخ ٹخ چل ل چل ل۔‘‘ کا حکم گھوڑی کو دیا۔ اس نے چھ دفعہ سر کو اوپر نیچے کیا جیسے کوئی بڑھیا او

کھلی میں موسل چلاتی ہو اور بس ۔ میں نے کہا جانور تو چلتا ہی نہیں ۔ فرمایا'' چلتیں ہی چلتیں چلے گا ۔ منہ کا نوا اتلا تو نہیں ہے ۔''

جب آخر گھوڑی چل ہی پڑی تو میں نے پھر نبن صاحب سے گفتگو شروع کی ۔ سب ہی طرح انھیں چھیڑا ۔ مگر اللہ کے بندے نے ہاں اور نہیں کے دو جوابوں میں ٹال دیا ۔ کچھ باتیں نہ کیں ، خاموش ہی رہے ۔ چلتے چلتے ایک اُجڑے سے بازار میں جا رہے تھے کہ نبن صاحب بولے ۔

(اب نبن صاحب کی گفتگو بغیر نون غنوں کے لکھی جائے گی تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو ۔ ہاں شائقین اگر چاہیں تو خود متواتر غنے نون ملاتے جائیں)

نبن صاحب .... ''میاں صاحب زادے اب دیکھیے میں تو آپ کو لئے ہی چلتا ہوں مزدوری تو میری ہو ہی جائے گی ۔ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو مجھے چار آنے دے دیں'' ۔

مسعود .... ''واہ جی واہ ابھی سے اور بڈ ہن کرو گے کیا'' ۔

نبن صاحب .... حضور ذری کے ذری آپ یہیں توقف کریں ۔ بندہ دو چھینٹے لگا کر ابھی آتا ہے ۔ طبیعت ست ہو رہی ہے ۔ چونچالی آ جائے گی ۔ پھر دیکھئے حضور کو کیسی سیر کراتا ہوں ۔

مسعود تو نہیں نہیں کرتے ہی رہے ۔ مگر مجھے ترس آیا پیسے میری ہی جیب میں تھے ، نکال کر دے دئے ۔ بڑے میاں بولے ۔ ''واللہ شرافت اِسے کہتے ہیں ۔ اے میاں سلامت رہیے ۔'' یہ کہہ یکّے کو ایک گلی کے پاس چھوڑ چل دئے ۔ آدھ گھنٹہ ہم دونوں نے انتظار کیا ۔ اس کے بعد آپ آئے اور اب جو آئے تو نہایت شگفتہ ۔ خوب باتیں کرنا شروع کر دیں ۔

نبن صاحب .... ''میاں کیا پوچھتیں ہیں لکھنوٴ کو ۔ اب کیا ۔ اجڑ گیا ۔ نہ وہ زمانہ ہے ۔ نہ وہ باتیں ہیں ۔ اسی قیصر باغ میں کیا کیا جشن ہوتے تھے ۔ کیسے مہوشوں کے مجمعے رہتے تھے ۔ کیا کیا محفلیں ہوتی تھیں ۔ اب کیا ہے ان آنکھوں سے وہ زمانہ بھی دیکھا اور میاں یہ بھی دیکھ رہے ہیں'' ۔

مسعود ...... ''بڑے میاں آپ بھی نوابوں میں سے ہیں'' ۔

نبن صاحب ...... ''اجی سرکار کوئی نوابوں ہی پر تھوڑے موقوف ہے ۔ ہم نے سب کچھ

دیکھ ڈالا۔ ہمارے نوابوں سے بڑھ کر وقت ہو گئے اور گذر گئے جدھر سے ہم نکل جاتے تھے لوگوں کی نظریں اٹھتی تھیں۔اب کیا رہا ہے۔سانسوں کا شمار ہے۔زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔سب چل دیئے ہم رہ گئے۔نواب مسعود قدر اور پھلکی، قدر ہمارے لنگوٹیا یار تھے۔آج چھ سات برس کا عرصہ ہوا وہ بھی چل دیئے۔

مسعود......''ارے واہ رے بڈھے میں تو زندہ بیٹھا ہوں مجھے مارے ڈالتا ہے''۔

میں......''چپ رہو جی بدتمیزی مت کرو۔جی ننّن صاحب تو آپ کا وقت بگڑ گیا، پہلے آپ رئیس ہوں گے؟''

ننّن صاحب......اے صاحب رئیس کیا چیز ہیں، دولت ہماری غلام تھی غلام۔ہم روپے پیسے کی فکر نہ کرتے تھے، جوانی کی امنگیں تھیں۔اس وقت کا خیال نہ تھا۔خدا طرح طرح سے دیتا تھا اور ہم لٹاتے تھے۔ایک ہی جلسے میں رات بھر میں سو اشرفیاں اللہ رکھی پر سے نچھاور کر دیں۔عیش باغ میں ساون کا میلا۔ہائے ہائے نہ پوچھیے ہم دولھا بنے پھرتے تھے۔لوگ اس کے متمنی ہوتے تھے کہ ہم ان سے بات کریں۔

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

پھر اللہ نے دیا اور پھر مٹا دیا اور پھر دیا اور پھر مٹا دیا۔اے صاحب ایک دفعہ آخری موقعہ پھر ہاتھ آیا۔مگر نصیبوں کی خرابی سے کچھ نہ رہا۔لیکن میاں اب کی دفعہ میرا قصور نہ تھا۔جو کچھ کیا اغن صاحب نے کیا۔مٹا دیا اغن صاحب نے۔اب وہ بھی روتے ہیں اور ہم بھی ہاتھ ملتے ہیں۔میاں صاحبزادے مقدر کی خرابی اسے کہتے ہیں۔ذری سی چوک میں آدمی مارا جاتا ہے۔کیا جو کچھ تو اغن صاحب نے ہی کیا (ماتھے پر ہاتھ مار کر) افسوس کاش مجھے معلوم ہوتا، میں کیا جانتا تھا۔مگر صاحب چوک مجھ سے بھی ہو گئی''۔

مسعود............''ارے بھائی کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا ہوا تھا''۔

ننّن صاحب............جی بتاتا ہوں ....لیکن ....وہ ....میاں ایک چونی اور دید یجیئے میری آدھی مزدوری تو دیکھئے اللہ آپ کا بھلا کرے

ہو ہی گئی ہے اور تکلیف نہ ہو تو ذری دیر بیٹھے رہیے میں ابھی ابھی آیا۔

یہ کہہ چونی اور لے بڑے میاں پھر یکّے سے اُتر کر ایک گلی میں چلے گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد پھر تشریف لائے۔ گھوڑی کو بمشکل تمام جب رفتن مصدر کے گیئر میں ڈال دیا تو پھر ہم دونوں نے اصرار کیا کہ ہاں صاحب وہ اغن صاحب نے کیا ستم ڈھایا تھا ہم کو بھی تو معلوم ہو۔

غبن صاحب.........."اے حضت نہ پوچھیے ستم ہی ڈھایا تھا کہیں کا بھی نہ رکھا ورنہ آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ صاحب قصہ یہ ہے کہ خدا مغفرت کرے اُستاد فدن صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، اور میں بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتا تھا۔ خدا غریق رحمت کرے بڑے خوبیوں کے آدمی تھے۔ مگر ذرا سنکی تھے، جس بات کی دھن ہو گئی تو ہو گئی۔ ایک دفعہ جو مچھلی کے شکار کی دھن لگی تو اب طرح طرح کی ڈوریں بندھ گئیں۔ بیسیوں چارے اور جلاب ڈھونڈ ڈھونڈ کر تیار کر لیے۔ انگل انگل بھر کی مچھلیوں سے لے کر دو دو گز کی مچھلیاں پکڑ ڈالیں۔ کیمیا کا شوق ہوا تو سینکڑوں طرح کی جڑی بوٹیاں ڈھونڈ لائے۔ غرض یہ کہ یہی رہتا تھا۔ کبھی رمالی ہے کبھی جادو۔ کبھی عملیات ہیں۔ انھیں باتوں کی وجہ سے ہم لوگ انہیں اُستاد کہتے تھے۔ یک و تنہا رہتے تھے۔ یہیں آپ کے حسین آباد میں دو کوٹھڑیاں ایک دالان تھا۔ اس میں پڑے رہتے تھے۔ عجیب صفتوں کے آدمی تھے سرکار۔ ایک دن دوپہر کو برسات کا زمانہ تھا۔ میں ٹہلتا ہوا ان کے پاس چلا گیا خاموش بیٹھے تھے۔ میں بھی جا کر پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کہا کہیے فدن صاحب آج کل کیا سنک ہے، ذرا تنک مزاج بھی تھے بگڑ کر بولے۔ سنک ہے تم سنک ہی سمجھتے ہو؟ سنو تم نے کبھی کشف نفس کا عمل بھی سنا ہے کبھی عمل تقلید خیال بھی سنا ہے۔ عمل پرواز بھی سنا ہے؟ میں نے کہا نہیں حضت میں نے تو ان میں سے کسی کا نام بھی نہیں سنا۔ بولے پھر کیا بک رہے ہو۔ میں نے کہا قبلہ کچھ تو بتایئے کہ یہ کیا ہوتے ہیں۔ ایک قلمی نسخہ پاس رکھا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ یہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ دو لفظوں میں تم کو بتا دوں۔ میاں دن چاہئیں دن۔ ہفتوں لگ جائیں گے میں نے کہا اچھا یہ بتایئے کہ ان عملیات سے کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں۔ بولے فائدے بڑے عجیب عجیب ہیں۔ مثلاً ایک فائدہ یہی ہے کہ انسان اس عمل سے اُڑ سکتا ہے۔ تمام خیالات فاسق کو علیحدہ کر کے دل اور دماغ کو رجوع کرنے سے اول تو انسان کا رفتہ رفتہ

وزن کم ہوتا ہے اور پھر جس میں جیسی مقدرت اور قدرت ہو کافی مشق کے بعد اُڑنے بھی لگتا ہے، وزن تو میں اپنا زائل کر لیتا ہوں۔ ہاں اُڑنے میں ابھی دیر ہے۔ صبح کو ایک انگل کے قریب زمین سے اونچا ہوا تھا۔ میاں آپ یقین کیجئے کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ استاد فدن صاحب کو میرا ہنسنا بہت ناگوار ہوا کہنے لگے اچھا لے دیکھ، یہ کہہ میرے سامنے بالکل سیدھے ساکت کھڑے ہو گئے۔ کوئی دس منٹ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تو خود بخود زمین سے اونچے ہونے لگے۔ میں نے جلدی سے چھت کو دیکھا مگر وہاں رسی نہ کچھ اور، کوئی ایک بالشت اٹھ گئے ہوں گے کہ دھم سے پھر نیچے آ گئے، مجھے سخت حیرت، بڑا پریشان۔ میں نے کہا۔ اُستاد یہ نہیں۔ اب کی پھر اٹھو تو جانیں، اُستاد تاؤ میں پھر سیدھے ساکت کھڑے ہو گئے۔ دس منٹ کے بعد میاں یقین جانئے ان کے پیر تو زمین سے اونچے ہونے لگے۔ قریب ڈیڑھ بالشت کے اونچے ہو کر کوئی ایک سکنڈ وہیں رکے ہوئے اور پھر دھم سے آئے۔ لیجئے میاں چوک تو آ گیا۔ گول دروازہ یہی ہے۔ اس کے اندر چوک ہے۔ آپ لوگ جا کر سیر کر آئیں اور میاں اللہ سلامت رکھے ایک چونی اور دید یجئے تو میں دو چھینٹے لگا لوں۔

نبن صاحب چھینٹے لگانے چل دیے اور ہم دونوں اس گندے تنگ بازار میں پچاس ساٹھ قدم جا کر واپس آ گئے اور پھر یکے میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد جو نبن آئے تو مسعود نے کہا بس اب واپس۔ آپ ہم کو امین آباد ہی پہنچا دیں۔ سیر تو ہو چکی چھ بج رہے ہیں آٹھ بجے کی گاڑی سے ہم کو جانا ہے۔ چنانچہ یکہ پھر واپس ہو لیا اور نبن صاحب نے داستان شروع کر دیں۔

نبن صاحب .... ''جی۔ جی۔ حضور دیکھیں بندے کو کس قدر حیرت اور پریشانی ہوئی ہو گی واللہ میں تو سکتے کی سی حالت میں رہ گیا۔ آنکھیں ملیں۔ لاحول پڑھی۔ اپنے ہاتھ میں چٹکی لے کر دیکھی کہ کہیں سو تو نہیں رہا ہوں۔ دماغ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا اُستاد ذرا تسلی کرو۔ میں اپنے ہوش حواس درست کر لوں۔ ذرا نگالی نکالو چراغ جلاؤ۔ اُستاد فدن صاحب اُٹھے۔ سامان درست کیا دو ایک دم لگا کر میں نے ان سے بھی اصرار کیا کہ بھائی صاحب آپ بھی دم لگا لیں۔ خدا مغفرت کرے اُستاد بڑے خوبیوں کے آدمی تھے۔ دوستوں یاروں کی خاطر سامان دلچسپی رکھتے تھے۔ خود زیادہ شوق نہ تھا دوستوں کے اصرار پر ان کی دل شکنی بھی نہ

کرتے تھے شریک ہو جاتے تھے، جب زمانہ بھی اور تھا ہر چیز سستی تھی۔ خدا کی مار اس زمانے پر۔ سرکار دو ہی چھینٹے لیتے ہیں اور چوٹی کٹھیا سی نکل جاتی ہے۔ بندہ پرور ایک وہ وقت تھے۔ ڈبل کے چار چسکے اور چائے کی پیالی گھاتے ہیں۔ اے قبلہ یہیں گول دروازے میں ننھی بلاقن کی دکان پر ملتے تھے۔

مسعود............ ''(جھلاکر) جہنم میں گئی ننھی بلاقن۔ تمہارے اُستاد کا کیا حشر ہوا''۔

ننن صاحب............ اے ہاں میاں دیکھئے بات میں بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ تو قبلہ جب نشے پانی سے چونچال ہو لئے تو ہم نے پھر کہا اچھا اُستاد اب سہی۔ اُستاد کو بھی مزا آنے لگا تھا۔ میں تو بھئی بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہوں۔ مشق پر موقوف ہے۔ دماغ کا کام ہے۔ جس قدر دھیان ادھر ہوا تنا ہی اچھا نتیجہ نکلتا ہے سب دماغی طاقت کا کام ہے انسان کے ارادہ پر منحصر ہے۔ لو دیکھو اب کی دو فٹ تک اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُستاد فدن صاحب پھر جو سیدھے تانت سے کھڑے ہوئے تو اب کی تو ایک ہی منٹ کے بعد اُٹھنے لگے اور اٹھتے اٹھتے چھت میں جا لگے۔ سر دھنی میں چھو گیا۔ سرکار اس زمانے کے مکانوں کی چھتیں بھی یونہی سی اونچی ہوتی تھیں۔ ایک منٹ تک فدن صاحب کا سر دھنیوں کے جالوں میں گھسا رہا۔ اس کے بعد ایک دفعہ دھم سے گر ہی تو پڑے۔ اب کی سنبھل نہ سکے۔ کہنیوں کے بل گرے میں نے لپک کر اٹھایا۔ سر کا جالا چھڑایا۔ کہا بھائی دم لے لو اطمینان سے کام کرو۔ واللہ یہ تو بڑی بات ہاتھ آگئی ہے۔ دیکھو خدا کو کیا منظور ہے۔ میں یہی کہہ رہا تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ چوں سے بولا دیکھتا کیا ہوں کہ اغن صاحب سر ڈالے ہیں۔ بولے ''استاد کیا ہو رہا ہے'' میں آؤں۔'' اتنا کہا اور ہنستے ہوئے آگئے۔ اب کیا کر سکتے تھا۔ دراصل مجھ سے ہی غلطی ہوگئی۔ مجھے پہلے ہی سے کنڈی لگا لینی چاہئے تھی۔ میں نے اغن صاحب سے کہا۔ اچھا اب کنڈی لگائے آؤ۔ حضرت کو جب سب حال معلوم ہوا بولے ''تو بھائی باندھو سوپ اُستاد کے شانوں پر ہم بھی دیکھیں کیسے اُڑتے ہیں۔'' میں نے کہا'' پھر وہی سفلوں کی سی باتیں شروع کیں واللہ اچھا نہ ہوگا۔ یہ موقعہ دل لگی کا ہے۔ صبر سے بیٹھو اُستاد دم لے لیں۔ اغن صاحب بولے۔ دم تو یار و میں بھی لگاؤں گا۔ تم لوگ تو رچے ہوئے ہو کوٹھری مہک رہی ہے خیر میاں دو دو چھینٹے لے لئے

ہائے واللہ اُستاد کا بھی کیا دم تھا۔ پھر اصرار کرنے سے شریک ہو گئے۔ تو میاں اُستاد پھر کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا۔ ٹھہرو تسلی کرلو۔ جلدی سے ان کے پیروں کے نیچے ان کا لحاف تو شک لا کر بچھا دیا اور کہا لیجئے اُستاد اب غم نہیں چاہے سر کے بل بھی غوطے کیوں نہ ماریئے۔ اُستاد کو بھی اطمینان ہو گیا۔ پھر چھت میں سر لگا کر تین چار منٹ معلق رہے اور آ گرے۔ میں نے کہا اُستاد ،اُستادی تو جب ہے کہ آہستہ آہستہ نیچے آیئے یہ بھی کیا کہ ڈھیلے کی طرح بھد سے نیچے آ گرے ۔اے جب دماغی قوت اور ارادے ہی پر موقوف ہے تو لگاؤ کدو کا زور، اُستاد نے کہا اچھا۔ پھر کھڑے ہو گئے۔ اب کی گرے تو نہیں۔ مگر ایسے بھی نیچے نہیں ہوئے جیسے کسی کی شرمائی ہوئی نظریں۔ کٹی کنکیا کی طرح اتاتے پتاتے نیچے آ گئے۔ میں نے کہا۔ "خیر بسم اللہ بری نہیں ہے۔ پھر کوشش کرو یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔ حضور تین چار دفعہ کے بعد اب تو بالکل سہولت سے اُترنے لگے۔ اغن صاحب اور میں دونوں دم دلاسہ دیتے رہے لیکن صاحب اغن کی وہی نادانی کی باتیں۔ اب سر ہیں اُستاد کے۔ میں نے کہا۔ "نہیں اب زیادہ پریشان نہ کرو۔ تھک گئے ہوں گے آرام کرنے دو۔ چلو اب چلیں" میاں میں ان کو اپنے ہی ساتھ گھسیٹ لایا۔ راستے میں لگے اغن صاحب زمین آسمان ملانے کبھی کہیں "اُستاد کو کلکتہ لے چلیں گے۔" کبھی کہیں "ٹکٹ لگائیں گے بڑے لاٹ کو تماشہ دکھائیں گے۔" میں نے کہا "ابھی رسانیت سے کام لو رسانیت سے۔ روپیہ کمانے کے تو اب لاکھوں طریقے ہیں۔ روپیہ تو اب بہا بہا پھرے گا لیکن پہلے اُستاد کی مشق پوری ہو جانے دو۔ ابھی تو کھڑے ہی اٹھتے ہیں۔ لیٹ کر اٹھنا آ جانا چاہئے اور سہولت سے اترنا چاہئے۔ بلکہ اور بھی اچھا یہ ہو کہ پینگ لیتے ہوئے نیچے آئیں اور پھر اٹھتے چلے جائیں ایک ہاتھ پھیلا ہوا اور دوسرا سینے پر یہ معلوم ہو کہ خود تو سو رہے ہیں اور کوئی پینگ دے رہا ہے۔ لیکن دیکھو یار اغن یہ سب خاک میں مل جائے گا۔ جو ابھی کسی کو بھی اس کی رتی بھر بھی خبر ہو گئی۔ ابھی تو یہ سب راز ہی رہنا چاہئے اور بھائی آمدنی میں بھی اُستاد کا حصہ اوّل رکھنا ہو گا۔ دیکھو تم جلدی نہ کرو۔ سہولت سے کام لو! میں اُستاد کو راضی کرلوں گا۔ روپے میں چھ آنے ان کے اور پانچ پانچ آنے ہم دونوں کے" اغن صاحب کی عقل میں بات ذرا دیر میں آتی ہے۔ مگر میاں میرے سمجھانے سے وہ سمجھ گئے۔ دوسرے دن اُستاد کو میں نے سب اونچ نیچ

سمجھائی۔ ہائے کیا معقول آدمی تھے۔ میاں میری سب باتوں پر راضی ہوگئے۔ اب ہم دونوں نے پھر انہیں مشق کرانی شروع کرادی۔ اے حضت شام تک اُستاد لیٹ کر بھی اٹھنے لگے اور نہایت سہولت سے جیسے وہ لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ زمین سے چھت تک جاتے تھے۔ ویسے ہی آہستہ آہستہ پھر نیچے آجاتے تھے۔ شام تک چھت میں جالوں کا نام نہ رہا جب اندھیرا ہوگیا تو میں نے کہا لو دن بھر ہوگیا ہے۔ آؤ ٹہل آؤ! بھائی تمہاری صحت بھی تو مقدم ہے۔ میوہ والی گلی تک ہو آئیں۔ میاں یہ سرا بھی ایک خاص اڈا تھا۔ ہاہا! سب مٹ گیا۔ ہاں میاں ہم تینوں چلے۔ مگر میں نے دیکھا کہ اُستاد کی چال میں کچھ فرق ہے۔ کچھ ایسے چل رہے تھے جیسے ....اجی یہ بچوں کے کھیلنے کے..........ربڑ کے پھکنے ہوتے ہیں نا۔ ان میں ہوا بھر کر اگر لڑھکایا جائے تو وہ اچھلتا اچھلتا لڑھکتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے اُستاد چل رہے تھے۔ میں نے کہا واہ اُستاد کیا بات ہے، اب جو صورت دیکھتا ہوں تو پریشان، میں نے کہا کچھ بتاؤ تو بولے نہ معلوم کیا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں روئی کا گالا ہوگیا ہوں۔ میں نے ان کا ہاتھ ٹٹولا۔ اماں جاؤ بھی نہ کہیں۔ اُستاد بولے۔ یہ مطلب نہیں ہے مجھے پکڑ کر اُٹھاؤ تو۔ اغن نے دونوں ہاتھ ان کی کمر پر رکھ جو ذری یونہی سا زور لگایا تو کندھوں سے اونچا اُٹھالیا۔ ہیں یہ کیا میں تو دیکھوں۔ حضت اُن کا تو وزن ہی غائب تھا۔ اُستاد بولے میں سمجھتا ہوں اگر اچکوں تو حسین آباد کا امام باڑہ اچک جاؤں۔ میں نے کہا خدا کا واسطہ یہ نہ کرنا۔ اوّل تو گناہِ عظیم اور پھر تمام راز افشا ہوجائے گا۔ میں جادوگر کیسے بنوں گا۔ خیر میاں چوک قریب آگیا تھا آتے جاتے لوگوں کی نگاہیں پڑتیں۔ اس لئے ایک طرف سے میں دوسری طرف سے اغن صاحب ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، ان کو دبائے ہوئے لے کر چلے۔ وہاں پہونچ کر دو ایک چھینٹے اُستاد کو بھی لگوادئے اور اسی طرح ان کو واپس لائے۔ اب میں نے ہزار اغن کو منع کیا مگر نہ مانے اُستاد کو پھر کچھ دیر مشق کرائی۔ اب اُستاد لیٹتے ہی اونچے ہوں۔ چھت کے ایک کونے سے پینگ لیتے ہوئے زمین تک آئیں اور ویسے ہی اُٹھتے ہوئے دوسرے کونے میں چلے جائیں۔ خیر میاں اُستاد کو لٹا کر ہم لوگ چلے آئے۔ صبح کو مجھے جانے میں دیر ہوگئی۔ چھمی کے ہاتھ میں دنبل نکلا ہوا تھا اُس میں نشتر لگوانے انہیں شاہ مینا کے اسپتال لے گیا۔ جب یہاں سے فارغ

ہوکر اُستاد کے مکان پر پہنچا تو اغن صاحب دروازے پر کھڑے۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ کہا غضب ہو گیا۔ میں نے کہا۔ اماں کچھ تو کہو۔ بولے کچھ نہ پوچھو۔ اے بھائی بتاؤ تو سہی اماں اُستاد کیسے ہیں۔ یہاں یقین مانئے کہ اغن کے آنسو نکل پڑے بولے اندر چل کر دیکھ لو۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ اندر گیا اُستاد اچھے خاصے چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے، ہاں صورت متفکر تھی اور ان کی گود میں سل رکھی تھی۔ میاں میں اغن کی طرح تو ہوں نہیں میں جا کر اطمینان سے ان کے پاس مونڈھے پر بیٹھ گیا اور پوچھا کہئے اُستاد کیا حال ہے۔ اُستاد کچھ دیر تو بولے نہیں، پھر کہا بات یہ ہے کہ ارادے کی قوت ضرورت سے زیادہ صرف کر دی ۔میرا وزن گھٹتے گھٹتے بالکل ہی غائب ہو کر نفی کی طرف رجوع ہے۔ رات پھر پلنگ پر پیٹھ نہیں لگی وہ تو کہو لحاف میرا بھاری ہے۔ ساری رات اسی سے چپکا رہا۔ صبح رفع حاجت کے واسطے اٹھا تو چھت میں جا لگا۔ جب یہ آئے اور انھوں نے پیر پکڑ کر کھینچے تو نیچے آیا۔ بچارے نے پیشاب پیخانہ کرایا۔ منہ دھلایا۔ اب اس سل سے دبا بیٹھا ہوں۔ حضور یہ سب سن کر فکر تو مجھے بھی ہوگئی۔ مگر میں اپنے کو تھامے رہا۔ کچھ غور و فکر کے بعد میں نے اغن کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیوں میاں ہونہ صاحبزادے تم اُستاد کو ہولا ہولا کر مار ہی ڈالتے۔ اللہ نے خیر کر لی جو میں جلدی آ گیا۔ میں نے اُستاد کو دلاسا دیا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ حضور میں ان کے جوتے لے کر چوک گیا۔ ایک موچی کو دونی تھمائی اور موٹے موٹے سیسے کے سول چڑھوا کر لے آیا۔ جوتے اُستاد کو دیئے۔ کہا لو پہنو۔ چلو پھرو۔ پریشانی کی کیا بات ہے.......... ہاں اب الٹی مشق کرنا پڑے گی۔ اُستاد جوتے پہن کر خوش تو ہو گئے لیکن ان کے دل پر جیسے وحشت سی چھا گئی۔ دماغ کا کام تھا۔ ارادے کی قوت لگانا تھی۔ وہاں ان کی طبیعت اچاٹ۔ کمر میں رسی بندھی ہے۔ چھت میں چپٹے ہیں۔ ہم دونوں ان کو نیچے سے ڈھارس دے رہے ہیں۔ ہاں بھائی فدن صاحب لگاؤ اپنے ارادے کا زور اور اترو نیچے۔ وہ ایک دو انچ نیچے آتے ہیں اور پھر چھت میں جا چپکتے ہیں۔ آخر میں نے اغن کو اشارہ کیا کہ تم چپ رہو۔ اُستاد کو ڈوری پکڑ کر نیچے گھسیٹا کہا بیٹھو جوتے پہن لو۔ دو ایک چھینٹے لے لو۔ گھبراتے کیوں ہو۔ کون سا غضب ہو گیا۔ اماں پہلے اوپر کو زور لگاتے تھے اب نیچے کو لگانا ہے بات تو وہی ہے۔ قوت ارادہ ہاتھ سے نہ

جانے دو۔ اُستاد نے کہا مجھے نیند آرہی ہے۔ سوؤں گا۔ میں نے کہا کیا حرج ہے۔ ان کے پلنگ کے نیچے بستر کو تکیوں سے تان دیا اور اُستاد کو لٹا دیا۔ اُستاد اس کے نیچے چھپ گئے اب میں نے پھر اغن صاحب کو سمجھایا کہ دیکھو بھئی اُستاد پریشان ہیں۔ ان کا دل بہلاؤ۔ تفریح کراؤ۔ جلدی نہ کرو۔ اب اُلٹی مشق کروانا ہے۔ ان کا دل و دماغ حاضر ہونے دو۔ سہ پہر کو اُستاد کو جگایا منہ ہاتھ دھلائے۔ چار چھ چھینٹے ہم دونوں نے لگائے۔ اُستاد کو بھی دو تین چھینٹے لگوا دیے۔ پھر ان کو لے کر گول دروازے ہوتے ہوئے میوے والی سرائے گئے۔ پرانے دوست احباب کا مجمع تھا۔ بات چیت میں دل بہلا اُستاد گو عادی نہ تھے۔ یہاں افیون نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی تھی۔ خوب گولیاں اُڑائیں شرابور ہو گئے۔ ان کا غم غلط ہوتا دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی اب ہم تینوں پھر چلے اندھیرا ہو گیا تھا۔ دوسری تاریخ کا چاند تھا (ہلکی ہلکی چاندنی تھی) یہ ٹھیری کہ گومتی کے کنارے سیر کی جائے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی اُستاد کی طبیعت تو سنکی ہی تھی سنک آ گئی کہ میں تو سوؤں گا نشے کے ایسے زیادہ عادی بھی نہ تھے ان کا کہنا بھی بیجا نہ تھا۔ مگر وہاں ہم ان کو کہاں سلاتے۔ ہزار سمجھایا گیا۔ مگر نہ مانے وہاں شاہی کے پرانے گرے پڑے خالی مکان تھے، اُستاد ایک کو دیکھ کر بولے میں تو یہیں سوؤں گا۔ نہ مانے۔ خیر میں نے جیب سے رسّی نکالی اُستاد کی کمر میں باندھی جوتے اُتارے، ان کو ڈیڑھ دو گز اونچا کر کے رسی اغن صاحب کو دی کہ پیر کے نیچے دبالیں۔ ہم دونوں اکڑوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں اُستاد سو گئے۔ میں نے اغن سے کہا دیکھو اُستاد کی ضد ہے۔ خیر یونہی سہی لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ نہ سونے دیں گے۔ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح شامیانہ ہونا چاہیے، کرسیاں بنچیں کیسی ہوں۔ ٹکٹ درجہ اوّل دس ہزار روپے کا ہو کہ زیادہ کا اور ادھر اغن صاحب خود پینگ میں آ کر مجھ پر لڑھک کر گر پڑے، میں بھی چونک پڑا۔ بولے اے ہے رسّی چھوٹ گئی۔ میں نے کہا واللہ تم بھی عجیب انسان ہو۔ فدن صاحب اگر جاگ پڑے اور برسوں کی پرانی چھت اور جالوں میں اپنے کو چمٹا ہوا پایا بہت بگڑیں گے۔ یہ کیا کیا، میاں امین آباد آ گیا۔

ہم دونوں چونک پڑے واقعی امین آباد آ گیا تھا۔ ہوٹل سامنے تھا مسعود نے گھڑی جو دیکھی بوکھلا گئے۔ "یار پونے آٹھ ہو گئے۔ بڑے میاں یہاں سے اسٹیشن کا راستہ کتنی دیر کا ہے"

''اے حضور دس منٹ کا راستہ ہے بات کرتے میں تو اسٹیشن آتا ہے''

مسعود......۔ اچھا تو ہم کو اسٹیشن تک اور چھوڑ دو۔ وہ سامنے ہوٹل میں سامان ہے ہم ابھی رکھے لیتے ہیں۔'' ''اے حضور مجھے کب انکار ہے میں خدمت کے واسطے حاضر ہوں۔ پر میاں برا نہ مانیے گا۔ یہاں تک کی مزدوری میں وہ چونی اور باقی ہے وہ بھی دیدیجئے۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے۔ آپ اسباب رکھیں اور میں ابھی آیا۔ مسعود صاحب بولے، ''دے دو بھائی'' دو سوٹ کیس دو بستر رکھنے کے بعد چھ چھ انچ جگہ ہم دونوں کو بھی مل گئی۔ اسی پر بیٹھ کر آدھ گھنٹہ انتظار کیا۔ اب پھر چلدیئے تھوڑی دیر صبر کے بعد مسعود نے کہا۔ ''ہاں بڑے میاں صاحب پھر کیا ہوا؟ بڑے میاں پھر خاموشی کے ساتھ بولے ''پھر کیا ہوتا''

مسعود............ ''آخر''

بڈھا............ بس اب اپنے نصیبوں کو روتے ہیں۔

مسعود............ ارے ظالم تو ہوا کیا۔

بڈھا............ (بڑی لمبی سانس لے کر) ہوتا کیا اس کوٹھڑی میں چھت ہی نہ تھی اندھیرے میں لٹکی ہوئی رسی ٹٹولی، نہ ملی تو دیا سلائی جلائی اُستاد فدن صاحب کہاں۔ ''اے حضت وہ تو نکل گئے۔''

گیارہ بجے رات کو تیسرے درجہ کے مسافر خانہ میں سوٹ کیسوں پر بستر رکھے دونوں اپنے اپنے اڈوں پر چڑھے ہوئے صبح کے انتظار میں بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے مسعود سے کہا۔ ''یار اب تو صبح اسی طرح کرنی ہے۔ پھر سوچ کس بات کا ہے۔'' مسعود پہلے تو خاموش رہے پھر میری طرف غور سے دیکھ کر بولے۔ کیوں جی اُستاد اب بھی چلے جا رہے ہوں گے؟ نہ معلوم کہاں تک چلے گئے ہوں گے۔

☆☆☆

مرزا عظیم بیگ چغتائی

یکّہ

''دس بجے ہیں۔'' لیڈی ہمت قدر نے اپنی موٹی سی نازک کلائی پر نظر ڈالتے ہوئے جماہی لی۔ نواب ہمت قدر نے اپنی خطرناک مونچھوں سے دانت چمکا کر کہا۔ ''گیارہ' ساڑھے گیارہ بجے تو ہم ضرور پھو...... ہونچ...... بغ......''

موٹر کو ایک جھٹکا لگا اور تیوری پر بل ڈال کر نواب صاحب نے ایک چھوکرے کے ساتھ موٹر کا پہیہ گڑھے سے نکالا اور عجیب لہجہ میں کہا۔ ''لاحول ولاقوۃ کچی سڑک......''

گرد و غبار کا ایک طوفان عظیم پہیے کے نیچے سے اُٹھا کہ جو ہم نے اپنے موٹر کے پیچھے چھوڑا۔ ''کتنے میل اور ہوں گے؟'' لیڈی ہمت قدر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کچھ سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ابھی اٹھائیس میل اور ہیں۔'' نواب صاحب نے موٹر کی رفتار اور تیز کر دی۔

''حضور آہستہ آہستہ، حضور راستہ خراب ہے۔'' پیچھے سے مؤدبانہ طریقے سے شوفر نے نواب صاحب کی خدمت میں عرض کی۔ مگر نواب صاحب کو تیز موٹر چلانے کی پرانی عادت تھی اور انہوں نے کہا ''ہش'' اور شاید موٹر کو اور تیز کر دیا کیونکہ کچی سڑک سے جی گھبرا گیا تھا۔

(۱)

موٹر پوری رفتار سے ہچکولے کھاتا چلا رہا تھا اور ہم لوگ موٹر کی عمدہ کمانیوں اور ملائم گدوں پر بجائے ہچکولوں سے تکلیف اُٹھانے کے مزے سے جھولتے چلے جا رہے تھے۔

سامنے ایک نالائق یکہ جا رہا تھا۔ دور ہی سے نواب صاحب نے ہارن دینے شروع کر دیے تاکہ یکہ پیشتر ہی سڑک کے ایک طرف ہو جائے اور موٹر کی رفتار کم نہ کرنی پڑے۔ مگر یکے کی تیزی ملاحظہ ہو کہ جب تک وہ ایک طرف ہو، موٹر سر پر پہنچا اور مجبوراً رفتار کم کرنا پڑی۔

نواب صاحب نے لال پیلے ہو کر یکے کی طرف منہ کر کے گویا حقارت سے ''ہاؤ'' کر دیا۔ واللہ عالم یکے والے نے سن بھی لیا یا نہیں۔

چشم زدن میں وہ نالائق یکہ مع اپنے یکہ والے کے گرد و غبار کے طوفان میں غلطاں و پیچاں ہو کر نہ معلوم کتنی دور رہ گیا۔

لیڈی ہمت قدر نے یکہ کو مڑ کر دیکھنے کی ناکام کوشش کی اور پھر مسکرا کر اپنے قدرتی لہجے میں کیا۔ ''آپ نے اس کو دیکھا؟ اس کو، یکہ کو! با خدا کیا سواری ہے۔ قیامت تک منزل مقصود پر پہنچ ہی جائے گا۔ کیا آپ کبھی معاف کیجئے گا...... کبھی یکے پر آپ بیٹھے ہیں۔''

نواب ہمت قدر نے موٹر کی رفتار اور تیز کرتے ہوئے کہا ''قیں! ہیں! اچھا یکے پر!! آپ یکے پر بیٹھے ہیں! خوب! بھئی معاف کرنا بڑی ذلیل اور واہیات سواری ہے۔ ہمارے عالی خاندان کا کوئی فرد کبھی یکے پر نہیں بیٹھا۔''

پھر کچھ لاپرواہی سے نواب صاحب بولے۔ ''واللہ اعلم اس پر کیسے سفر کرتے ہیں۔ بڑی واہیات سواری ہے۔'' نواب صاحب نے کچھ غرور تمکنت کے لہجہ میں جملہ ختم کیا۔

''پھر لطف یہ!'' لیڈی ہمت بولیں۔ ''لطف یہ کہ تین تین آدمی ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔'' مجھ سے پوچھا۔ ''کیوں صاحب آپ تنہا بیٹھے ہیں یا کئی آدمیوں کے ساتھ؟''

''میں تنہا بھی بیٹھا ہوں اور ہم کل چار آدمی بھی بیٹھے ہیں اور پانچواں یکہ والا۔''

''پانچ آدمی!'' لیڈی ہمت قدر چیخ کر بولیں۔ ''ایں پانچ آدمی! چہ... پانچ آدمی... آؤ!''

موٹر کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ پشت پر سے شوفر لڑھک کر لیڈی ہمت قدر کی گود میں آ گرا۔ نواب صاحب نے اسٹیرنگ وہیل چھوڑ کر نٹ کا تماشا کیا۔ یعنی بیٹھے بیٹھے اُلٹی قلابازی ایسی کھائی کہ گدے پر میرے اوپر گرے اور ساتھ ہی اس گڑبڑ میں ایک بم کا سا گولہ پھٹا۔ لیڈی ہمت قدر کی فلک شگاف چیخ اور موٹر کے ٹائر کی بم باری اور نواب صاحب کا میرے اوپر گرنا اور پھر ان تمام باتوں کا نتیجہ یعنی بدحواسی۔ موٹر کے اندر ہی اندر قیامت بپا ہو گئی۔ ہوش بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ خیریت گزری۔ محض پھاندا پھوندی رہی۔ میں نے اپنے اوپر نواب صاحب کے

گرنے کی خود اُلٹی ان سے معذرت چاہی۔ شریف آدمی ہیں۔ انہوں نے کچھ خیال نہیں کیا بلکہ مجھ سے پوچھا کہ لگی تو نہیں۔ میرے سینے میں نواب صاحب کا سر گولے کی طرح آ کر لگا تھا۔ مگر میں نے کہا بالکل نہیں لگی۔ یہ طے کر لیا گیا کہ سب سے زیادہ لیڈی ہمت قدر کے لگی ہے اور سب سے کم شوفر کے اسی مناسبت سے دراصل ہم نے ایک دوسرے کی مزاج پرسی بھی کی تھی۔

بہت جلد دوسرا پہیہ چڑھالیا گیا۔ لیکن اب جو چلاتے ہیں تو موٹر نہیں چلتا۔ بہت جلد وجہ معلوم ہوگئی۔ پٹرول کی ٹنکی میں ایک سوراخ تھا جس کو کاگ لگا کر بند کیا گیا تھا، وہ دھکے سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ واللہ اعلم کچھ دیر پہلے یا اب، کچھ بھی ہو، پٹرول بہہ چکا تھا۔ اب جو غور سے دیکھتے ہیں تو زمین تر تھی۔ اب کیا ہو اسٹیشن یہاں سے اٹھائیس میل ہوگا اور پھر کچی سڑک اور جانا اس قدر ضروری۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔

عین اس گھبراہٹ اور یاس کے عالم میں کیا دیکھتے ہیں کہ عین سڑک کی سیدھ میں گویا اُفق سڑک پر نیرِ اُمید طلوع ہوا۔ یعنی اس ٹوٹے پھوٹے یکے کی چھتری چمکی۔ پھر اس کے بعد یکے کا ہیولا نظر آیا۔ جس نے برق رفتاری کے ساتھ یکہ مجسم کی صورت کرلی۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور کبھی یکے کو حتیٰ کہ قریب پہنچا، برابر آیا، کچھ ہلکا پڑا اور قریب قریب رک سا گیا بلکہ یکے والے کے گرد آلود چہرے پر کچھ خوشی کی جھلک کے ساتھ لبوں کو حرکت بھی ہوئی۔ مگر یہاں سب خاموش۔ لیڈی ہمت قدر نے عین اس موقع پر ایک عجیب نظر ڈال کر آنکھوں ہی آنکھوں میں خجالت سے شاید مجھ سے کچھ کہا۔ میں نے معاً لیڈی ہمت قدر کی طرف دیکھا جنہوں نے کنکھیوں سے یکے کے پہیئے کی طرف دیکھ کر اپنی نازک سی چھتری سے زمین کریدنا شروع کی۔ یکہ آگے نکل چکا تھا۔ دراصل مصیبت تو یہ تھی کہ سوائے میرے یہاں کسی کو یکے والے کو پکارنا تک نہ آتا تھا۔ میں البتہ ماہر تھا۔ مجبوری بُری بلا ہے۔ میں نے نواب صاحب اور لیڈی ہمت قدر کی خفت دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ ع

مہربان آپ کی خفت مرے سر آنکھوں پر

اور پھر حلق پھاڑ کر آواز دی۔ "ابے او یکے والے۔"

(۲)

اب سوال یہ تھا کہ لیڈی ہمت قدر اس پر کیسے بٹھائی جائیں۔ نواب صاحب نے مجھ

سے کہا۔ ''آپ ہی کوئی ترکیب نکالیے۔'' کیونکہ سوائے میرے اور کون یہاں یکے کا ماہر تھا۔ لیڈی ہمت قدر کا ایک طرف سے میں نے بازو پکڑا اور دوسری طرف سے نواب صاحب نے بیگم صاحبہ نے ایک پیر دھرے پر رکھا اور دوسرا پہیہ کے جال پر اور اس کے بعد شاید اُڑنے کی کوشش کی جال پر سے پیر سرک گیا اور وہ پر کٹی مینا کی طرح میری طرف پھڑ پھڑائیں، کیا کرتا مجبوراً میں نے ان کو لحاظ کے مارے چھوڑ دیا، ورنہ وہ میری گود میں ہوتیں۔ انہوں نے ہاتھ پیر بھی آزاد پا کر چلا دیے اور ان کے بوٹ کی اونچی اور نوکیلی ایڑی قابل احترام شوہر کی ناک پر لگی۔ نتیجہ یہ کہ نواب صاحب پہیہ کے پاس دراز۔ میں نے کہا یا علی! نواب صاحب مونچھیں جھاڑتے ہوئے مجھ سے شکایت کرتے ہوئے اُٹھے اور بیگم صاحبہ کو سنبھالا۔ اب یہ طے پایا کہ یکے کو موٹر کے پاس کھڑا کیا جائے۔ برابر نواب صاحب بیٹھے اور آگے میں بیٹھا۔ یکے والے نے تخ تخ کی صدا بلند کی۔ ''چوں چرخ چوں۔'' اور یکہ چل دیا۔

نواب صاحب اور لیڈی صاحبہ کو معلوم ہوا کہ خود اپنے جوتوں سے اپنے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ فوراً معاملہ میرے سامنے پیش کر کے اس کا علاج مجھ سے پوچھا۔ یکہ والے نے فوراً کہا۔ ''آپ دونوں اپنے اپنے جوتے اُتار کر ہاتھ میں لے لیجئے۔ تاکہ میں آگے والے گھاس کے ڈبہ میں رکھ دوں۔'' اور گھاس کا ڈبہ کھولا تو اس میں دو تین رسیاں، ایک چلم، ایک ہتھوڑی، چند کیلیں وغیرہ تھیں۔ نواب صاحب اب تک خاموش تھے، یکے والے پر سخت خفا ہوئے۔ میں نے نواب صاحب کو سمجھا دیا کہ کپڑے تو جوتے سے میلے ہونا لازمی ہی ہیں پھر اس یکے کی خوبیوں کا تذکرہ کیا کہ جس میں پیر رکھنے کا پائیدان بھی ہوتا ہے۔ وہ ہوتا تو غالباً لیڈی ہمت قدر کو چڑھنے میں یہ دقتیں پیش نہ آتیں۔

یکہ والے نے اپنی پوزیشن اس طرح صاف کی کہ ''صاحب پائیدان کمانی دار یکے میں ہوتا ہے اور میں کچی سڑک پر چلاتا ہوں، لہٰذا کمانی دار یکے نہیں رکھتا، ورنہ دو دن میں کمانیاں چور چور ہو جائیں۔'' یکہ والا کچھ فلسفیانہ رنگ میں آ کر بولا۔ ''حضور یہاں تو بس ''کھڑیا'' یکہ چلتا ہے کچی سڑک کا یہ بادشاہ ہے نہ لوٹے اور نہ یہ ٹوٹے اور مسافر بھی آرام سے چین کی بنسی بجاتا ہے۔''

''چپ'' نواب صاحب نے بھنا کر یکے والے سے کہا۔

(۳)

تھوڑی دیر بعد نواب صاحب نے پینترے بدلنا شروع کیے۔ان کا گھٹنا میری پیٹھ میں بُری طرح گڑ رہا تھا۔لیڈی ہمت قدر ایک ہاتھ سے اپنی نازک چھتری لگائے تھیں اور دوسرے ہاتھ سے یکے کا ڈنڈا پکڑے تھیں۔ان کے دونوں ہاتھ کبھی کے دکھ چکے تھے۔ہر جھٹکے پر وہ اس طرح چیختی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ گر گئیں۔نواب صاحب کے موذی گھٹنے کے گڑنے کی وجہ سے میں دھیرے دھیرے آگے سرکتا جاتا تھا۔مگر جتنا میں ہٹتا اُتنا ہی شاید نواب صاحب کا گھٹنا اور بڑھ جاتا تھا۔میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ کیا کروں جو اس گھٹنے سے پناہ ملے۔

اتنے میں ایک جھٹکا لگا اور نواب صاحب کی ناک یکہ کے آگے والے ڈنڈے میں لگی عین اس جگہ جہاں میں اس کو ہاتھ سے پکڑے تھا۔میری چھنگلی کچل گئی۔ ''لگی تو نہیں۔'' نواب صاحب نے مجھ سے پوچھا۔''آپ کے تو نہیں لگی۔میں نے اُن کی لال ناک دیکھتے ہوئے کہا۔دونوں کو زور سے لگی تھی۔میری چھنگلی میں،ان کی ناک میں۔مگر دونوں جھوٹ بولے اور جواب واحد تھا۔''جی نہیں بالکل نہیں۔'' واقعی جھٹکا ایسا لگا کہ اگر کہیں میری انگلی اس جگہ پر نہ ہوتی تو نواب صاحب کی ناک پچکی ہو جاتی۔

''ذرا ادھر ہٹیئے۔''لیڈی ہمت قدر نے نواب صاحب سے روکھے لہجے میں کہا۔نواب صاحب نے اپنی پیاری بیگم کے کہنے سے کروٹ سی بدل کر کوئی آدھ انچ گھٹنا اور میری پیٹھ میں گھسیڑ دیا۔

میں نے گھٹنے کی نوک کو! ہاں صاحب،نوک کو! جو بری طرح تکلیف دے رہی تھی ذرا سرک کر دوسرے حصۂ جسم پر لیا۔

''تیز نہیں چلاتا۔'' یکے والے سے نواب صاحب نے حلق پھاڑ کر کہا۔اس نے سوت کی رسی کی لگام کو جھٹکا دے کر گھوڑے کو ٹخارہ دیا اور لگام کے زائد حصّہ کو گھما کر دو طرفہ گھوڑے کو جھاڑ دیا اور پھر دوبارہ جو گھما کر سڑاکا دیا تو میری عینک لگام کے ساتھ اُڑ چلی اور قبل اس کے کہ میں اپنی ناک پر ہاتھ لے جاؤں کہ کہیں عینک مع ناک کے تو نہیں چلی گئی عینک مع رسی کے لیڈی ہمت قدر کے بالوں میں جا الجھی۔لیڈی ہمت قدر نے چیخ نکالی۔رسی میری ناک کے نیچے سے ہوتی ہوئی گئی

تھی۔ گویا ایک دم سے میرے منہ میں لگام دے دی گئی۔ قدرتی امر کہ میرا ہاتھ ساتھ ساتھ اس پر پہنچا اور لیڈی صاحبہ کے میری عینک نے بال کھینچ لئے! وہ بولیں "چیخ... چہ... چیں۔"

عینک با احتیاط تمام لیڈی موصوفہ کے بالوں کو سلجھا کر نکالی گئی۔ یکے والا مارے ڈر کے کانپ رہا تھا۔ خوب ڈانٹا گیا بلکہ پٹتے پٹتے بچا۔ پھر سنبھل کر بیٹھے اور اس سلسلہ میں نواب صاحب کا گھٹنا ایک آدھ انچ اور میری کمر میں در آیا، مجبوراً میں کچھ اور آگے سرکا۔ مگر وہاں جگہ کہاں؟ پیشتر ہی لنگر پر آ گیا تھا۔

لیڈی ہمت قدر پر تین طرح کا سایہ تھا۔ ایک تو خود نواب صاحب کا، دوسرے یکے کی چھتری کا اور تیسرے خود ان کی نازک چھتری کا۔ مگر دھوپ تیز تھی یکہ کی چھتری ظاہر ہے کہ اگر کچھ پناہ دھوپ سے دیتی ہے تو وہ بھی ٹھیک بارہ بجے اور بارہ بجنے میں ابھی دیر تھی۔

باوجود ہر طرح کے سایہ کے لیڈی ہمت قدر گرمی سے حیران تھیں۔ سڑک ذرا بہتر آ گئی تھی اور یکہ اب روانی کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور ظاہراً اور کوئی تکلیف نہ تھی اب ایسے موقع پر گرمی کی تکلیف لامحالہ محسوس ہوئی اور لیڈی ہمت قدر نے کچھ بے چین ہو کر کہا۔ "خدا کی پناہ مری جا رہی ہوں گرمی سے......"

جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ یکہ والے نے اپنی سریلی آواز میں مصرعہ کھینچا۔ "ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے..."

"ابے نالائق۔" یہ کہہ کر ایک طرف سے نواب صاحب گرجے اور دوسری طرف ایک کہنی اُس کی بغل میں مار کر میں برس پڑا۔ "بے ہودہ، نالائق، گستاخ، بدتمیز،" پھر نواب صاحب اس طرح گڑگڑائے اور بڑبڑائے جیسے کوئی بڑا خالی برتن پانی میں غرق ہوتا ہے اور اس بُری طرح ڈپٹا اور ساتھ ساتھ اس ڈپٹ کے کوئی آدھ انچ اور نواب صاحب نے اپنا "باریک" گھٹنا (موٹے تازے تھے) میری کمر میں بھونک دیا۔

دراصل اس یکے والے کی خطا نہ تھی اگر لمبے راستے کا ایک سست یکے پر آپ کو سفر کرنے کا موقع ملا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یکہ گھوڑے کی طاقت کے مطابق ایک پُرسکون اور مستقل رفتار اختیار کر لیتا ہے، جھٹکے منظم ہو جاتے ہیں جھکولوں کا ایک سائیکلک آرڈر (ترجمہ غالباً

نظامِ تسلسل) قائم ہو جاتا ہے۔ پہیہ کی چرخ چوں ایک ٹائمنگ (ترجمہ۔ غالباً تعینِ وقت) کی پابند ہو جاتی ہے۔ گھوڑے کے قدم نپے تلے پڑتے ہیں۔ مسافروں کے سر مقررّہ حدود میں ایک تنظیم کے ماتحت ہلتے ہیں۔ آپس میں سر ٹکرانے کا امکان جاتا رہتا ہے۔ غرض جب ہر چیز منظم ہو کر یکے کو مجسم پوئٹری آف موشن (ترجمہ غالباً نظم الحرکات) بنا دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یکہ چل نہیں رہا بلکہ بہہ رہا ہے اور پھر یکہ والے کی طبیعت ایک عجیب پُر کیف ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب کہ کرایہ معقول ملا ہو، وہ کچھ سینے کے بل جھک کر آنکھیں نیم باز کئے ہوئے نہ معلوم کہاں پہنچتا ہے۔ اس کو یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ یکے پر کون ہے کون نہیں اور نتیجہ یہ کہ وہ الاپ اٹھتا ہے۔ لہٰذا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہاں یکے والے کی کوئی خطا نہ تھی۔

میں نے اس فلسفے کو نواب صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بیگم صاحبہ آدھے سے زیادہ اس فلسفے کو سمجھ چکی تھیں کہ انہوں نے ایک دم سے چہرہ وحشت زدہ بنا کر ریل کی سی سیٹی دینے کی کوشش کی اور چھتری دور پھینکی۔ ''ارے روک روک'' ایک طرف سے نواب صاحب چیخے اور دوسری طرف سے میں چلایا۔ ''کمبخت روک''

بیگم صاحبہ کی ریشمیں ساڑھی پہیہ میں اُلجھ کر رہ گئی اور اگر یکہ نہ رکتا تو چونکہ ریشم مضبوط ہوتا ہے، ضرور نیچے آ تیں، یہاں سے مہارانی درو پدی کا سا قصہ شروع ہوتا ہے۔ ساڑھی کا زرّیں کام سب خراب ہو گیا تھا۔ نواب صاحب بہادر یکہ بان پر بے حد برافروختہ تھے نہ اس وجہ سے کہ ساڑی قیمتی تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ پہیہ نے بیگم صاحبہ کی لاپرواہی سے فائدہ ناجائز اُٹھاتے ہوئے گستاخی کی تھی اور قصور یکہ کا تھا اور یکہ خود یکہ والے کا۔

میں چونکہ یکے پر بیٹھنے کا ماہر تھا، لہٰذا میری طرف نواب صاحب نے سوالیہ صورت بنا کر دیکھا کیونکہ میں نے یکے والے کو ایک لفظ نہ کہا تھا۔ چنانچہ میں نے تصدیق کی بے شک ایسا بھی ہوتا ہے اور اس میں یکے والے کی کوئی خطا نہ تھی بشرطیکہ وہ یکے کو روکنے میں خواہ مخواہ دیر نہ کرلے۔ لیڈی ہمت قدر نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیوں صاحب، کیا آپ کی بیوی کے ساتھ بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''میری تو خدا کے فضل سے بچی رہی ہیں مگر خود میرے ساتھ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے، اور اچکن کا دامن اکثر خراب ہو گیا ہے۔''

''یہ کیل تو مارے ڈالتی ہے۔'' نواب صاحب نے کچھ بیکل ہو کر پینترا بدلا اور کیل کی جگہ کو ٹٹول کر میری کمر میں آدھ انچ اور اپنا گھٹنا پیوست کر دیا۔ نواب صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے۔ آپ کہیں گے کہ ان کا گھٹنا اور ''باریک'' تو عرض ہے کہ ایک موٹی چیز بھی جس وقت مستقل طور پر جسم میں پیوست ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وہ بھی پھر یکے پر تو اس کی چبھن کسی طرح نوک دار چیز کی چبھن سے کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ میں خوش تھا کہ نواب صاحب کی ران میں ایک کیل چبھ رہی ہے اور میرا بدلا لے رہی ہے۔ حالانکہ یکے پر گدی تھی اور اس پر دوہری چادر مگر یکہ کی کیل نواب صاحب کو بیکل کیے دیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد نواب صاحب اس کیل سے پریشان ہو کر اکڑوں کی قسم کی کروٹ سے بیٹھ گئے ان کا سر عجیب طرح یکے کے جھکولوں کے ساتھ گردش کر رہا تھا یعنی اس طرح کہ اگر ان کی ناک پر پنسل باندھ دی جاتی اور اس کے سامنے کاغذ ہوتا تو ایک گول حلقہ بن جاتا۔ لیڈی ہمت قدر کو ایسے جھٹکے لگ رہے تھے کہ اگر ان کی ناک پر پنسل ہوتی تو آدھا حلقہ تو ٹھیک بنتا مگر پھر پنسل کاغذ میں چبھ جاتی۔ میری ناک شاید لہریا بناتی اور یکے والا چونکہ جھکا ہوا تھا لہٰذا اس کی ناک سطریں کھینچ رہی تھی۔ غرض اس طرح ہم سب اقلیدس کی شکلیں حل کرتے جا رہے تھے۔

ماہرین فلکیات کا ایک عجیب نظریہ ہے اور وہ یہ کہ نظام شمسی کے تمام اجسام مقررہ حدود کے اندر اپنے اپنے قواعد کے مطابق اصطلاح میں کشش رکھتے ہیں اس نظریہ کی رو سے قیامت جب آئے گی جب اس کشش میں فرق پڑے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمام اجسام بے قابو ہو کر آپس میں لڑ جائیں گے۔ حسنِ اتفاق کہ اس نظریہ کی تفسیر یکہ پہ پیش آنا تھی۔ ایک معمولی سے گڑھے پر نہایت ہی معمولی سا جھٹکا لگا۔ مگر یہ وہ جھٹکا تھا جس نے گویا نظام شمسی کو درہم برہم کر دیا۔ آپس میں ہم سب کے سر لڑ گئے اور پھر علیحدہ ہو کر ڈنڈوں میں جا لگے اور کچھ تو اس وقتی ابتری سے ہوا نہیں مگر اس سلسلہ میں نواب صاحب کا گھٹنا میری کمر میں پھر درآیا، میں بالکل گگر پر تھا اور وہ اب قصہ ماضی کی بات تھی جب ان کا گھٹنا آدھ آدھ انچ سرکتا تھا اب تو جگہ ہی نہ تھی اور میں طوطے کی طرح اڈے پر بیٹھا ہوا تھا۔

یکہ کا دباؤ ویسے ہی تھا، یعنی آگے کو مائل تھا۔ قسمت کی خوبی نواب صاحب نے اس

نامعقول سی وجہ سے ایک معمولی سے جھٹکے سے بیکل ہو کر ایک دم سے اچھل کر بوجھ آگے ڈال دیا۔ یکے کا ساز کیا تھا، بس رسیوں کی جکڑ بندی تھی۔ واللہ عالم جھٹکے سے مگر میں تو کہتا ہوں کہ شاید قصداً لیڈی ہمت قدر نے ایک چیخ کے ساتھ اپنی چھوٹی سی چھتری میرے سر پر رکھ کر اپنی طرف زور سے گھسیٹی۔ ادھر میں پر کٹے طوطے کی طرح نواب صاحب کے گھٹنے کی بدعتوں کی وجہ سے گویا اڈّے پر بیٹھا ہی تھا۔ وہاں سوائے ٹکر کے رہ ہی کیا گیا تھا۔ ہم جو ایک دم سے زمین پر آ لگے تو میں آگے کو گرا چھتری منہ پر چڑھی تھی، دکھائی کیا دیتا خاک اور پھر دکھائی بھی دیتا تو بے کار۔ جھٹکے سے چھتری تو بعد میں الگ ہو گئی، مگر میں عجیب طرح گرا، اور دور تک اپنی ناک زمین میں صرف بالشت بھر اونچی کئے دوڑا ہی چلا گیا اور پھر ہر قدم پر یہ اُمید تھی کہ بدن قابو میں آجائے گا اور کھڑا ہو جاؤں گا مگر حضرت یہ اُمید موہوم نکلی اور اس طرح منقطع ہوئی کہ دس بارہ قدم کی مسافت اسی طرح ناک زمین سے کوئی بالشت بھر اونچی کئے طے کرنے کے بعد میں اپنی ناک سے سڑک کی زمین پر ہل چلا دینے پر مجبور ہو ہی گیا۔

اُٹھا اور اپنی ناک ٹٹولی۔ سارا منہ گرد سے سفید ہو گیا تھا۔ آنکھوں نے جب دیکھا کہ ناک ارادۂ قطعی ہے تو وہ بند ہو گئی تھیں۔ ورنہ دھول میں پھوٹ ہی جاتی۔ مگر پھر بھی آنکھوں نے بہت کام کیا تھا اور آخر وقت تک کھلی رہنے کی وجہ سے ان میں مٹی گھس گئی تھی۔ ہاتھوں نے بڑی خدمت کی اور چھل گئے ورنہ شاید میری ناک گھس کر غبارِ راہ ہو جاتی۔ کیونکہ بلا مبالغہ فٹ بھر کے قریب ناک نے زمین پر ایک گہری سی لکیر کھینچی۔ کچھ بھی ہو یہ سب چشم زدن میں ہو چکا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا تو بیگم صاحبہ دونوں ہاتھوں سے ڈنڈے پکڑے مسلسل چیخیں مار رہی تھیں حالانکہ وہ خطرے سے باہر تھیں اور بندریا کی طرح ڈنڈے سے چپکی ہوئی تھیں۔ نواب صاحب یکہ کے بم پر کچھ اس طرح آ کر رکے تھے کہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ بچوں والا کھیل گھوڑا گھوڑا بم کے ڈنڈے سے کھیل رہے تھے۔ یکے والا غریب البتہ پہیہ کی سیدھ میں چت گرا تھا۔ گھوڑا اس وقتی سبکدوشی کو غنیمت تصور کر کے ایک انداز بے خودی کے ساتھ سڑک کے کنارہ کچھ تفنن اُڑا رہا تھا۔

بہت جلد ایک دوسرے کی خیریت اور مزاج پرسی سے فراغت پائی۔ یکے والے نے یکے کے ساز کی گانٹھا گونٹھی اور باندھا بوندھی کی مگر کچھ ٹھیک نہ بندھا تو نواب صاحب سے اس نے

کہا'' آپ کے پاس رسی کا کوئی ٹکڑا تو نہیں ہوگا؟''

نواب صاحب نے اس کا جواب دیا۔''الّو کے پٹھے...ام...ہم...''(بھنا رہے تھے) میں نے ڈانٹ کر کہا۔''ابے تو بالکل ہی گدھا ہے۔''

یکہ والا گنگنا کر بولا۔''میاں میں نے کہا شاید کوئی ٹکڑا و کڑا نکل آئے، پھر اب بتائے کیا ہو، بغیر رسی کے تو کام نہیں چلے گا۔''

میرا سوتی رومال اور بیگم صاحبہ اور نواب صاحب کا ریشمی رومال ان تینوں کو ملا کر مضبوطی سے ساز کی بندش کو یکے والے نے سنبھالا۔ جھٹکے دے کر خوب اچھی طرح آزمانے کے بعد اس نے کہا۔''اب بیٹھ جایئے۔''نواب صاحب چونکہ سب سے زیادہ بھاری تھے، لہٰذا یکے والے نے کہا کہ ذرا پیچھے کو دبے رہیں۔ ہم سب اچھی طرح بیٹھ گئے۔ نواب صاحب پیچھے کو دب کر بیٹھے، ایسے کہ جیسے گاؤ تکیہ لگائے ہوں اور جو کچھ تھا، سو تھا، میں خوش تھا کہ نواب صاحب کے گھٹنے سے میری جان چھوٹی۔

مگر تھوڑی ہی دیر بعد نواب صاحب کی پیٹھ میں یکے کی آرائش چبھنے لگی۔ کیونکہ یہ یکہ ضرورت سے زیادہ موٹے نیلے پیلے موتیوں سے آراستہ تھا جو مضبوط تار میں پرو کر ڈنڈوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا نواب صاحب کچھ آگے کو مائل ہوئے اور انہوں نے گھٹنا اُڑانے کی تمہید اٹھائی۔ اب میں تنگ تھا لہٰذا میں نے نواب صاحب سے کہا کہ ذرا پیچھے ہی رہیئے ورنہ اندیشہ ہے کہ یکہ دباؤ ہو جائے گا۔''لیڈی ہمت قدر اب دباؤ کے نام سے کانپتی تھیں۔ انہوں نے بھی نواب صاحب سے کہا کہ پیچھے ہی رہیئے اب یکے کا توازن بہت اچھی طرح قائم تھا۔ ذرا بھی دباؤ ہوتا تو میں نواب صاحب کی توجہ رومالوں کی کمزور بندش کی طرف دلاتا اور نواب صاحب پھر ٹھیک طرح بیٹھ جاتے ورنہ بیگم صاحبہ غل مچاتیں۔

کوئی قابل ذکر بات نہ تھی کہ ایک معمولی سے جھٹکے پر لیڈی ہمت قدر چیخیں اور ساتھ ہی سڑک پر سے باسی گوبر کا ایک ٹکڑا پہیہ کے ساتھ اُڑ کر اُن کی آنکھ میں لگا۔ وہ چیخیں تو دراصل اس وجہ سے تھیں کہ ہاتھ میں ڈنڈے کی پھانس لگ گئی تھی کہ یک نہ شد دو شد اور اُن کی آنکھ میں گوبر پڑ گیا۔ یکہ روکا گیا۔ پھانس نکالی گئی اور آنکھ صاف کی گئی۔ لیڈی ہمت قدر کے ہاتھ ڈنڈا

پکڑے پکڑے سرخ ہو گئے تھے اور وہ کہہ رہی تھیں کہ ''میرا شانہ اُکھڑا جا رہا ہے۔'' مگر کیا کرتیں لاچار و مجبور تھیں، کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

(۵)

اس حالت میں ہم چلے جا رہے تھے۔ سڑک رفتہ رفتہ خراب آتی جا رہی تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد ایسی آئی کہ ہوشیاری سے بیٹھنا پڑا۔ لیڈی ہمت قدر ''دباؤ'' یکہ کا خیال کر کے کانپ اُٹھتی تھیں اور نواب صاحب کو تاکید پہ تاکید تھی کہ پیچھے ہٹے رہو۔ یکے والا بھی خوش تھا کہ گھوڑا ہلکا چل رہا ہے۔ مگر یہ شاید لیڈی ہمت قدر کو معلوم نہ تھا کہ یکے پر بیٹھنا دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو ''دباؤ'' جب آگے کو بوجھ ہوگا، اور پھر ''الار'' جب پیچھے کو بوجھ ہوگا۔ میں چونکہ آگے بیٹھا تھا اور دباؤ یکے کا لطف اُٹھا چکا تھا کہ یکہ بان سے لے کر نواب صاحب تک ہر کس و ناکس کی یہ کوشش تھی کہ یکہ ''الار'' رہے۔

رومالوں کی بندش پر ''الار'' یکے کا زور بے طرح پڑ رہا تھا اور چونکہ آگے بیٹھنے والے کو ''الار'' یکہ میں خطرہ ہوتا ہے لہٰذا میں چپ تھا۔ لیڈی ہمت قدر جانتی ہی نہ تھیں کہ ''الار'' کیا چیز ہوتی ہے۔ نواب صاحب بیگم صاحبہ کی خوشنودی میں منہمک تھے اور یکے والے کے لئے ''الار'' اور ''دباؤ'' روزانہ کا مدوجزر ٹھہرا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ایک غیر معمولی گڑھے پر جھٹکا لگا۔ رومالوں نے تڑاخا بھرا۔ لیڈی ہمت قدر جو اصولاً چیخیں حق بجانب تھیں۔ کیونکہ یکے کے دونوں بم اینٹی ایئر کرافٹ گن (ہوائی جہاز کو گرانے کی توپ) کی نالوں کی طرح اُٹھ گئے۔ یکہ اگر آدمی ہوتا تو قطعی چت گرتا۔ عقلمند یکہ بان نے یکے کی پشت پر نیچے ایک طرف یکے کا داہنا بم قصداً آدھ گز بنوایا تھا۔ جس کو ظاہراً بیکار طور پر نکلا ہوا چھوڑ دیا تھا۔ یہ دراصل اگر سچ پوچھئے تو تھیوری آف بیلنس یعنی نظریہ توازن کی تفسیر تھا۔ جس کو اصطلاحاً پورپ کی طرف ''الریٹھا'' کہتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر ''اینٹی الار اپریٹس (آلہ مانع الار) واقعی اگر یہ کہیں نہ ہوتا یکہ مع اپنے اسباب جہالت یعنی ہم لوگوں کے سر کے بل (یعنی چھتری کے بل) چت گرتا۔

مگر پھر بھی باوجود یکے کے ''آلہ نما مانع الار'' نے یکہ ایک جھٹکے کے ساتھ روک لیا۔ لیکن دونوں بمیں ہوا میں متعلق ہو گئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکے والا لڑھک کر لیڈی ہمت قدر کی گود

میں گرا اور اپنی اس عزت افزائی سے اس قدر گھبرایا کہ میری گردن پر سے ہوتا ہوا نکل کر پہیئے کے پاس گرا۔ میں لمبا لمبا یکہ میں لیٹنے پر مجبور ہوا اور یکے بان کے بیٹھنے کی جگہ جو ایک خانہ ہوتا ہے اس کا ڈھکنا کھل جانے کی وجہ سے تمبا کو ملی ہوئی ریت پھانکنے کے علاوہ میرے منہ پر ہتھوڑی اور چلم اور دوسری مکروہات گریں مع لگام کے جو یکے بان چھوڑ گیا تھا۔

نواب صاحب نے عجیب حرکت کی تو وہ گڑ گڑا کر پھاندے اور چھپکلی کی طرح پٹ سے پہیہ کے برابر دھول میں گرے اور اس برجستگی کے ساتھ اُٹھے کہ بیان سے باہر ہے۔

یکے والے کے پاس کافی عذر موجود تھا۔ مثلاً "صاحب یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ (کوئی غیر معمولی بات نہیں) ساز پرانا ہو گیا ہے... کہیں رومالوں سے کام چلتا ہے... نیا ساز اب کے میلے کی مزدوری سے خریدوں گا... گھوڑا چھ سیر دانہ کھاتا ہے، دام ہی بچتے نہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

یکہ میں بھی جگہ جگہ خزانے ہوتے ہیں، نہ معلوم کن کن مقامات کو یکہ والے نے کریدا اور کہاں سے رسی کے متعدد ٹکڑے نکال کر ساز کو پھر گوندھا اور کسا اور خدا خُدا کر کے ہم پھر چلے۔ لیڈی ہمت قدر اب سہمی ہوئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کس طرف زور دیں، آگے کو جھکیں تو دباؤ کا ڈر اور پیچھے رہیں تو الار کا خطرہ عجیب لہجہ میں انہوں نے کہا۔ "یکہ بڑی خطرناک سواری ہے۔ کبھی کوئی مر تو نہیں جاتا؟"

یکہ والا بول اٹھا۔ "صاحب جس کی آتی ہے وہ اس بہانے بھی جاتا ہے۔"

نواب صاحب نے زور سے ڈپٹ کر کہا۔ "چپ بے... ٹراپ"... (بڑبڑانے لگے)

(۶)

پکی سڑک! پکی سڑک! یہ نعرہ ہم لوگوں نے پکی سڑک کو دور ہی سے دیکھ کر اس طرح بلند کیا جس طرح کرسٹوفر کولمبس کے ساتھیوں نے زمین کو دیکھ کر زمین! زمین کا غلغلہ بلند کیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم زور سے پکی سڑک پر کھڑ اکھڑاتے جا رہے تھے۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ یکے پر ہم گویا سر کے بل بیٹھے ہیں۔ بے کمانی کے یکے کی کھڑ اکھڑاہٹ بھی عجیب چیز ہے۔ کچی سڑک کی مٹی اور غبار چشمِ زدن میں کپڑوں پر سے جھڑ گئی۔ نواب صاحب کی کیل بجائے ان کے ایک جگہ گڑتی ساری ران کے طول و عرض میں چبھ رہی تھی۔ یکے والے کو موقع ملا۔ "آؤ بیٹا" کر کے

اس نے گھوڑے کو رسی کی لگام سے اچھی طرح جھاڑ دیا اور گھوڑا بھی کچی سڑک کی صعوبت سے خلاصی پا کر اپنے جوہر دکھانے لگا، وہ تیز چلا اور پٹا۔ خوب تیز چلا اور خوب پٹا۔ یکے والے کو اس سے بحث نہیں کہ تیز چل رہا ہے، گھوڑے کو نہ مارنا چاہیے۔ وہاں تو اصول ہے کہ مارے جاؤ گھوڑا بھی کہتا ہوگا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہے، جتنا جتنا تیز دوڑتا ہوں، مارا جاتا ہوں، قدم ہلکا کرتا ہوں تو مارا جاتا ہوں۔ آخر کو جانور پھر جانور ہے، لے کر بے تحاشہ دوڑا، اور اسی مناسبت سے مار کھائی'' ہائیں ہائیں'' میں کرتا ہی رہا اور لیڈی ہمت قدر کی چیخیں الگ کہ اتنے میں خیر سے داہنے پہیہ کی عین اس برق رفتاری کے عالم میں کیل نکل گئی اور پہیئے نکل کر یہ جا وہ جا۔

خدا کی پناہ، موٹر کا حادثہ تو کوئی چیز نہیں، گھوڑا بھاگتے میں کروٹ کے بل گرا اور یکے والا آدھا اس کے نیچے۔ میں اُڑ کر دور گرا نواب صاحب یکے کے پیچھے گرے اور بیگم صاحبہ خود یکہ کے داہنی طرف، یکے والا چوٹ کی وجہ سے اور لیڈی ہمت قدر صدمہ کی وجہ سے بے ہوش ہو گئیں اور نواب صاحب کا کولہا اُتر گیا، اور میری دو پسلیاں ٹوٹ گئیں سب اپنی اپنی جگہ پڑے تھے۔ گھوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکا کر دیکھا۔ نواب صاحب لنگڑاتے ہوئے اُٹھے اور اپنی بیگم صاحب کو سنبھالا۔ ایک عجیب پسپائیت کا عالم تھا۔

خدا رحیم و کریم ہے اس نے دس پندرہ منٹ بعد ہی ایک موٹر بھیج دیا۔ ایک انگریز اس طرف جا رہا تھا، جدھر سے ہم آ رہے تھے۔ اس نے سب کو بین بٹور کر سیدھا ہسپتال پہنچایا یکہ والے کا یکہ اور گھوڑا وہیں رہ گیا تھا۔ بعد میں وہ کھو گیا۔ نواب صاحب نے اس کو اپنے موٹر پر جب سے رکھ لیا ہے۔ کبھی کبھی ملتا ہے تو اس کی صورت دیکھ کر نواب صاحب اور میں اور لیڈی ہمت قدر، سب کو ہنسی آتی ہے۔

نواب صاحب اور ان کی لیڈی صاحبہ تو پھر کبھی یکہ پر نہیں بیٹھیں اور نہ بیٹھیں گی، لیکن میں اب بھی بیٹھتا ہوں۔ سواری ماشاءاللہ خوب ہے۔

☆☆☆

چراغ حسن حسرت

خاندانی قبرستان

کچھ دن ہوئے کول سرکس کا مالک مسٹر کول ایک قہوہ خانے کے باہر کھڑا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی جس کا سر گنجا تھا۔ اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''کیوں صاحب! آپ سرکس والے ہیں؟''

''جی ہاں! میں سرکس والا ہوں۔ کہیے مجھ سے کیا کام ہے؟''

''میرے پاس ایک پالتو شیر ہے۔ میں اسے آپ کے ہاتھ بیچ ڈالنا چاہتا ہوں۔''

''کس قسم کا شیر ہے؟''

''سر سے دُم تک گیارہ فٹ۔ کل اس کی عمر پورے چار سال کی ہو جائے گی۔ وہ بچہ سا تھا کہ میں اسے پکڑ لے آیا اور آج تک وہ میرے ساتھ ہے۔''

''کھاتا خوب ہے؟''

''صاحب کیا بتاؤں۔ اسی لیے تو میں اسے آپ کے ہاتھ بیچ رہا ہوں۔ پیٹ کے کارن وہ ایسی حرکتیں کر گذرتا ہے کہ اب میرا اس کا نباہ مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے اس کا نام جے گولڈ رکھ چھوڑا ہے۔''

''طبیعت میں وحشت بھی ہوگی؟''

''نہیں یہ بات تو نہیں۔ البتہ جو چیز ملے اسے چبا ڈالتا ہے۔ اب میں اسے زنجیر سے باندھ کر رکھتا ہوں کیوں کہ ذرا سی دیر کے لیے کھول ڈالوں تو پڑوسی مارے شور کے آسماں سر پر اُٹھا لیں۔ اب میری کہانی سنئے۔ کوئی تین مہینے ہوئے جے گولڈ میری بیوی کی خالہ کو چٹ کر گیا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ خالہ کہیں باہر گئی ہیں۔ ہر طرف تلاش کر چکے۔ لیکن اُن کا سراغ نہ ملا۔ آخر ہمیں جے گولڈ پر شبہہ ہوا۔ اُس کا پیٹ پھولا ہوا تھا، بار بار کھانستا تھا۔ ایک مرتبہ زور سے دھڑ ونکا جو مارا تو اُس کے منہ سے لعاب کے ساتھ ساتھ خالہ جی کے مصنوعی دانت نکل آئے

۔بس اب تو ہمیں یقین ہو گیا کہ خالہ اماں جے گولڈ کے پیٹ میں استراحت فرما رہی ہیں ۔میری بیوی بہت روئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ اس کمبخت کو گولی مار دو۔لیکن میں نے کہا کہ جانے دو جو ہونا تھا ہو چکا۔آخر اس کمبخت کو بھی خالہ کے ہضم کرنے میں بڑی تکلیف ہوئی ہے۔میری باتیں سُنیں تو وہ بھی رودھو کے چپکی ہو رہی۔کچھ دنوں بعد ایک صبح کو ہم ناشتہ کرنے بیٹھے تو میری ساس ناشتہ میں شریک ہونے نہ آئی۔اُس کا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا۔ہم نے جا کے دیکھا کہ کمرہ خالی ہے اور اُس کے مصنوعی بال ایک کرسی پر پڑے ہیں۔اتنے میں جے گولڈ پلنگ کے تلے سے ہونٹ چاٹتا نکلا۔میں سمجھ گیا کہ بیچاری ساس بھی غفرلہا ہو گئی۔میری بیوی بہت سٹپٹائی ۔بہت روئی پیٹی، چیخی چلائی اور کہنے لگی اس کمبخت کو دور دفان کرو۔لیکن اُسی دن ''انجمن انسداد ظلم بر حیوانات'' نے جس کا کام حیوانات کو بُرے سلوک سے بچانا ہے، خالہ میریا کے انتقال پُر ملال کا واقعہ سن کر مجھے ایک سنہری تمغہ بھجوا دیا۔کچھ تو یہ تمغہ دیکھ کر میری بیوی کا غصہ دھیما ہوا ۔کچھ میں نے کہا کہ جے گولڈ بے زبان ہے، اسے کیا معلوم کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے ۔جو لوگ حیوانات پر رحم کرتے ہیں خدا اُن پر رحم کرتا ہے۔غرض اسی طرح کی باتیں سن کر وہ چپ ہو گئی۔

کوئی مہینہ بھر کا عرصہ۔۔۔تو امن وامان سے گذر گیا۔ایک دن میں نے سب سے چھوٹے لڑکے جان کو بازار تک سودا لینے بھیجا۔وہ اپنے ساتھ جے گولڈ کو بھی لے گیا۔کچھ عرصہ کے بعد جے گولڈ تنہا واپس آیا۔جان کا کوئی اثر آثار نہیں تھا۔ہم سب سمجھ گئے کہ بیچارے جان کی بھی جان گئی۔کیونکہ جے گولڈ کے پیٹ میں جان کے قد وقامت کا جتنا اُبھار سا تھا۔یہ دیکھ کر گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔میری بیوی تو مارے غم کے دیوانی ہو گئی۔وہ جے گولڈ کے پیٹ تلے بارود کا پیپا رکھ فتیلہ دکھانے کو تھی۔لیکن میں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ہائیں تم دیوانی ہو گئی ہو کوئی اپنے پیارے بچہ کے مزار کی بے حرمتی کرتا ہے؟ غرض شیر کو لٹا کر وہ تمام دعائیں جو دفناتے وقت پڑھی جاتی ہیں، پڑھی گئیں۔مہینہ بھر تک اُس کے گلے میں سیاہ کپڑا بندھا رہا۔

''تم نے پھر بھی اُسے کھلا چھوڑ رکھا؟''

''میرا ارادہ تو یہی تھا کہ اب اُسے زنجیر سے باندھ دیا جائے۔لیکن زنجیر خریدنے کی

فرصت نہ ملی۔ جب یہ ارادہ لے کر نکلتا تھا، کوئی دوسرا کام آپڑتا تھا۔ پچھلے ہفتے میری بیوی یکا یک غائب ہوگئی۔ دو دن تو میں اُسے ادھر اُدھر تلاش کرتا رہا۔ پھر یکبارگی اصل بات سمجھ میں آ گئی۔ صرف دو جوتیاں اُس بیچاری کی یادگار رہ گئی تھیں۔ انھیں تابوت میں رکھ کر قبرستان پہنچایا۔ جے گولڈ ساتھ ساتھ تھا۔ اُسے موئی مٹی کی یادگار سمجھ اُس کے گلے میں پھولوں کی ہار ڈالے گئے تھے کہ لوگ جنازہ دیکھ کر کہتے تھے کہ ہم نے کبھی ایسا دل خراش منظر نہیں دیکھا۔"

یہ کہہ کر اُس بیچارے نے ایک آہ سرد کھینچی۔

سرکس والے نے کہا۔ "میں سمجھ گیا تم اُسے کیوں بیچ ڈالنا چاہتے ہو۔"

"بیچنا چاہتا بھی ہوں اور نہیں بھی چاہتا۔ اُس کے ساتھ بہت یادگاریں وابستہ ہیں۔ اُسے بیچنا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی اپنا خاندانی قبرستان بیچ ڈالے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا ہے کہ مجھے اُس سے جتنا فائدہ اُٹھانا تھا، اُٹھا چکا۔ بیوی کی موت کے بعد اُس کی کوئی ایسی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہاں تو میں آج اُس کا پنجرہ آپ کے ہاں پہنچا دوں گا اور آپ دیکھ کر قیمت کا فیصلہ کر لیجیے گا۔"

☆☆☆

کنہیالال کپور

شہید

جلوس اب مرگھٹ بازار سے گذر رہا تھا۔ یکا یک جلوس کے لیڈر کو جس کی لمبی داڑھی دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا جیسے یہ داڑھی نہیں جھاڑن ہے۔ خیال آیا کہ جلوس ضرورت سے زیادہ خاموش ہے۔ چنانچہ اس نے پوری طاقت سے چلاّ کر کہا۔ ''تحریکِ خباثت'' ہجوم نے یک زبان ہوکر نعرہ لگایا ''زندہ باد''

''مہرومرّ وت''۔

''مردہ باد''۔

''ہم کیا چاہتے ہیں۔''

''فتنہ وفساد۔''

لیڈر کو یقین ہو گیا کہ ہجوم میں زندگی کے کافی آثار ہیں اور جلوس بازار میں سے گذرتا ہوا گرگٹ روڈ کی طرف بڑھنے لگا۔

ماتا دین اس جلوس کا نفرت روڈ سے تعاقب کر رہا تھا۔ اس کے کپڑے غلیظ، بال بڑھے ہوئے اور نگاہیں گرسنہ تھیں۔ پچاسویں بار اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے دائیں بائیں چلنے والے افراد کی جیبوں کی طرف نگاہ دوڑائی اور پچاسیوں بار اسے مایوسی ہوئی وہ دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کسی شخص کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ پھوٹی کوڑی تو خیر بہت بڑی بات تھی۔ یہاں تو ایسے لوگ بھی تھے جن کے جسم پر پھٹی ہوئی قمیص تک نہ تھی۔ ماتا دین کو ان لوگوں پر بے حد غصہ آیا اور اس نے زیرِ لب انھیں دو ایک موٹی موٹی گالیاں دیں۔ اس کا جی چاہا کہ جلوس کے لیڈر کی لمبی داڑھی پکڑ کر اس سے کہے ''تحریک خباثت! خوب!! لیکن یہ کہاں کی خباثت ہے کہ کسی شخص کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں کہ

ایک فاقہ کش جیب کترا جیب کاٹ کر کھانا کھا سکے۔''

آج ماتا دین کا تیسرا فاقہ تھا۔ بھوک کی شدت سے وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا اور ہر قدم پر اسے یوں محسوس ہوتا تھا گویا ابھی لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑے گا۔ لیکن اتنے بڑے جلوس میں لڑکھڑانا تو محال تھا۔ اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں اتنی سخت بھیڑ تھی کہ اگر وہ گرنا چاہتا تو بھی شاید نہ گر سکتا۔ اچانک جلوس ایک چوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ آگے ٹریفک کا رش تھا۔ جلوس کے افراد آپس میں طرح طرح کی چہ می گوئیاں کرنے لگے۔ کسی نے کہا ''سکریٹریٹ اب نزدیک ہے۔'' کسی نے کہا ''آج پولیس مداخلت نہیں کر رہی ہے۔'' ماتا دین نے اپنے دائیں کھڑے ہوئے شخص کی جیب کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ باریک ململ میں سے اسے دو ایک روپہلی سکّے جھانکتے نظر آئے۔ اس کے خشک لبوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس شخص کے اور قریب سرک کر مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے ایک آدھ بار اس شخص کی آنکھ بچا کر اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھانے کی کوشش کی لیکن اسے جیب کاٹنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ دو چار منٹ وہ شش و پنج میں پڑا رہا۔ آخر اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک بار اور کوشش کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس شخص کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا ''کیوں جی یہ جلوس اب چلے گا بھی یا نہیں؟'' اس سے پیشتر کہ وہ شخص اسے جواب دیتا کسی نے پیچھے سے آ کر اس کی پیٹھ پر دو ہتڑ مارتے ہوئے کہا ''ارے میرے چاند تو اس مجمع میں کیا کر رہا ہے۔'' ماتا دین نے مڑ کر دیکھا آواز اس کے ہم پیشہ کلو شیخ کی تھی۔ ماتا دین نے اسے آنکھ مارتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیکن کلو شیخ خاموش رہنے والا انسان نہ تھا۔ اس نے ماتا دین کا ہاتھ دباتے ہوئے آہستہ سے اس کے کان میں کہا ''دیکھ بیٹا یہ بات ٹھیک نہیں جلوس میری قوم کے لوگوں کا ہے تم یہاں......'' ماتا دین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسی سرگوشی کے انداز میں جواب دیا ''ناراض مت ہو یار آدھا حصہ تمہارا رہا'' خلاف معمول کلو شیخ نے زندگی میں پہلی بار اپنے ہم پیشہ کی بات مان لی۔ جلوس کے لیڈر نے ایک بار پھر ایک پُر جوش نعرہ لگایا اور جلوس سکریٹریٹ کی طرف روانہ ہوا۔ کلو شیخ اور ماتا دین ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

سکریٹریٹ پہنچنے سے پہلے جلوس کو ایک تنگ گلی سے گذرنا تھا۔ جس کے باہر پولیس نے

ہجوم کو روکنے کا مکمل انتظار کر رکھا تھا۔ جیسے ہی جلوس اس گلی کے آخری حصے میں پہنچا۔ ایک مجسٹریٹ نے جو گھوڑے پر سوار تھا، اسے منتشر ہو جانے کا حکم دیا۔ ہجوم نے لیڈر کی طرف دیکھا۔ لیڈر نے مجسٹریٹ کے حکم کی پروانہ کرتے ہوئے یکے بعد دیگر چار پانچ نعرے لگوانے کے بعد جلوس کو آگے بڑھنے کے لیے کہا۔ مجسٹریٹ نے آخری تنبیہ کی۔ لیکن ہجوم پر اس کا چنداں اثر نہیں ہوا۔ آخر جب ہجوم نے پولیس پر پتھراؤ کرنا شروع کر دیا تو مجسٹریٹ نے پولیس کو لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ بہت سے لوگ الٹے پاؤں تنگ گلی کی طرف دوڑے۔ لیکن گلی تنگ تھی اور ہجوم بے پناہ۔ اس بھگدڑ میں بوڑھے اور بچے روندے گئے۔ درجنوں آدمیوں کو چوٹیں آئیں ماتا دین نے بھاگتے وقت پٹخنی کھائی اور زمین پر آرہا۔ پولیس اب گلی میں آ پہنچی تھی اور لوگ سخت گھبراہٹ کے عالم میں بھاگ رہے تھے۔ ہجوم کا ایک ریلا ماتا دین کے اوپر سے گذرتا ہوا گلی میں واقع ایک مسجد میں جا گھسا۔ اتنے میں پولیس افسر نے سیٹی بجائی۔ چند لوگ سکریٹریٹ کے دفتر میں بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھیں گرفتار کرنا تھا۔ پولیس کے سپاہی سیٹی کی آواز سن کر تنگ گلی سے باہر کی طرف دوڑے۔

پولیس کے چلے جانے کے بعد جب لوگوں کے اوسان ٹھکانے ہوئے تو انھوں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ چند بچے ڈر کے مارے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ انھیں اُٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لیے کہا۔ کچھ بوڑھے زخمی ہو گئے تھے۔ ان کی مرہم پٹی کی گئی۔ ماتا دین کو بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر مسجد میں لایا گیا۔ اس کے منہ پر سرد پانی کے چھینٹے دیئے گئے اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار ہونے کے لیے کہا گیا۔ لیکن ماتا دین بے حس و حرکت زمین پر پڑا رہا یکا یک کسی کو خیال آیا کہ اس کی نبض ٹٹولی جائے اس نے ماتا دین کی نبض پر ہاتھ رکھا اور تعجب اور افسوس کے ملے جلے لہجے میں کہا "ارے یار یہ تو ختم ہو گیا۔" ایک پنواڑی نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"جبھی تو میں سوچوں کہ سالا اُٹھے کیوں نہیں۔"

ماتا دین کی وفات کی خبر فوراً تحریک خباثت کے دفتر میں پہنچائی گئی۔ آناً فاناً مسجد میں ہزاروں لوگوں کا جمگھٹا ہو گیا۔ تحریک کے بڑے بڑے لیڈر موٹروں میں سوار ہو کر مسجد میں پہنچ گئے۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے "یہ کون شخص تھا؟" "کہاں کا رہنے والا تھا؟ کیا وہ تحریک

کا باقاعدہ ممبر تھا۔ ہمدرد تھا۔ حامی تھا۔'' تحریک خباثت کے کسی لیڈر کو اس شخص کا اتا پتا معلوم نہ تھا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ اس کا نام ماتا دین ہے کیونکہ یہ نام اس کے بازو پر لکھا ہوا پڑھا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے اتفاق رائے سے ماتا دین کو ''شہید'' کا خطاب دیا اور اعلان کیا کہ مرحوم کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکالا جائے۔ تحریک کے اخبارات کو ہدایات بھیجی گئیں کہ مرحوم کی شہادت کا ذکر خاص اہتمام سے کیا جائے۔ اخباروں نے دھڑا دھڑ ضمیمے شائع کیے۔ جن میں مرحوم کی قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے تحریک خباثت کے پہلے شہید کو خراج تحسین ادا کیا گیا۔

اخبار ابلیس نے لکھا ''غازی ماتا دین تحریک خباثت کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ قومی خدمت کا جذبہ آپ کو وراثت میں ملا تھا۔ آپ کے دادا جان تحریک خباثت کے ایک زبردست ستون تھے مرحوم کی وفات سے ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔''

اخبار حقارت نے لکھا ''ہمیں مرحوم کی رفاقت کا فخر حاصل تھا۔ آپ نہایت شریف الطبع انسان تھے۔ اگر انھیں فرشتہ سیرت کہا جائے تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ کی زندگی بنی نوع آدم کی بھلائی کے لیے وقف تھی۔ آپ کی وفات سے ہمیں ذاتی طور پر سخت صدمہ پہنچا ہے۔''

مرحوم ماتا دین کے جنازے کے جلوس میں تقریباً ایک لاکھ افراد شامل ہوئے اور قبرستان تک فضا ''شہید ماتا دین زندہ باد'' ''تحریک خباثت زندہ باد'' کے نعروں سے گونجتی رہی۔ مرحوم کو دفنانے کے بعد ایک ماتمی جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے تحریک خباثت کے صدر نے کہا ''حضرات! ہم ایک بہت بڑے شہید کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔ شہید ماتا دین نے اپنی بے مثال شہادت سے ثابت کر دیا ہے کہ تحریک خباثت میں ایسے سرفروش موجود ہیں جو وقت آنے پر جی سے گذر جاتے ہیں۔ لیکن تحریک کا جھنڈا سرنگوں ہونے نہیں دیتے۔ (تالیاں) مرحوم پولیس کے ظالمانہ لاٹھی چارج کے شکار ہوئے (شیم شیم) انھیں چھاتی اور سر پر چھ گہرے زخم آئے۔ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن افسوس وہ جانبر نہ ہو سکے۔ مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی قربانیوں کی یاد مدتوں تک ہمارے دلوں کو گرماتی رہے گی۔ جس خلوص اور نیک نیتی سے انھوں نے تحریک خباثت کی خدمت کی وہ آپ سب پر عیاں ہے اگر میں یہ کہوں کہ انھوں نے اپنے لہو

سے ہماری تحریک کو پہنچا تو میں حق بجانب ہوں گا۔ مرحوم کے پیش نظر ہمیشہ ایک نصب العین تھا وہ چاہتے تھے کہ قوم کے ہر فرد کی مدد کی جائے اور جہاں تک ہو سکے اس پسماندہ قوم کا دامن موتیوں سے بھر دیا جائے۔" (تالیاں)

ہجوم نے جوش سے بے قابو ہو کر "شہید ماتا دین زندہ باد" کے نعرے لگائے اور صدر کی تقریر کا باقی حصہ اس شوروغل میں سنا نہ جا سکا۔

دور ایک کونے میں کلو شیخ نے ایک شخص کی جیب کاٹتے ہوئے زیر لب مسکرا کر کہا "سالا شہید کہیں کا۔"

☆☆☆

شوکت تھانوی

رضائی

جاڑے کا سفر۔ سائیں سائیں کرنے والی رات میں شائیں شائیں کرنے والی ٹرین میں شریکِ سفر بھی کون؟ زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام..... مگر نہیں ٹھہرئے تو سہی نام کا بھلا ہم کو کیا پتہ؟ نام تو نام صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ البتہ اتنا معلوم تھا کہ حسین ہے اور بے حد حسین۔ اس کی دلفریبی کی قسم بغیر دیکھے ہوئے اسی طرح کھا سکتے تھے۔ جس طرح بغیر خدا کو دیکھے ہوئے، سچی تو سچی جھوٹی قسمیں بھی جب جی چاہے کھا سکتے ہیں۔ ارغوانی رضائی جس پر کامدانی کے ستارے بکھرے ہوئے تھے، اس پیکر ناز کے حسن کو چھپا چھپا کر چمکا رہی تھی۔ یہ رضائی لکھنؤ کی بنی ہوئی تھی اس لیے کہ رضائی میں کامدانی بنانے کا سلیقہ اور سلیقہ سے زیادہ فرصت بھلا کسی شہر کو کہاں نصیب؟ کامنی گوٹ میں سلمیٰ ستارے کا وہ کام دیکھنے والوں کی نظروں کو چھکائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قسمت ہو تو ایسی کہ مقابل والی سیٹ پر ہم کو بھی نہایت کشادہ جگہ مل گئی۔ صرف ایک مسافر کونے میں سکڑا ہوا بیٹھا تھا جس کے پاس اوڑھنے کو کچھ نہ تھا دھوتی کا پینچ کھول کر پیروں پر ڈال لیا تھا تاکہ دل کو یہ سمجھا سکے کہ ہم بھی کچھ اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس شخص کو بیٹھنا ہی چاہئے تھا۔ اس لیے کہ اگر لیٹ جاتا تو واقعی سردی لگ جاتی۔ سردی تو خیر اب بھی لگ رہی ہوگی مگر جتنی لگنا چاہئے اتنی نہ لگ رہی ہوگی۔ بہر حال اس شخص کے متعلق غور کرنے کی فرصت ہی کسے تھی۔ ہولڈال کو کھول کر سیٹ پر اپنا قبضہ جمالیا اور غور کرنے لگے کہ آج کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔

ذرا غور تو کیجئے ایک حسین عورت تن تنہا اور پھر لمبا سفر۔ لمبے سفر کا اندازہ سونے کے انداز سے ہو رہا تھا۔ کیسی بے فکری کی نیند تھی۔ واقعی جوانی سو رہی تھی۔ سچ مچ حسن حفاظت کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس وقت کہیں سے ایک ستار مل جائے اور خواب ناز سے متعلق جتنی ٹھمریاں، دادرے یا غزلوں کے اشعار ہم کو یاد ہیں سب گا کر رکھ دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روح

گنگنا رہی ہے اور ہم جھوم رہے ہیں۔ یا ہم جھوم رہے ہیں، اور ہم ہی گنگنا رہے ہیں یا روح جھوم رہی ہے اور ہم گنگنا رہے ہیں۔ بہر حال جھومنا اور گنگنانا تو بالکل یقینی تھا۔ البتہ تقسیم کار کا صحیح اندازہ اس وقت آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے اسی عالم جذب وشکر میں اپنے ہولڈال کو بہت قرینہ سے سیٹ پر لگا دیا۔ قرینہ سے مطلب یہ کہ ریشمی سوزنی جو پہلے سب سے نیچے رکھی ہوئی تھی تا کہ سفر میں خراب نہ ہو، سب سے اوپر بچھا دی تا کہ جب وہ اپنی دلفریب رضائی کا ایک گوشہ اُٹھا کر اپنے ہوشربا مکھڑے کو بے نقاب کریں تو بستر کی کم حیثیتی سے ہمارے متعلق کوئی ایسی رائے قائم نہ کریں کہ ہم کو اس رائے کے تبدیل کرانے میں خواہ مخواہ کچھ وقت صرف کرنا پڑے۔ پھولدار تکیہ اوپر اور سادہ نیچے رکھ لیا۔ ولایتی کمبل نکال کر سودیشی کمبل ہولڈال کی جیب میں رکھ دیا۔ ارادہ تھا کہ بس یہی کپڑے پہنے ہوئے لیٹ جائیں گے مگر اب یہ رائے تبدیل کر دی۔ شب خوابی کے ریشمی سوٹ کی ضرورت نہایت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی ورنہ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہتیں اپنے دل میں کہ عجیب جانگو ہے جس کے سونے اور جاگنے کا ایک ہی لباس ہوتا ہے۔ ہائے اس وقت ڈریس گون نہ ہوا وہ اونی نہ سہی ریشمی سہی مگر کچھ تو بہار دے ہی جاتا۔ بہر حال لیٹ گئے۔ رضائی کی طرف ہمہ تن متوجہ اور رضائی ہٹنے کے ہمہ تن منتظر۔

اس کا حسین ہونا تو خیر طے تھا کاش حسن کے ساتھ ہی ساتھ نا کتخدا بھی ہوتا کہ...... تا کہ...... مگر خیر یہ بات تو بہت قبل از وقت ہے معلوم نہیں اس کے والدین اس نسبت کو منظور بھی کریں گے یا نہیں لیکن ایک بات ہے کہ والدین کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ اس قدر آزاد خیال ہے کہ تنہا سفر کر رہی ہے اور نا کتخدا بھی اس لیے ہے کہ نہ تو کوئی بچہ ہے نہ بچے کا باپ۔ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ اگر اس حسینہ کی خدانخواستہ شادی ہو چکی ہوتی تو ایسی حسین بیوی کو تنہا سفر کرنے کی اجازت مشکل ہی سے کوئی شوہر دے سکتا تھا تو گویا اس کی شادی نہیں ہوئی ہے مگر ایک مصیبت یہ بھی تو تھی کہ ہماری شادی ہو چکی تھی۔ مگر سنئے تو سہی اگر ہو بھی چکی تھی تو کیا؟ اوّل تو اس بیچاری کو اس کی خبر ہی کیونکر ہو سکتی ہے اور خبر ہو بھی تو دوسری شادی کوئی گناہ تو ہے نہیں۔ شفقت ماموں نے دوسری شادی کی تھی، پہلی بیوی میکے میں رہتی تھیں اور دوسری بنگلہ میں۔ ان کو عدالت کی مقرّر کی ہوئی رقم دی جاتی تھی اور ان کو سب کچھ۔ ان کے

بچوں کے بھی یہی باپ تھے اور ان کے بچوں کے بھی۔ مگر صاحب یہ دھوتی اوڑھنے والا اور سردی میں سکڑنے والا مسافر بھی عجیب بے حس تھا یعنی اس کو سونے اور سردی کھانے کے علاوہ گویا اس کی خبر ہی نہ تھی کہ عین اس کے سامنے ہی ایک فتنہ بیدار ہے اور فتنہ گر محوِ خواب ہے، حالانکہ از روئے قاعدہ اس بے بستر مسافر کو ہم سے زیادہ خوش نصیب ہونا چاہئے تھا اس لیے کہ یہ پہلے ہی سے ان کا ہم سفر تھا۔ جن کے شریک سفر ہونے کی سعادت ہم کو اب حاصل ہوئی تھی اور قرینہ یہ بتا رہا تھا کہ یہی سفر ہمارا حاصل زندگی بن کر رہے گا۔ لیٹے لیٹے ایک دم سے خیال آیا کہ یہ جو ہم سگریٹ پی رہے ہیں اس کا درجہ بیڑی سے کچھ یونہی سا بلند ہے اور سب سے بڑا نقص اس کمبخت سگریٹ میں یہ ہوتا ہے کہ ناظرین کو اس بات کا اندازہ کرایا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ سگریٹ ایک آنہ پیکٹ والا نہیں بلکہ ڈھائی روپیہ ڈبے والا ہے۔ اس کی لے دے کر بس یہی ایک ترکیب ہے کہ سگریٹ لبوں میں دبا کر اس کا ڈبہ آدمی اپنے ہاتھ میں لیے رہے۔ سگریٹ ایک سرے سے نہ پینا بھی اپنے کو بے وقوف ثابت کرانے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہایت آسانی سے یہ سوچ سکتی تھیں کہ جس شخص میں اب تک سگریٹ پینے تک کا بلوغ نہ پیدا ہوا ہو اس میں ایک عورت کی پذیرائی کا شعور کیونکر ممکن ہے۔ یاد آیا کہ اٹیچی میں پائپ رکھا ہوا ہے۔ ایک دم اچھل پڑے۔ طبیعت باغ باغ ہوگئی بلکہ پسلی پھڑک اٹھی نگہ انتخاب کی۔ واقعی پائپ اس قسم کے مواقع کے لیے نہایت آزمودہ چیز ہے۔ پائپ پینے والے کی طرف تو عورت اس طرح کشاں کشاں آتی ہے جس طرح خیر اس وقت کوئی تشبیہ یاد نہیں آرہی ہے بہر حال عورت پائپ کی طرف کھنچتی ضرور ہے۔ ہم نے بستر سے اٹھ کر فوراً اٹیچی میں سے پائپ نکالا۔ تمباکو کا ڈبہ برآمد کیا اور اپنے حسین شکار کے لیے پائپ سے مسلح ہو کر پھر لیٹ گئے۔

معلوم نہیں اس قسم کے امتحانی مواقع پر سب کا دماغ اس قدر حاضر ہو جاتا ہے یا قدرت نے یہ خصوصیت ہم ہی کو عطا کی ہے کہ بلا کی سوجھ بوجھ ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر فوراً پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً اس وقت ہم کو خیال آیا کہ ہم روشنی کے رخ پر لیٹے ہوئے نہیں ہیں اور ہمارے چہرے پر اندھیرا ہے اگر ہم اس رخ کو بدل دیں یعنی تکیے اس طرف رکھ دیں جدھر فی الحال پائنتی ہے تو چہرے پر روشنی پڑنے لگے گی اور دیکھنے والے کو رنگ نکھرا ہوا نظر آئے گا۔ یاد رکھئے کہ بجلی کی

روشنی رنگ کے نکھار کے لیے نہایت مجرب تسلیم کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ یہ سانولا سلونا رنگ ہوتا ہے تا اس کو اگر اندھیرے میں رکھا جائے تو چہرہ کا نمک کالا نمک نظر آتا اور بلا وجہ انسان کو سیاہ فام ہونے کی ندامت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ موقع اس قسم کی ندامت کا نہ تھا۔ ہم نے فوراً ہولڈال کا رخ بدل دیا اور رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگے کہ دیکھیں اب اُدھر جاتا ہے پروانہ یا اِدھر آتا ہے۔

مگر صاحب قیامت کی جوان اور الھڑ الھڑ جوان نیند تھی کہ کروٹ تک بدلنے کا ہوش نہ تھا۔ ٹرین کی جنبشوں سے رضائی کے ریشم میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہو رہی تھیں اور ان لہروں کی وجہ سے کامدانی اور بھی جگمگ جگمگ ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی لالہ زار میں کسی بہت بڑے سرمایہ دار جگنو کی برات آئی ہوئی ہے۔ یا بحیرۂ احمر میں ایک دم سے تمام ستارے غسل کرنے کے لیے اتر آئے ہیں۔ مختصر یہ کہ رضائی جاگ رہی تھی اور رضائی والی تھی کہ کسی طرح جاگنے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور یہاں دماغ تھا کہ اس کے جاگنے کے بعد پیش آنے والے واقعات کے تصوروں کا گویا میلہ لگائے ہوئے تھا۔ تقریب ملاقات کی بیشمار تجویزیں ذہن میں آ کر رد ہو رہی تھیں۔ تعارفی مکالمے کے ریہرسل پر ریہرسل دل ہی دل میں ہو رہے تھے اپنے سوالات کے ساتھ ان کے جوابات بھی ذہنِ رسا خود ہی دے رہا تھا کہ ہم ان سے کہیں گے۔

''معاف کیجئے گا غالباً دو بجے ہوں گے۔''

وہ: ''جی ہاں شاید چار ابھی نہیں بجے۔''

ہم: ''تو کیا آپ بھی بھوپال تشریف لے جا رہی ہیں؟''

ہم: ''جی ہاں، تو کیا آپ بھی بھوپال ہی جا رہے ہیں؟''

وہ: ''جی ہاں بھوپال۔ مجھ کو وہاں کی ایک ادبی انجمن کے سالانہ اجلاس کی ایک نشست کی صدارت کرنا ہے۔''

وہ: ''جناب کا اسم مبارک؟''

ہم: ''مجھے کاشف الکلامی الہاپڑی کہتے ہیں۔ روزنامہ غروب کا مدیرِ اعلیٰ ہوں۔''

وہ: ''اوہ آپ ہی کاشف صاحب ہیں۔ میں نے تو آپ کا نام اکثر سنا ہے۔ آپ کی کتاب

''شکورونصیبن'' میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔''

ہم: ''جو الفاظ میرے جوف دماغ میں محدود تخیل تھے وہ آپ نے ارشاد فرما دئے۔ اب میں اپنے جذبۂ مسرت کو معذورِ تکلم پاتا ہوں اور زبانِ بے زبانی ہی کو ترجمانی کا ذریعہ بناتا ہوں۔''

وہ: ''ماشاءاللہ صرف قلم ہی میں جادو نہیں بلکہ گفتگو میں بھی وہی تحریر والا سحر موجود ہے۔''

ہم: ''میں دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ کا......یعنی......اسم......''

وہ: ''جی میرا نام ناہید درخشاں ہے میرے والد خان بہادر طغرل خاں کا نام آپ نے سنا ہوگا۔''

ہم: ''اچھا......اچھا......اور آپ کے......''

وہ: ''جی نہیں بس اور میرے کچھ نہیں۔ میں ابھی۔''

رضائی میں یکا یک جنبش ہوئی اور یہاں ہمارا ایہرسل ختم۔ بالوں پر ایک ہاتھ پھیر کر دل ہی دل میں کہا آخر آمدز پش پردہ تقدیر پدید۔ مگر وہ جنبش کامدانی کے ستاروں کو جگمگا کر رہ گئی۔ ایک لہر سی آئی اور پھر سطح پر سکون طاری ہوگیا۔ مگر یہ اچھا ہی ہوا اس لیے کہ ایک نہایت شدید غلطی کا فوراً احساس ہم کو ہوا کہ ہم نے یہ کیا غضب کیا تھا کہ سر پر ہاتھ پھیر کر بالوں کو درست کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ بات ہم کو پہلے سے معلوم تھی کہ خواتین عام طور پر بنے سنورے بالوں کو پسند نہیں کرتیں بلکہ وہ مرد کے بالوں میں ایک مستقل ژولیدگی دیکھنا چاہتی ہیں۔ روکھے روکھے سے بال تھوڑے سے الجھاؤ کے ساتھ اگر کسی مرد کے سر پر ہوں تو عورتیں اس کو آسانی کے ساتھ ادبی قسم کا آدمی سمجھ لیا کرتی ہیں اور بنے ہوئے بالوں والے مرد کے متعلق تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کسی تھیٹر کا ایکٹر ہے یا کسی دفتر کا بابو۔ دوسرے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ الجھے ہوئے نیم پریشاں بالوں کے ساتھ پائپ بھی خوب سجتا ہے اور اس سے آدمی کے مفکر ہونے کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہم نے بالوں پر دو ہاتھ بے ترتیبی سے ادھر ادھر پھیر کر ان کو منتشر کردیا اس طرح دل پر سے یہ بوجھ اُتر گیا کہ اب کم سے کم خوبصورت بلا کے ہیرو نظر آئیں گے اور نہ حاکم پرگنہ کے اہل مد اور نہ کسی کے اہل خانہ۔

دماغ تو ان احتیاطوں میں مصروف تھا کہ رضائی والے سربستہ راز کی مستقل طور پر کھوج تھی۔ تو کیا واقعی اس کا نام ناہید درخشاں ہوگا؟ بہر حال ناہید درخشاں نہ سہی، طاؤس رقصاں سہی، مہ کنعاں سہی مگر ہوگا یقیناً کوئی نہایت ہی ادبی قسم کا کھنکتا ہوا نام اور اس نام سے پہلے جب اس میں ''آنسہ'' لگا دیا جائے تو واقعی یہی معلوم ہوگا کہ کامدانی پڑی ہوئی ارغوانی رضائی میں کامدار کامنی گوٹ لگا دی گئی ہے۔ اس قسم کی شریک زندگی ایک شوہر کو کس قدر بلند کرسکتی ہے۔ اس کا اندازہ ہر ایک نہیں کرسکتا۔ حد یہ ہے کہ وہ شریک سفر دھوتی اوڑھنے اور سردی کھانے والا مسافر بھی نہیں کرسکتا جو جمال ہمنشیں کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود محروم تھا۔ دراصل یہ لوگ آدمی تھوڑی ہوتے ہیں چوپائے ہوتے ہیں۔ مگر اس وقت ہمارا مستقبل ہمارے پیش نظر تھا۔ چمکتا ہوا جگمگاتا ہوا معطر معطر، لطیف لطیف، حسین حسین۔ بات یہ ہے کہ زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی شرمندگی میں گذر گیا ہے کہ کوئی تقریب ہو، کوئی اجتماع ہو کوئی محفل ہو ہم اپنی اہل خانہ کو ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ سب اپنی اپنی بیویوں کو چمکاتے ہوئے اور خود چمکتے ہوئے آتے ہیں اور ہم ''واحد حاضر'' بنے ہوئے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ نہ ہوتی بیوی تو کوئی غم نہ تھا مگر بیوی موجود اور ہم تنہا خلوت آباد جلوت ویران۔ گھر میں عیالدار باہر بے وارثے، بات یہ ہے کہ ڈرتے ہیں کہ کہیں غلط ساری باندھ کر پہنچ جائیں، کوئی بھونڈی بات نہ کہہ دیں، سر کے بال گنواروں کی طرح کے نہ سمجھ لیے جائیں۔ ساری، جمپر، جوتے اور موزے کے رنگوں کا توازن اور تناسب مضحکہ خیز نہ ہو جائے۔ یہ تمام اندیشے محض اس لیے ہیں کہ بیگم صاحبہ کی تربیت بحیثیت ایک ''بٹیا'' کے ہوئی ہے بحیثیت ''مس بابا'' کے نہیں ہوئی ہے۔ اسکول اور کالج میں پڑھی ہوئی نہیں ہیں۔ ایسی بیوی کو محفل میں لے جانا کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں۔ مگر اب انشاءاللہ العزیز یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ اب ہم بھی سوسائٹی میں بیوی کا فر والا کوٹ اپنے کندھوں پر ڈال کر احباب سے سرخروئی کے ساتھ بات کرسکیں گے اور اب ہماری مسز کے بھی نقرئی طلائی اور گنگا جمنی قہقہے پارٹیوں کے سبزہ زاروں پر زمزمے برساتے اور رقص کرتے نظر آئیں گے۔ ہمارے منہ میں سگار ہے ہاتھ پتلون کی جیب میں اور ٹہل رہے ہیں۔ وہ ایک حسین تیتری کی طرح اس صوفے سے اس صوفہ پر اور اس صوفے سے اس صوفہ پر اُڑتی نظر

آ رہی ہیں۔ ہائے کیا زندگی ہوگی۔ سوچتے سوچتے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل خود بخود گنگنانے لگا۔

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

یکا یک رضائی میں پھر جنبش ہوئی۔ ستارے جھلملائے۔ نظریں بھٹکیں اور ریشم کے اس چھوٹے سے سمندر میں ہلکا سا طوفان آیا اور معلوم ہوا کہ ان کو کچھ زیادہ سردی لگ رہی ہے اس لیے کہ پیر کچھ سکڑ گئے تھے اور رضائی کے نیچے جسم کچھ سمٹا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ دل نے فوراً ایک لاجواب تدبیر بجھائی۔ دماغ نے تائید کی اور ہم ایک دم بستر سے نکل کر ٹرین کے فرش پر کھڑے ہو گئے۔ ولایتی کمبل اُٹھا کر اس زرکار رضائی پر آہستہ سے ڈال دیا۔ دیکھئے اس کو کہتے ہیں سوجھ بوجھ۔ گویا وہ سوتی ہی رہیں اور ہم نے اپنا جادو جگا لیا۔ اب جب وہ بیدار ہوں گی اور اپنے اوپر اس کمبل کو دیکھیں گی تو ان کے سوالیہ نشان بنے ہوئے حسین چہرہ کے سامنے ہمارا صرف مسکرا دینا کافی ہوگا اور اس مسکراہٹ پر ان کی وہ محجوب شکر گذاری اور ہماری شرافت کا وہ خاموش اعتراف بجائے خود نہایت لاجواب قسم کا تعارف ہوگا۔ اس قسم کے تعارف میں عدم واقفیت والی بیگانگی اور تکلف بالکل نہیں ہوتا بلکہ دراصل تعارف تو پہلے ہی حاصل ہو چکتا ہے کچھ یوں ہی سی خانہ پری باقی رہ جاتی ہے۔ مقصد تو یہ ہے کہ ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے کا ذریعہ چونکہ رسمی تعارف نہ ہو سکتا تھا لہٰذا منجانب اللہ یہ ترکیب ذہن میں آ گئی اور ہم خوش ہو کر گنگنانے لگے۔

ہائے اس اون کے کمبل کی یہ قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو محبوب کی سردی کھونا

ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی شاید کوئی اسٹیشن قریب تھا۔ چند ہچکولے کھانے کے بعد ٹرین ٹھہر گئی اور ٹرین کے ٹھہرتے ہی ہمارے ہی ڈبہ میں مسافروں کا وہ سیلاب آیا ہے کہ الٰہی تو بہ گٹھری نما پگڑ باندھے ہوئے درجنوں لٹھ بند، گھونگھٹ نکالے ہوئے، بچوں کو چمٹائے ہوئے بیسیوں عورتیں اور پھر ان سب کا سامان بستر پوٹلے، پوٹلیاں، مختلف قسم کی ترکاریوں کے جھابے، برتنوں کی بوریاں، گھی کے پیپے، حقے، ٹوکرے، ٹوکریاں ایک آفت ہی تو آ گئی۔ کسی نے کسی کے سر پر قدم رنجہ فرمایا تو کسی کا لے پالک، بن کر گود میں بیٹھ گیا۔ کوئی کسی سے ہاتھا پائی

میں مصروف ہو گیا اور کسی نے محض مباحثہ کافی سمجھا۔ خود ہمارے بستر پر ایک محترمہ ایک گز کا گھونگھٹ نکالے اپنے لختِ جگر کو کلیجہ سے لگائے دودھ پلا رہی تھیں اور ان کے دوسرے صاحبزادے ہمارے پھول دار تکیہ پر بیٹھے اپنے والد بزرگوار کو بھی وہیں بیٹھ جانے کی تاکید فرما رہے تھے۔ مگر خود ہم اپنے بستر کی طرف سے بے فکر رضائی والی کا سپر بنے کھڑے تھے کہ کوئی ان کے خوابِ ناز میں مخل نہ ہو۔ مگر آخر کب تک؟ جب لوگوں کو کہیں جگہ نہ ملی تو ادھر بھی متوجہ ہوئے اور ہم نے ایک گنوار کو ڈھکیلتے ہوئے کہا:

"آنکھیں ہیں منہ پر یا نہیں دیکھ رہے ہو کہ ایک عورت لیٹی ہے اور گھسے پڑتے ہو۔"

"لیٹی ہیں تو اُٹھا کے بٹھاؤ نا ان کو بابو جی۔ ہم آخر کہا بیٹھیں گے؟ کلوا کی ماں بیٹھ ادھر تو۔"

"نہیں یہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔"

"بیٹھ کیسے نہیں سکتا ہم نے بھی ٹکٹ لیا ہے۔"

"نہیں مانو گے تم۔ ارے بھائی کہیں اور بیٹھ جاؤ۔ میرے بستر پر بیٹھ جاؤ۔"

رضائی کو پھر جنبش ہوئی، کمبل کھسکا، تارے جگمگائے اور "استغفر اللہ" کہتے ہوئے ایک بزرگ رضائی سے برآمد ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم نے مسافروں سے لڑتے لڑتے ان بزرگ محترم کو دیکھا۔ اگر گاڑی کھڑی نہ ہوتی تو شاید زنجیر کھینچ لینے کو دل چاہتا۔ مگر اب اس بوڑھی گھوڑی کی وہ لال لگام دیکھ رہے تھے جس پر کامدانی کا ہر تارہ معلوم نہیں رو رہا تھا یا ہنس رہا تھا۔ دھوتی اوڑھنے والا مسافر اب تک بیٹھا ہوا سو رہا تھا اور کمبل کے باوجود ہماری نیند غائب تھی۔

☆☆☆

کرشن چندر

مینڈک کی گرفتاری

مدت کے بعد آج جھیل کے کنارے پر بھی خوشیوں بھری رات آئی تھی۔ گو ادھر دیکھنے والے کو بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ بہت سے مینڈک جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے ٹرا رہے ہیں لیکن یہ حقیقت نہ تھی۔ آج دراصل بڑا مینڈک بڑے محل سے چھوٹ کر آیا تھا اس لئے اس کی بیوی پکھراج نے اور اُس کے تین بیٹوں ٹمپو، جمپو اور پھونپو نے جھیل کے سارے مینڈکوں کی ضیافت کی تھی۔ اس دعوت پر دُور دُور سے مینڈک آئے تھے۔ کیچڑ میں بسیرا کرنے والے مینڈک اور جھیل کے کنارے جھاڑیوں میں رہنے والے مینڈک، سبھی طرح کے مینڈک آئے تھے اور اُچھل اُچھل کر بڑے مینڈک سے، جس کا نام زرد پوش تھا، گلے مل رہے تھے۔ پکھراج نے بڑی جھاڑی کی ایک شاخ سے جگنوؤں کی ایک لالٹین لٹکا رکھی تھی جس کی ٹھنڈی روشنی میں اس کا نیلگوں چہرہ مسرت سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔

دعوت کے بعد سارے مینڈک آلتی پالتی مارے ایک دائرے کی صورت میں زرد پوش کے گرد بیٹھ گئے اور اس سے بڑے محل کی باتیں پوچھنے لگے۔ کیونکہ اب تک کوئی مینڈک اس بڑے محل کے اندر نہیں جا سکا تھا، جو جھیل کے شمالی کنارے پر واقع ہے۔ محل کے باغیچے تک تو بہت سے مینڈک آئے تھے اور اس کی سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر بھی قدم رکھ چکے تھے لیکن اندر جانے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ زرد پوش پہلا مینڈک تھا جو محل کے اندر جا کر واپس آ گیا۔ اس لئے ہر مینڈک کو اس بات میں دلچسپی تھی کہ بڑے محل کے اندر کیا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے جھیل کے بہت بوڑھے مینڈک، جس کی آواز ہیگل سے ملتی جلتی تھی، سوال کیا۔

"جب تم محل کے اندر گئے تو تم نے کیا دیکھا" ۔ زرد پوش نے کہا۔ "داوا یہ غلط ہے کہ میں خود محل کے

اندر گیا، میں دراصل یونہی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر لیٹا دھوپ سینک رہا تھا کیونکہ دھوپ تیز تھی اور سنگِ مرمر کا فرش ٹھنڈا تھا۔ اس لئے میں آنکھیں بند کیے زندگی کے مزے لے رہا تھا۔ میرے پیٹ میں خنکی کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور میری دوسری کھال گرمی کے مزے لے رہی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ مینڈک قوم زندگی کے دونوں مزے ہی چاہتی ہے، پانی کے اندر اور پانی کے باہر"۔

سبز پوش مینڈک نے اُٹھ کے کہا۔ "تم اپنی فلاسفی نہ چھانٹو سیدھے سیدھے محل کا حال بتاؤ"

زرد پوش نے گھور کر سبز پوش کی طرف دیکھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ دونوں مینڈکوں میں کوئی زیادہ دوستی نہیں تھی۔ زرد پوش جانتا تھا کہ شادی سے پہلے سبز پوش اس کی بیوی پکھراج سے محبت کرتا تھا۔ اس لئے اس نے طنزاً کہا۔ "او! سبزے میں جانتا ہوں تجھے میری باتیں اچھی نہیں معلوم ہوں گی کیونکہ میں پھر سے جھیل کے کنارے واپس آ گیا ہوں۔"

پکھراج نے جگنوؤں کی لالٹین زور سے ہلائی اور جگنو ٹم ٹم کر کے چمکنے لگے۔ اس نے اپنا نیلگوں حسین چہرہ اپنے خاوند کی طرف گھما کے کہا:۔

"پیارے بہت سے بزرگ تمہاری باتیں سُننا چاہتے ہیں تم اس کم بخت سبزے کی پروا نہ کرو۔ اپنی کہانی سناؤ۔" سبزہ اپنے حلق میں ٹرا کے رہ گیا۔ اس کے گلے سے ایک ایسی آہ نکلی جو سُر اور تال کے اعتبار سے اُستاد فیاض خاں کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر پھر اس نے اس آہ کو اپنے سینے میں ہی دبا لیا اور نگاہیں نیچی کر کے بیٹھ گیا۔

زرد پوش نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ میں محل کی سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر لیٹا ہوا دُھوپ سینک رہا تھا اور نیم غنودگی کے عالم میں تھا کہ اتنے میں مجھے معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے اپنی مٹھی میں اُچک لیا۔ میں نے اپنی نیند سے چُندھیائی ہوئی آنکھیں حیرت سے کھولیں تو اپنے آپ کو بڑے محل کے راجہ کے سب سے چھوٹے لڑکے کی مٹھی میں پایا۔ میں جوں جوں اپنے آپ کو اس کی مٹھی سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ شریر لڑکا زور زور سے ہنستا، اس وقت اس کی ایسی ہنسی مجھے بڑی خوفناک معلوم ہوتی اور جب اُس نے زور سے اپنی انگلیاں میری پسلیوں میں کھبوئیں تو میں ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ پھر وہ اپنی مٹھی میں مجھے محل کے اندر لے گیا۔ اس نے میرے جسم کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، لیکن میرا منُھ اس کی مٹھی سے

باہر تھا۔اس لئے میں محل کے دالان، برآمدے، ستون، غلام گردشیں، کھلے وسیع کمرے، قالین سب دیکھ سکتا تھا۔''

''قالین کیا ہوتا ہے''۔ ٹمپو نے پوچھا۔

زرد پوش نے کہا۔'' بیٹے قالین وہ لوگ فرش پر بچھاتے ہیں بڑا نرم اور گدگدا ہوتا ہے۔''

ٹمپو نے پوچھا۔''کیا قالین ہماری جھیل کے کیچڑ سے بھی نرم اور ملائم ہوتا ہے۔''

زرد پوش نے کہا۔''ارے بیٹے یہ وحشی قوم ہماری کیچڑ ایسی نرم قالین سات سو سال میں بھی نہیں بنا سکتی مگر ہاں ویسے قالین بُرا نہیں ہوتا اور مجھے تو اُس کا رنگ بہت پسند آیا۔ ہماری کیچڑ میں تو ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔مگر اُس قالین میں طرح طرح کے رنگ تھے۔جھیل کے پھولوں کی طرح خوش رنگ اور چہکتے ہوئے ہمیں اپنی کیچڑ کا رنگ بہت پسند ہے۔''ایک قدامت پسند بوڑھے مینڈک نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے کہا''خیر اپنی اپنی پسند ہے۔''زرد پوش نے مُسکرا کے کہا''مگر مجھے وہ قالین اور دوسرے بہت سے رنگوں والے قالین بہت پسند آئے مگر یہ تو بعد کی بات ہے میں بتا رہا تھا، کہ جب وہ لڑکا دیوان خانے میں لے گیا۔جہاں ہمت سنگھ اور اس کی سات رانیاں اور تین بڑے لڑکے اور آٹھ دس صاحب بیٹھے تھے تو وہ مجھے مٹھی میں دابے دابے چپکے سے ایک جگہ بیٹھ گیا اور پھر جب وہ لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے تو اس نے چپکے سے مجھے ایک رانی کی گود میں چھوڑ دیا۔ پھر میں نے جو وہاں سے تین گز کی چھلانگ لگائی ہے تو سارے دیوان خانے میں ہلّہ ہو گیا۔راجہ ہمت سنگھ ڈر کے مارے زمین پر گر پڑے اور رانیاں ساڑیاں اُٹھا کر سروں پر کھڑی ہو کر چیخنے لگیں۔ہاہاہا یہ لوگ ہماری قوم سے کتنا ڈرتے ہیں۔''

بہت سے مینڈک ہنسنے لگے بھورا نے سر اٹھا کے کہا۔''میں جانتا ہوں آدمی اوپر سے بہادر بنتا ہے اندر سے بڑا کمزور ہوتا ہے اور پانی میں تو اس کی جان نکلتی ہے۔ارے یہ کیا کھا کے مینڈک کا مقابلہ کرے گا۔''

زرد پوش نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔''اس کے بعد جو ہڑ بونگ مچی ہے اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔کیونکہ بیس تیس آدمی میرے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے مگر میں کسی کے قابو میں نہ آتا اور راجہ ہمت سنگھ کے مُنھ سے غصّے کے مارے جھاگ اُٹھ رہی تھی اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے چلا

رہے تھے۔ارے نہیں چھوڑنا جانے نہ پائے کہ میں نے چھلانگ لگائی اوران کے سر پر بیٹھ گیا۔تو راجہ صاحب وہاں سے اُٹھ کے بھاگے۔ میں نے وہاں سے دوسری چھلانگ لگائی اور دوسرے کمرے میں پہنچ گیا مگر یہاں آ کرآخر راجہ کے چھوٹے لڑکے نے اندر سے دروازہ بند کرلیا اور مجھے پکڑلیا مگر میں نے بھی بچہ جی کوخوب خوب پریشان کیا ایسے تھوڑا ہی قابو میں آتا تھا۔''

''شاباش شاباش'' بہت سے مینڈک ایک دم چلّائے۔ پکھراج غرور سے اپنے خاوند کی طرف دیکھنے لگی ''پھر کیا ہوا۔'' بھورا نے پوچھا۔

''پھر مجھے اس شریرلڑکے نے اپنی مٹھی سے ایک ٹوکری میں بند کر دیا جس میں میں پھدک پھدک کے رہ گیا۔ٹوکری بہت مضبوط تھی اوراس میں دوسوراخ تھے وہ اتنے بڑے نہیں تھے کہ میں ان میں سے باہر نکل سکتا۔''

''تم اس میں کتنے دن قیدرہے۔'' دادا نے پوچھا۔

''دس دن اوردس راتیں۔لیکن راتیں بہت پریشان کرتی تھیں جب لڑکا اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دیتا تھا تو جھیل سے آپ لوگوں کے ٹرانے کی آواز آتی تھی۔تو میرے دل کی کیا حالت ہوتی تھی،یہ میں اس وقت نہیں بتا سکتا۔''

پکھراج کی گول گول معصوم آنکھوں میں آنسو بھرآئے۔

ایک مینڈکی نے جس کی پشت پر سبزاور پیلی دھاریاں تھیں اور جو جھیل میں سب سے حسین سمجھی جاتی تھی اور جس کا نام ذرافہ تھا ایک سوال کیا۔''ان لوگوں کی مینڈکیاں تم نے دیکھی ہوں گی کیا بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ''۔زرد پوش نے غصّے سے ٹرا کے کہا۔''ارے ان آدمیوں کی مینڈکیاں بڑی بدصورت ہوتی ہیں۔چہرے پر رنگ ملتی ہیں۔جسم پر کپڑا لپیٹتی ہیں اورسر پر بال رکھتی ہیں۔''

زرد پوش نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔''ہے تو خلافِ تہذیب مگر کہنا ہی پڑتا ہے کہ یہ مینڈکیاں انڈے نہیں دیتیں،بچے جنتی ہیں اوراپنے جسم سے اُن کو دودھ پلاتی ہیں۔''

بہت سی مینڈکیوں نے نفرت سے مُنہ سکیڑ لئے۔

''اور ان میں محبت کرنے کی رسم بہت بُری ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ تیرتے تیرتے جھیل کے بیچ میں چلے گئے اور کنول کے پھول پر بیٹھ کر چاندنی رات میں آہستہ ٹرانے لگے۔ ارے ان میں لوگ بڑے غلیظ ہوتے ہیں۔ جب یہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو ہونٹوں سے ہونٹ ملا کر مُنھ چومتے ہیں۔ ہائے ہائے کتنی غلیظ غیر سائنسی وحشی رسم ہے۔''
ذرافہ نے نفرت سے تھوک دیا اسے سچ مچ انسانوں سے گھن آنے لگی تھی۔

اور اس پر طرّہ یہ کہ یہ انسان مینڈک کو بدصورت اور وحشی سمجھتے ہیں اور خود اپنا یہ حال ہے کہ تہذیب چھو تک نہیں گئی اور صورت دیکھو تو اُبڑ کھابڑ مردوں کے تو سارے جسم پر بال ہوتے ہیں اور مُنھ پر مونچھیں ہوتی ہیں لیکن کئی عورتوں کے منھ پر بھی مونچھیں ہوتی ہیں۔''

درافہ اور حرافہ دونوں چیخ پڑیں۔ ''مُنھ پر مونچھیں۔ ارے یہ مینڈکیاں ہماری جھیل میں آجائیں تو کوئی مینڈک انھیں مُنھ نہ لگائے۔''

''بے شک بے شک۔'' سبز پوش نے متانت سے ٹرا کے کہا۔ ''ہماری قوم کی عورتیں بے حد خوبصورت ہیں۔ دُنیا کی کوئی قوم خوبصورتی اور بہادری میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

اس کے بعد کئی لمحے خاموشی طاری رہی۔ جھیل کے کنارے مینڈک اک عجیب اُداس ٹرٹری سے محظوظ ہوتے رہے۔ ذرافہ، حرافہ، پکھراج، نیلماں اور سبز دیوی جھیل کے آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ دیکھ کے خوش ہوتی رہیں۔

پھر زرد پوش بولا۔ ''اب انسانوں کی مینڈکیوں کا ذکر ہو رہا ہے تو اس سلسلے کو مکمل ہی کر دیا جائے۔ اس ضمن میں مجھے صرف دو باتیں اور کہنی ہیں ایک تو یہ کہ راجہ کے محل میں میں نے اکثر ان مینڈکیوں کو بے وفا پایا۔ انسانوں کو بھی اور اُن کی مینڈکیوں کو بھی۔ یہ لوگ اوپر سے محبت جتاتے ہیں مگر بیچ میں ایک دوسرے کی کاٹ کرتے ہیں۔ اندر سے کسی اور سے محبت کرتے ہیں۔ اب راجہ ہمت سنگھ کو ہی لے لو۔ راجہ کی سات مینڈکیاں ہیں۔''

''سات؟'' نیلماں نے غصّے سے کہا۔

دادا بولے۔ ''ایک مینڈک ایک وقت میں صرف ایک مینڈکی سے بیاہ کر سکتا ہے ایسا ہمارا دستور ہے اور اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ دُنیا کی ساری مینڈکیاں اور

مینڈک برابر ہیں۔"

"مگر دنیا کے سارے انسان برابر نہیں ہیں۔" داداز رد پوش نے بڑی تلخی سے کہا۔" تم نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک مینڈک دوسرے مینڈک کو کھا جائے کیا کبھی ایسا ہوسکتا ہے یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایک مینڈک ایک مچھر کو کھا جائے یا ایک مگر مچھ ایک مینڈک کو کھا جائے۔مگر کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک مینڈک دوسرے مینڈک کو کھا جائے۔نہیں نہیں یہ فطرت کے خلاف ہے۔"

"مگر انسانوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ایک انسان دوسرے انسان کو کھا جاتا ہے اُس کا لہو پیتا ہے۔اُسے غلام بنا کے رکھتا ہے۔اس کی بیوی بچّوں کو اپنی املاک سمجھتا ہے اور اسے وہ اپنی تہذیب اور شرافت میں شمار کرتا ہے اور جو آدمی ایسی بدی جتنی زیادہ کرتا ہے اتنا ہی بڑا سمجھا جاتا ہے۔"

"ہمارے ہاں تو بڑائی عقل و دانش تجربے اور تیرنے سے آتی ہے۔"

"مگر ان کے ہاں ایسا دستور نہیں ہے۔ان کے ہاں جو آدمی جتنا زیادہ دوسروں کو اپنی تائید کے لئے استعمال کر سکے اسے اتنا ہی بڑا اور بہادر سمجھا جاتا ہے۔اس کا نام انہوں نے ڈیموکریسی رکھ چھوڑا ہے۔ذرا غور کریں ڈیموکریسی کیا ایسی ہوتی ہے؟" بڈھا مینڈک غصّے سے اپنی گھر گرج میں۔بولا" یہ تو ظلم ہے۔"

"اس ظلم کی وجہ سے مرد بے رحم ہو جاتے ہیں اور اُن کی مینڈکیاں بے وفا ہو جاتی ہیں۔غلام پٹتے ہیں اور راجہ رانیاں اپنے نوکروں سے محبت کرتی ہیں۔ایک دفعہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے راجہ کی ایک لڑکی کو محل کے خوب صورت تالاب میں ایک لڑکے کو چھیڑتے دیکھا تھا۔"

"چھی! چھی!" پکھراج اپنی گول گول آنکھیں گھما کر بولی۔" یہ تو کھُلی بے حیائی ہے۔ان لوگوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔مینڈکانی تہذیب اِن کو چھو تک نہیں گئی۔"

"مینڈکانی تہذیب کا جواب نہیں ہے۔" کالے سر بولا۔

کالے سر جس مینڈک کا نام تھا، وہ جھیل کا سب سے عالِم مینڈک تھا۔مینڈکوں کی زبان پر جتنا عبور اسے حاصل تھا کسی کو حاصل نہ تھا۔وہ ہر قسم کی ٹراٹ اور اس کی ہر لرزش سے واقفیت رکھتا تھا۔مینڈک بچوں کو ٹرّانا وہ سکھاتا تھا، وہی انھیں بتاتا تھا کہ خوشی کے وقت کون سے الفاظ ادا کرنے چاہئیں،غم کے وقت کس طرح ٹرّانا چاہئے۔اپنے ماں باپ سے کیسے مخاطب ہونا

چاہئے۔ مچھروں، بھنگوں اور دریائی قبیلوں کی خبر کس طرح اپنے دوسرے ساتھیوں کو دینی چاہئے۔ مینڈکیوں کے لئے کلماتِ محبت کیا ہوتے ہیں اور اس کے سارے اسرار و رموز سے وہ واقف تھا۔ اس لئے اُس نے پوچھا۔

''بھائی زرد پوش انسانوں کی زبان کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔''

''محترم بزرگ''۔ زرد پوش نے اُداسی سے سر جُھکا کے کہا ''انسانوں کی ایک زبان نہیں ہوتی اُن کے دو زبانیں ہوتی ہیں۔''

''دو زبانیں!'' کالے سر نے حیرت سے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''یہ ناممکن ہے۔ دُنیا میں ہر ایک قوم کی ایک ہی زبان ہوتی ہے صرف ایک زبان۔''

''مگر انسانوں کی دو زبانیں ہوتی ہیں ایک تو وہ جسے وہ بولتے ہیں۔ دوسری وہ جسے وہ دل میں رکھتے ہیں اور اکثر وہ لفظ، جو دل میں ہوتا ہے کبھی زبان پر نہیں آتا۔ اکثر جو مُنھ کی زبان ہوتی ہے وہ دل کی زبان کے خلاف ہوتی ہے۔''

''وہ کیسے میں سمجھا نہیں بھائی۔''

''محترم بزرگ۔'' زرد پوش نے تشریح کرتے ہوئے بتایا۔ ''چھوٹے راج کمار کی ماں نے اس سے کہا تو اس بیچارے مینڈک کو چھوڑ دے۔ راج کمار نے کہا ہاں ماں میں اسے ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے مجھے آزاد نہیں کیا بلکہ ایک ٹوکری سے دوسری ٹوکری میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا۔''

''دوسری بات۔''

''راجہ جی نے میرے سامنے ایک کسان سے کہا جا ہم تیرا لگان مُعاف کر دیتے ہیں۔''

''اس کے بعد جب وہ کسان چلا گیا تو انھوں نے منشی سے کہا! جا اس کسان کی زمین قُرق کرا لے۔''

''تیسری بات۔''

''راجہ جی کے بڑے لڑکے نے ایک لڑکی سے کہا۔ مجھے تم سے بے انداز محبت ہے ایسی محبت جو مجھے آج تک کسی سے نہ ہوئی۔ لڑکی نے کہا۔ پیارے میرے دل میں صرف تم ہی تم

سمائے ہوئے ہو۔''

''اس کے بعد لڑکا لڑکی دونوں محل کے تالاب میں تیرتے رہے اور کبھی کبھی ایک دوسرے سے ہونٹ ملاتے رہے۔''

''پھر میں نے اسی راج کمار کو محل کی ایک نوکرانی سے یہی فقرے کہتے ہوئے سُنا اور اس راج کماری کو ایک دوسرے مرد سے اسی قسم کی باتیں اور اسی قسم کے ہونٹ ملاتے ہوئے دیکھا۔''

''چوتھی بات۔''

''راجہ ہمت سنگھ نے بڈھے جاگیردار بھیم سنگھ کی دعوت کی تھی۔ بھیم سنگ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ میرے سامنے راجہ ہمت سنگھ اس بڈھے جاگیردار سے ہنس ہنس کے باتیں کرتے رہے پھر میرے سامنے انھوں نے شراب میں زہر ملا کے اُسے دے دیا تا کہ اس کی جاگیر پر قبضہ کرلیں۔''

''پانچویں بات۔ مگر یہ مثالیں کافی نہیں ہیں۔''

''اس لئے محترم بزرگ میں سمجھتا ہوں کہ انسانوں کی دو زبانیں ہوتی ہیں اور وہ جو ایک زبان سے کہتے ہیں اسے دوسری زبان سے کاٹ دیتے ہیں اور پھر اس کا نام تہذیب رکھ دیتے ہیں۔''

کالے سر نے کہا۔ ''شکر ہے ہم مینڈوں کو صرف ایک زبان آتی ہے۔''

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' بہت سے مینڈکوں نے ٹرا کے کہا۔ دادا نے پوچھا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ تم اس جہنم سے کیسے نکلے۔''

زرد پوش نے مسکرا کے کہا۔ ''آہستہ آہستہ میں چھوٹے راجکمار سے مانوس ہوتا گیا کیونکہ وہ مجھے روز کھانے کھلاتا تھا۔ قدرتی بات تھی اس لئے اب مجھے اس کے جسم سے گھن بھی نہ آنے لگی تھی۔ نہ اب اس کے جسم کی بو مجھے ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ نہ اب مجھے اس کی ہتھیلی سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ میں اکثر اب اس کے کمرے میں پھدکتا رہتا اور کمرے سے باہر نہ جاتا۔ راجکمار مجھ سے باتیں کرتا رہتا اور میں ٹرا کے یا کبھی خاموش رہ کے اس کی باتیں سُنتا رہتا۔ پھر راجکمار مجھے اپنے ساتھ باہر بھی لانے لگا۔ ایک بار جب ہم دونوں ہی تالاب پر نہا رہے تھے تو ایک رانی نے ہمیں دیکھ لیا اور وہ جو مجھے دیکھ کر چیخی ہے، جو چیخی ہے، جو چیخی ہے بس آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میرے تالاب میں مینڈک کہاں سے آ گیا، میرے تالاب میں مینڈک کہاں سے آ گیا

،اب پوچھو بھلا مینڈک تو پانی کا جانور ہے۔ تالاب تو اس کا ہے۔ تالاب انسان کا کیسے ہوگیا۔ جو زمین پر پیدا ہوتا ہے، زمین پر رہتا ہے، زمین پر سوتا ہے، تالاب اس کا کیسے ہوگیا؟ مگر خیر یہ اس کی اپنی خودغرضی ہے اس کو کیا کیجئے۔ تو صاحب اس رانی نے میرے پیچھے دو چار نوکر لگا دیئے اور میں جو تالاب سے اُچھل کر بھاگا ہوں تو محل کے صحن کو پھاندتا ہوا برامدوں میں سے جست لگاتا ہوا باہر باغیچے میں آ گیا۔ آگے راستہ صاف تھا اور یہ تو تم جانتے ہو کہ دوڑنے میں، بھاگنے میں، چھلانگ لگانے میں، تیرنے میں انسان کبھی مینڈک کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

''نہ گانے میں؟ گانے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔'' زرافہ جو خود گانے کی بڑی ماہر تھی، سوال کرنے لگی۔

''گانے کی بات چھوڑ دو۔ یہ آدمی تو ایسے بے سُرے ہوتے ہیں کہ ساز کے بغیر گا ہی نہیں سکتے۔ گانا تو اب صرف مینڈکوں تک رہ گیا۔ اس آرٹ کے ہم ہی وارث رہ گئے ہیں۔''

''بے شک بے شک۔'' بہت سے مینڈک یکدم بول اُٹھے اور گانے لگے۔

''ہم مینڈک ہیں، ہم مینڈک ہیں، ہم مینڈک ہیں''

جب یہ ٹراہٹ ختم ہوئی تو چند لمحوں کے لئے مجلس میں سناٹا رہا۔ آخر میں دادا نے سوال کیا۔

''اور سب باتیں تو سُن چکے۔ اب ایک بات پوچھنی ہے۔ یہ امتیاز جو تم مینڈک اور انسان میں بھی دیکھ چکے ہو، تمہارا کیا خیال ہے انسان بڑا ہے یا مینڈک؟''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد زرد پوش نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھا کے کہا۔ ''انسان''

''وہ کیسے۔''

زرد پوش بولا۔ ''میں نے اپنی حکایت کا آخری حصہ تو سُنایا ہی نہیں، جب میں باغیچے میں پہنچ گیا تب تک بہت سے نوکر دم چھوڑ چکے تھے۔ مجھے پکڑنے کی آس چھوڑ چکے تھے۔ مگر ایک سب سے چھوٹا راجکمار جو مجھ سے اس قدر مانوس ہوگیا تھا اب بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگتا آتا تھا۔ وہ باغیچے سے لے کے ڈھلوان تک اور پھر ڈھلوان سے لے کے کیچڑ تک اور کیچڑ سے نیچے جھیل کے کنارے میرے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا آیا اور جب میں نے دھڑام سے جھیل میں چھلانگ لگائی اس وقت بھی وہ پانی کے کنارے اپنی دونوں باہیں پھیلائے مجھ سے ملتجیانہ انداز

میں کہہ رہا تھا۔ آجاؤ، واپس آجاؤ، میرے پیارے مینڈک، میں اب تم کو کبھی ناراض نہیں کروں گا میں تم کو بہت بہت بہت پیار کروں گا اور جس وقت وہ یہ کہہ رہا تھا اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس لئے انسان مینڈک سے بڑا ہے کیونکہ انسان رو سکتا ہے اور مینڈک رو نہیں سکتا۔ انسان اپنی تمام بُری حرکتوں، بے وفائیوں، بدلگامیوں کے باوجود رو سکتا ہے اور مینڈک رو نہیں سکتا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انسان مینڈک سے بڑا ہے۔''

محفل میں بہت دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر کچھ کہے سُنے بغیر یہ محفل ختم ہوگئی۔ ایک ایک کر کے مینڈک اُٹھنے اور جھیل میں غوطے مارنے لگے۔ بمپو، چمپو اور بھونچو بھی چاندنی رات میں نہانے کے لئے چلے گئے اور آخر صرف زرد پوش اور اس کی بیوی پکھراج جھاڑی کے کنارے رہ گئے۔

جھاڑی کی شاخ سے جگنوؤں کی لالٹین جگمگا رہی تھی۔

پکھراج نے ایک عجیب وغریب ادا سے زرد پوش کی طرف دیکھ کر کہا۔'' اور اگر میں تمہارے بعد سبز پوش سے شادی کر لیتی تو؟''

زرد پوش۔''لو، بی مینڈکی کو زکام ہونے لگا۔''

''زکام؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔''

''پتہ نہیں، وہاں محل میں انسانوں سے یہ فقرہ سُنا تھا۔ تمہارے بارے میں تھا اس لئے یاد رہ گیا۔''

''غلط کہتے ہیں، سر پھرے ہم تو پانی میں رہتے ہیں۔ ہمیں زکام کیوں ہوگا، زکام ہوتا ہوگا اُن شوں شوں کرتے ہوئے نک سڑوں کو۔'' اس کے بعد اس نے پھر اک عجیب ادا سے زرد پوش کی طرف دیکھا اور چھلانگ مار کر جھیل میں ڈبکی لگا گئی۔ زرد پوش زور سے ٹرّایا اور جھیل میں دور تک اس کے ساتھ ساتھ تیرتا پھرتا رہا۔

چاندنی رات تھی اور ان کے چاروں طرف کنول کے پھول تھے۔

☆☆☆

وجاہت علی سندیلوی

تربوز

میں ایک چھوٹا آدمی ہوں اور اس حیثیت سے اکثر مجھے بعض بڑے آدمیوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زیادہ تر اُن بڑے آدمیوں میں جتنی بڑائی زیادہ، اتنی ہی انسانیت کم دیکھی۔ ممکن ہے کہ یہ میری آنکھوں کا قصور ہو جو کسی بڑائی میں خواہ مخواہ انسانیت قابلیت اور کردار کی بلندی ڈھونڈھنے کی کوشش کرنے لگتی ہیں حالانکہ دنیا کے معیار کے مطابق بڑائی کے لئے صرف دولت شہرت اور عہدے کی بلندی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ بہر حال آپ چاہے یہی کیوں نہ کہہ دیں کہ انگور کھٹے ہیں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے دل میں جو کبھی ایک خواہش بڑا آدمی بننے کی تھی وہ اب اس تمنا میں تبدیل ہوگئی ہے کہ کاش میں ایک انسان بن سکتا! یقیناً بڑا آدمی بننے سے انسان بننا زیادہ مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ بڑے آدمی زیادہ اور انسان کم نظر آتے ہیں۔

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

مدّت ہوئی ہائی اسکول میں ایک بدہوتق سا لڑکا میرے ساتھ پڑھا کرتا تھا اُس کی اور کوئی خاص بات تو یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آتی۔ البتہ اتنا خیال پڑتا ہے کہ وہ موٹا اور انتہائی غبی اور لاپرواہ واقع ہوا تھا اور اس کی حماقتوں پر درجے میں اکثر دوسرے لڑکے اس کا مذاق اُڑایا کرتے۔ اُس کا اور میرا ساتھ چھٹے ہوئے بھی ایک زمانہ گذر گیا تھا اور نہ مجھے اُس کی کوئی خبر نہ فکر۔ سچ پوچھئے تو اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ تمہارے خیال میں تمہارا وہ پُرانا ساتھی کیا کر رہا ہوگا تو میں یہی پیشن گوئی کرتا کہ وہ جانور نما انسان کسی کانجی ہوز کا محرّر یا کسی مویشی اسپتال کا کمپونڈر ہوگا۔ لیکن جب ایک روز میں نے اخبار میں پڑھا کہ میرا وہ پُرانا ساتھی ایک عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہو کر ضرورت سے زیادہ بڑا آدمی بن گیا ہے تو تعجب سے میرا مُنہ کھُلے کا کھُلا رہ

گیا۔ اس تعجب میں حسد اور غصہ تو تھا ہی لیکن کچھ تھوڑی سی خوشی بھی تھی۔ جب میں نہ ہوا تو ایرے غیرے سے میرا ایک پرانا گم شدہ ساتھی ہی غنیمت تھا۔

مارے شیخی کے اسی روز شام کو میں نے اپنے دوستوں کے جلسے میں نہ صرف اپنے پُرانے ساتھی کے عہدۂ جلیلہ کا ذکر کر دیا بلکہ یہ بھی جڑ دیا کہ بچپن ہی سے اُس میں بڑک پن کے آثار صاف نمایاں تھے۔ چنانچہ وہ میرا اس قدر فرماں بردار تھا کہ جب میں اُس کے کان کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو نہ صرف وہ اپنا کان میرے ہاتھ میں دے دیتا بلکہ چپت کھانے کے لئے سر بھی جھکا دیتا وغیرہ وغیرہ۔ میرے اس چھیڑے ہوئے موضوع پر میرے ہر دوست نے خوب خوب طبع آزمائی کی اور کسی نہ کسی بڑے آدمی سے ایسا رشتہ یا سلسلہ جوڑا کہ بادل سے چلے آتے ہیں مضمون مرے آگے کا سماں بندھ گیا اور مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے حلقۂ احباب کی حقیقی عظمت، اہمیت، اور افادیت کا احساس ہوا۔ البتہ ایک مرزا صاحب خلافِ معمول زبان سنبھالے خاموش رہے اور جب انھیں بولنے کے لئے بہت مجبور کیا گیا تو صرف یہ شعر پڑھا ؎

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے! — کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے!

دوسرا مصرع پڑھتے وقت اُنھوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ہم میں سے ہر ایک طرف اشارہ کیا اور ہم لوگ اُن کی اس قدر شناسی سے محظوظ ہوئے چلتے وقت اُنھوں نے ایک آہ سرد بھر کر یہ دوسرا شعر پڑھا ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی! — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی!

اُس وقت میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ میری ذرا سی لن ترانی مجھ پر کیا قہرِ آسمانی توڑنے والی ہے۔

دوسرے روز ٹھیک سے سویرا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مرزا صاحب نے آ کر میرے بروٹھے میں بانگ دی میں گھبرا کر باہر نکلا تو انھوں نے یہ مژدۂ جانفزا بلکہ معدہ کشا سُنایا کہ۔

"آج شام کو کھانا میرے ہی ساتھ کھانا۔"

میں بھونچکا رہ گیا کیونکہ مرزا صاحب دعوتوں کے عاشق زار تھے لیکن یک طرفہ یعنی خود اپنے گھر دعوت کرنا وہ ایک قسم کا چھچھورپن اور اعترافِ شکست سمجھتے۔ لہٰذا اس بد پرہیزی سے

ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ میں نے مزید تصدیق کے لئے ایک مہمل سا سوال کیا۔

''یعنی آج شام کو آپ کے ساتھ آپ کے گھر پر کھانا کھاؤں؟''

کچھ بگڑ کر بولے۔

''اور میں آپ سے کہہ کیا رہا ہوں برخوردار!''

قصہ مختصر میں نے شام کو مرزا صاحب کے ساتھ ایک پُر تکلف دعوت کھائی اور جب گھر جانے کے لئے اُٹھنے لگا تو۔

''ذرا ایک بات تو سُننا''۔ کہہ کر وہ مجھے زنانخانے کی ڈیوڑھی تک لے گئے اور وہاں ایک پردے کو مخاطب کر کے بولے

''لو اب جو کچھ کہنا ہے تم خود ہی کہہ لو۔''

پردے سے دفعتاً ایک بھرائی ہوئی آواز آنا شروع ہوئی اور شاید دو گھنٹوں تک آتی رہی مرزا صاحب کی بیوی نے اپنے کسی کمزوری کے لمحے میں مجھے اپنا مُنہ بولا بھائی بنالیا تھا۔ اس وقت میری منہ بولی بہن نے مجھ سے جو کچھ کہا اُس کا ایک تسلسل سے بیان کرنا نہ صرف بہت مشکل بلکہ قطعاً ناممکن ہے بہر حال اس کا ماحصل کچھ اس قسم کا تھا کہ اُن کا بڑا لڑکا بشیر بیگ شاہجہاں پُور کے ایک اسکول میں ملازم ہے اور چونکہ وہاں اُس کی سُسرال بھی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی سُسرال ہی میں رہتا ہے۔ اُس کی سُسرال کے افراد انتہائی شریر، پاجی، فتنہ پرداز بلکہ قاتل اور ڈاکو قسم کے لوگ ہیں اور اُسے اپنے ماں باپ کے خلاف ہمیشہ اُکساتے رہتے ہیں۔ اب بریلی کے ایک اسکول میں ایک مدرس کی جگہ خالی ہوئی ہے اور بشیر بیگ نے اس کے لئے اپنی درخواست بھیجی ہے۔ اس اسکول کے منیجر میرے پُرانے ساتھی کے، جو حال ہی میں اک عہد جلیلہ پر فائز ہوئے ہیں، بالکل ہی چنگل میں ہیں۔ لہٰذا اگر میں زور لگاؤں تو بشیر بیگ شاہجہاںپور سے بریلی پہنچ سکتے ہیں اور اپنی سُسرال کے وحشیانہ اثرات سے دُور ہو کر شاید پھر جامۂ انسانیت میں آسکتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی بات آخر بات ہی کیا تھی؟ میں نے بڑے زوروں سے حامی بھر لی کہ میں اپنے پرانے ساتھی سے چٹکی بجاتے بشیر بیگ کو شاہجہاں پور سے بریلی منتقل کرادوں گا اور ہو سکا تو اُس کے سُسرال والوں کی تھوڑی سی گوشمالی بھی کرادوں گا۔ گھر

لوٹ کر میں نے پہلا کام یہی کیا کہ اپنے پُرانے ساتھی کو اپنے پُرانے تعلقات کا واسطہ دے کر تنبیہ کر دیا کہ میں آئندہ سنیچر کو ایک بہت ہی ضروری کام کے سلسلے میں اس سے ملنے آ رہا ہوں۔

مجھے اپنے دوست کا کوئی جواب نہیں ملا لیکن میں نے سوچا کہ پُرانے ساتھیوں کے درمیان خط کا جواب دینے کی غیریت اور تکلف کا کیا دخل؟ ہوسکتا ہے کہ جواب نہ آئے لیکن مجھے لینے اسٹیشن پر موٹر آئے۔ اسٹیشن پر اُترا تو موٹریں تو بہت نظر آئیں لیکن صرف دیکھنے کے لئے۔ سوچا کہ میرے ساتھی کی نئی موٹر کا نیا ڈرائیور بھلا مجھے کیا پہچانتا ہوگا مجبوراً ایک بوسیدہ یکّے پر قناعت کر کے مجھے اپنے ساتھی کی کوٹھی کی طرف روانہ ہونا پڑا۔

کوٹھی پر دوپہر کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرے ساتھی جورات کو کسی کوی سمیلن کی صدارت کرنے بیٹھ گئے تھے ابھی تک جاگے نہیں ہیں۔ بہت سے اردلی اِدھر اُدھر پھدک رہے تھے، جب کسی ایک سے کچھ کہتا تو مجھے کسی دوسرے کی طرف اشارہ کر دیتا بہت دیر تک اس طرح شٹل کاک بننے کے بعد جمعدار اردلی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا اور بمشکل تمام اس کی بڑی خوشامد درآمد سے پتہ چلا کہ اب ''بڑے صاحب'' ڈھائی بجے سے پہلے نہ جاگ سکیں گے اور اس کے بعد چوں کہ انھیں ایک ناری نکیتن کا اُدھگھاٹن کرنے جانا ہے لہٰذا آج وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔ میں نے ''بڑے صاحب'' سے اپنے بڑے پُرانے تعلقات جتائے لیکن وہ اردلی بالکل نہ پسیجا بلکہ کچھ اس انداز سے مُسکرایا جیسے ایسی بے سروپا داستانیں اُس نے بہت سی سنی ہوں۔ میں نے اس کو پان کھلایا، سگریٹ پلائی اُس کے بچوں کی خیریت پوچھی لیکن عجب فولادی دل و دماغ پایا تھا اُس ناشدنی نے، میں جتنا ریشہ خطمی بنتا جاتا اُتنا ہی اس کا لہجہ سخت اور کرخت ہوتا جاتا.................. یقیناً اس کے آباواجداد بڑے ستم آرا معشوقوں کے لٹھ باز دربان رہے ہوں گے اور بالآخر جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں اپنے جدِّ امجد حضرت آدم کی سنّت سے بالکل ہی ہم کنار ہونے لگا تو مجبوراً میں

زر بر سر فولاد نہی نرم شود

کے زرّیں مقولے پر عمل پیرا ہوا یعنی جیب سے مبلغ دو روپے نکال کر جمعدار صاحب کو پیش کر دیئے۔ انھوں نے انتہائی حقارت سے یہ حقیر رقم قبول کر لی اور پھر بڑے تجاہلِ عارفانہ سے فرمایا۔

"اگر آپ تین بجے آجایئے تو ممکن ہے کہ بڑے صاحب آپ سے مل لیں۔"

مئی کے مہینے میں جب کہ آگ برس رہی ہو اور لُو کے جھکّو آتش کدۂ دوزخ سے بھاگی ہوئی ارواحِ خبیثہ کی طرح کبڈی کھیل رہے ہوں۔ تین بجے دوپہر غالباً کسی بھلے یا بُرے آدمی سے نہیں بلکہ ملک الموت ہی سے ملنے کا مناسب وقت ہو سکتا ہے لیکن غرض مند باؤلہ جلا بھُنا اپنے ساتھی کی کوٹھی پر پھر پہنچا اور برآمدے کے خس خانے میں پہنچ کر دو چار دوسرے منتظرانِ دید کی طرح ایک کُرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر ہانپنے اور پسینہ پونچھنے کے بعد اُونگھنے لگا۔ میرا ہونے والا محسنِ جمعدار ایک طرف گدّے دار بنچ پر لیٹا خراٹے بھر رہا تھا۔ باقی اردلی بھی اِدھر اُدھر دبکے پڑے تھے میرے دل میں ایک لمحہ کے لیے یہ لغو تمنا بھی پیدا ہوئی کہ کاش یہ جمعدار بھی میرا ہم جماعت ہوتا۔ لیکن میں اُونھ کہہ کر پھر اونگھنے میں مصروف ہو گیا۔

نہیں معلوم کتنی دیر بعد جمعدار نے مجھے جھنجوڑا کہ چلئے آپ کا نمبر آ گیا۔ میں ہڑ بڑا کر اس کے پیچھے چلا اور دو تین کمروں سے گزر کر ایک بڑے کشادہ روشن اور خس پوش کمرے میں اپنے ساتھی کے حضور میں پیش کر دیا گیا۔ ایک گنجا گول مٹول آدمی ایک صوفے پر پالتھی مارے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے چھوٹی سی میز پر سینی میں ایک بڑا سا کٹا ہوا تربوز رکھا ہوا تھا، جسے وہ بڑی بے تکلفی سے چھری سے کاٹ رہا تھا اور بڑے بڑے لال گودے تو چل میں آیا کے انداز سے اپنے منھ میں رکھتا جاتا شاید بڑے آدمیوں کے بڑکپن کی یہ بھی ایک نشانی ہے کہ وہ غیر متوقع اور بے موقع کام کرتے رہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان سے کسی قسم کی کوئی باز پُرس نہیں کی جا سکتی۔

میرے سلام کا سر سے ہوائی جواب دیتے ہوئے اور مجھے اپنے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑے آدمی نے دفعتاً پوچھا۔

"یہ تربوز آپ لائے ہیں۔"

"جی نہیں۔"

"کہاں کا ہے یہ تربوز۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"دیکھیے اس کا چھلکا بہت موٹا ہے اور گودا بھی کچھ ایسا لال نہیں ہے۔"

''جی ہاں۔''

''تو آپ کے کھیت کا ہے یہ تربوز۔''

''جی نہیں۔''

''کس قیمت پر بکتا ہے یہ بازار میں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''مجھے تربوز بہت پسند ہے لیکن میٹھا اور لال گودے کا بعض اوقات بڑے تربوزوں کے بجائے یہ چھوٹے تربوز بھی بڑے مزے کے نکل آتے ہیں۔''

میں چھوٹے تربوز کو بڑے تربوز، یعنی بڑے آدمی کی توند میں منتقل ہوتے دیکھتا اور بڑے آدمی کی بکواس بڑے صبر و استقلال سے سُنتا رہا۔ غالباً بڑے آدمیوں کے بڑک پن کی یہ بھی ایک علامت ہے کہ وہ اپنی کہتے ہیں اور دوسروں کی نہیں سنتے۔

تربوز کی دبازت، لطافت، بلکہ نجابت اور تربوز کی پیداوار بڑھانے کے لئے سرکاری اعانت اور قومی کفالت پر بڑے آدمی نے ایک انتہائی مہمل اور متزلزل لیکن بہت مسلسل لکچر دیا۔ جس کو میں تربوز کے پیدا کردہ نفخ پر محمول کر کے انتہائی تحمل سے سنتا رہا۔ آخر جب بڑا آدمی تربوز کھاتے کھاتے تھک گیا اور اُس کے اشارے پر ایک ملازم اُس کے سامنے سے تربوز کی میز ہٹا لے گیا تو بڑے آدمی نے پہلو بدل کر اور بڑے تربوز یعنی اپنی توند کو ایک طرف صوفے پر گھسیٹ کر اور ایک بے ساختہ لیکن بہت طویل اور مشرح ڈکار لیتے ہوئے فرمایا۔

''میں بدیسی دوائیں کھانے سے دیسی تربوز کھانا بہتر سمجھتا ہوں۔''

میں نے اس بے ہودہ اور بے معنی جملے سے کچھ مطلب پیدا کرنے کی ایک سعیِ لاحاصل کی۔

''جی ہاں تربوز کھانا گویا قدرتی زندگی بسر کرنا ہے اور قدرتی زندگی بسر کرنے سے دوائیں خصوصاً بدیسی دوائیں استعمال کرنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔''

وہ کچھ بگڑ کر اور دوسری ڈکار کی تیاریاں کرتے ہوئے بولے ''لیکن میں قدرتی زندگی بسر کرنا قومی مفاد کے خلاف سمجھتا ہوں۔''

اور مجھے فوراً یاد آ گیا کہ میں بحث کرنے نہیں بلکہ مرزا صاحب کے ناخلف صاحبزادے کو

بریلی بھجوانے آیا ہوں۔ لہٰذا پہلو بچا گیا۔

''بالکل درست اور پاکیزہ خیال ہے آپ کا۔''

''اچھا میں آپ سے پھر ملوں گا۔''

''بڑے آدمی نے صوفے پر کچھ اندرونی بےچینی سے پہلو بدلا۔

''آپ نے پہچانا مجھے؟'' میں نے اُٹھ کر چلے آنے کے بجائے بیٹھے ہی بیٹھے ضرورت مندانہ بےغیرتی سے پوچھا۔

''پہچانا کیوں نہیں، کہیں دیکھا ہے آپ کو'' وہ میری صورت سے بیزار ہوتے ہوئے بولے۔

''میں آپ کے ساتھ آٹھویں درجے میں پڑھا کرتا تھا۔''

''کہاں تھا وہ درجہ''۔

''گنیش پور میں''۔

گنیش پور؟ اچھا یاد آ گیا۔ تو آپ کا نام بھوپو بھاشکر ہے؟''

''بھوپو بھاشکر یعنی بھوپندر ناتھ بھاشکر تو ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے۔''

''تو آپ چتنے رام نہیں؟''

''چتنے رام تو گھنٹا بجاتا تھا۔ میں ہوں تہذیب!''

''تربوز؟''

''تہذیب الدین۔'' میں نے انتہائی وضاحت سے عرض کیا۔

''اچھا تو میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ شری......تہ......تہ......تہوز میرا مطلب ہے تربوز۔''

میرا خون کھول گیا لیکن میں تہذیب اور تربوز کی بحث میں نہیں پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ اس بڑے آدمی کے اندر تربوز تو ہے لیکن تہذیب ہرگز نہیں۔ لہٰذا وقت ضائع کیے بغیر نفسِ معاملہ پر آ گیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے بھانجے بشیر بیگ کو بریلی اسکول میں نوکر رکھا دیں۔''

''اچھا اچھا میں غور کروں گا۔ ہو جائے گا آپ کا کام۔ بریلی خوب یاد آیا۔ کچھ دنوں میں میں جانے والا بھی ہوں بریلی! آپ میری روانگی کے وقت اسٹیشن پر ایک دفعہ پھر یاد دلا دیجئے گا مجھ کو۔ اچھا پھر رخصت!''

میں کمرے سے نکل آیا اور جمعدار کو ایک روپیہ مزید نذرانہ دے کر یہ بھی معلوم کر لیا کہ آئندہ اتوار چھوڑ کر اس سے اگلے اتوار کو بڑا آدمی بریلی جائے گا۔ گھر پہنچ کر میں نے مرزا صاحب کو تربوز کی تفصیلات کے علاوہ بڑے آدمی سے اپنی ملاقات کے دوسرے حالات دروغِ مصلحت آمیز کے ساتھ سُنائے تو بہت خوش ہوئے اور میری پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

''ابھی کیا ہے اب تو بشیر بیگ اپنے اسکول کا ہیڈ ماسٹر گا۔ اسٹیشن پر اپنے ساتھی کی یاددہانی کرنے چلنا تو مجھے شاملِ مسل کر لینا۔ میں اپنے ساتھ سندیلہ کے خاص الخاص لڈّوں کی دو ہانڈیاں بھی لیتا چلوں گا۔ لکھنؤ سے بریلی تک یہ لڈّو تمہارے ساتھی کے کام ودہن اور معدے پر چاند ماری کرتے رہیں گے اور پھر ان کی معطّر ڈکاروں کی فضا میں اگر وہ کوشش بھی کریں گے تو بھی بشیر بیگ کا کام بھول نہ سکیں گے۔''

ساڑھے سات بجے گاڑی چھوٹتی تھی لیکن مقررہ اتوار کو مرزا صاحب کی حماقت اور بے صبری کی وجہ سے ہم لوگ سندیلہ کے لڈّوں کے ہانڈیوں کے ساتھ پانچ ہی بجے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ سوا سات بجے کے قریب بڑا آدمی بہت سے لوگوں کے غول میں گھرا ہوا نمودار ہوا۔ وہ چلتا بھی جاتا اور اور جو مکھی لوگوں سے باتیں بھی کرتا جاتا اور اسی شان سے بڑھتا اپنے ڈبے کے سامنے آ کر رُک گیا اور اُس کے لواحقین اس کے سامنے اُسے گھیرتے ہوئے ایک نصف دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اُس دائرے کے اندر کئی دفعہ گھسنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ گاڑی چھٹنے کا وقت قریب آتا جاتا اور میری اور مجھ سے زیادہ مرزا صاحب کی بد حواسی بڑھتی جاتی بالآخر مرزا صاحب نے مجھے ایک بھرپور دھکا دیا اور میں کسی جملۂ معترضہ کی طرح گھُس ہی تو پڑا اس حلقۂ مخصوصین میں۔ میری صورت دیکھتے ہی بڑے آدمی نے ڈپٹا...... تم پھر آ گئے۔ پچاس بار کہہ دیا تم سے کہ تمہارے بل کی ادائیگی نہیں ہوسکتی نہیں ہوسکتی۔ میں جو کچھ کہہ دیتا ہوں میرے لئے وہ پتھر کی لکیر ہو جایا کرتا ہے''

''بل؟ میرا کوئی بل نہیں'' میں ہکلایا۔

''تم نے پہلے بھی سارا کام چوپٹ کر دیا تھا لیکن تمہاری خوشامد درآمد سے تم پر رحم کھا کر میں نے تمہارا وہ بل ادا کرا دیا تھا لیکن اس مرتبہ تو تم نے انتہائی بوسیدہ اور گھٹیا تار لگا کر ساری کوٹھی

کا ستیاناس مار دیا ہے (ایک صاحب سے جو غالباً پرائیوٹ سکریٹری تھے مخاطب ہوکر) دیکھئے اِن کے بل کی ادائیگی ہرگز نہیں ہوگی۔ ان کا لگایا ہوا تار فوراً نکلوا دیا جائے اور میرے بریلی سے واپسی سے قبل دوسرا تار ضرور لگ جائے۔ لیکن اس کا ٹھیکہ ان کو ہرگز ہرگز نہ دیا جائے۔''

''میں آپ سے دس روز ہوئے جب ملا تھا...... بشیر بیگ...... بریلی۔''

''ہاں ہاں تم مجھ سے تو پچاس بار ملے ہو لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ آئندہ مجھ سے ملنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا (دیگر حاضرین سے مخاطب ہوکر) ذرا آپ کی ہمت تو ملاحظہ فرمایئے آپ بریلی میں ٹھیکہ لینا چاہتے ہیں اور میری سفارش پر۔''

مجھے اپنے چاروں طرف کئی قہقہے سُنائی پڑے کسی نے کہا ''چکنا گھڑا'' اور ایک آواز سنائی پڑی ''چوری اور سینہ زوری'' کسی نے گلا صاف کیا'' آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے۔''

''میں ٹھیکیدار نہیں ہوں۔ میرا نام ہے تہذیب!'' میں روہانسا ہوکر مُنہ بسورتا ہوا چیخا۔

''تربوز؟'' بڑا آدمی چونکا۔

''تہذیب آپ نے فرمایا تھا کہ بریلی جاتے وقت......''

''اچھا تو وہ تربوز آپ ہی لائے تھے؟ انتہائی ثقیل تھا وہ کمبخت''۔ گاڑی نے سیٹی دی اور بڑا آدمی مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا اپنے کمپارٹمنٹ کے دروازے میں جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے لواحقین نے اپنے گھیرے کا رُخ موڑ کر مجھے پس پشت ڈال دیا......

......گاڑی چھوٹ گئی۔ کیا میرا پُرانا ساتھی بریلی پاگل خانے میں بھرتی ہونے جا رہا تھا؟ پُورا تربوز ہی ہے یہ گول گپا...... میرے ان اقسام کے خیالات کا تسلسل اپنے پیچھے دو پٹاخوں کی طرح کی آواز سے منتشر ہوگیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مرزا صاحب لڈّوؤں کی دونوں ہانڈیاں پٹخنے کے بعد مجھے کچھ ناقابل اشاعت باتیں کہتے ہوئے پلیٹ فارم سے واک آؤٹ کر رہے تھے۔

اب میں خود تو کسی بڑے آدمی کا تذکرہ نہیں کرتا بلکہ اگر میرے سامنے کسی بڑے آدمی کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو میں غیر ضروری طور سے خوامخواہ اپنے حاضرین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اُس سے میرا کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں اسی کو غالباً چڑھ بھی کہتے ہیں۔

☆☆☆

کرنل محمد خاں

یوسفِ ثانی

یہ قصہ ہے میرا اور میرے دوست یوسف کا۔ واقعہ سنانے سے پہلے اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام مسعود ہے اور میں ایک چھوٹا سا زمین دار ہوں میرے دوست کا پیشہ مجھ سے کچھ مختلف ہے۔ کتنا مختلف...... آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

یہ آج سے کئی سال قبل کا واقعہ ہے، جب ہم دونوں لاہور کے ایک کالج میں پڑھتے تھے۔ یوسف میرے ہم جماعت تھے، لیکن آپ کی یوسفیت فقط آپ کے نام تک محدود تھی آپ کی شکل وصورت اس کے اثر سے یک سر محفوظ تھی۔ آپ کی ولدیت کی ترکیب میں کوئی بھی پیغمبرانہ عنصر نہ تھا۔ مشہور تھا کہ آپ کے والدِ بزرگوار ذرا بہتر قسم کے میراثی ہیں اور فرزندِ دل بند کو بھی اس نظریے سے ایسا شدید اختلاف نہ تھا، بلکہ وہ اپنے ذاتی کردار سے بھی پدری شہرت کو کمک پہنچاتے رہتے تھے۔ ایک ایسے ہی کام کو انجام دیتے ہوئے آپ نے اس خاکسار کو بھی تقریباً انجام تک پہنچا دیا۔

یوسف حسنِ صورت اور نجابت میں اپنے گراں قدر ہم نام سے بے شک ایک قطب کے فاصلے پر کھڑا تھا، تاہم رونق آفرینی میں ایک پیغمبرانہ شان رکھتا تھا اور میراثی ہونے کے باوجود .... یا شاید میراثی ہونے کی وجہ سے .... ہم جماعتوں میں مقبول ومحبوب تھا۔ جہاں یوسف تھا، وہاں ہنسی تھی، قہقہے تھے، چہچہے تھے.......... اور ہاں، یوسف میں ایک اور کمال بھی تھی، وہ پیدائشی موسیقار تھا۔ جب کبھی اتوار کی رات کو ہوسٹل کی چھت پر ستار بجاتا یا گانا گاتا تو چلتے آدمی اور ٹوٹتے تارے رُک جاتے۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو لاہور سے پنڈی آنے والی گاڑی میں یوسف میرا ہم سفر تھا ،لیکن آج خلافِ معمول خاموش، بلکہ فکر مند سا تھا۔ وجہ پوچھی تو بولا۔

''ایک مشکل آپڑی ہے۔ کاش، تم مدد کرسکو۔''

مَیں نے کہا۔ ''یقیناً، بشرطیکہ تم مدد جائز قسم کی مانگو۔''

بولا۔ ''جس شخص کے منہ سے دو جملوں میں دو بشرطیکہ نکلیں، وہ وکیل ہوسکتا ہے دوست نہیں ہوسکتا۔''

''مروّت نام تھا جس کا، گئی مسعود کے گھر سے''

اور یہ کہہ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

مَیں نے کہا۔ ''ارے! ناراض ہونے لگے۔ چلو مانگو کیا مانگتے ہو۔ تمھاری خاطر تو ہم جان بھی دے دیں گے۔''

بولا۔ ''ہوا وعدہ؟''

کہا۔ ''ہوا وعدہ، مگر اب جلد بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟''

بولا۔ ''معاملہ ہماری شادی کا ہے۔''

''مبارک باد............اور ہمارے ذِمے کیا فرض ہے؟''

''تمھیں دُولھا بننا ہے۔''

''تمھارا مطلب ہے شہ بالا؟''

''نہیں جناب! میرا مطلب ہے دولھا۔ مجھے دولھے اور شہ بالے میں تمیز ہے۔''

''یعنی شادی تمھاری ہوگی، دولھا ہم بنیں گے۔ اس مغالطے کے عواقب بھی سمجھتے ہو؟''

''جی ہاں، آپ صرف دو گھنٹے کے لیے دولھا بنیں گے، عارضی دولھا۔''

''عارضی دولھا کیا شے ہوتی ہے؟ تاریخ میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے؟''

''تم ہاں کرو، تو مِل جائے گی۔''

مجھے محسوس ہوا کہ مَیں نے واقعی کوئی غیر شرعی وعدہ کرلیا ہے............بہر حال اب فرار خارج از بحث تھا۔ کہا۔ ''بہت اچھا، بتاؤ، ہمیں کب کہاں اور کیوں عارضی دولھا بننا ہے۔''

یوسف بولا۔ ''آپ بے تاب نہ ہوں۔ ایسے نیک کاموں میں تعجیل مستحسن نہیں۔ ہاں تو عارضی دولھا آپ آج ہی بنیں گے۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) کوئی پچاس منٹ کے

بعد۔ یعنی گوجرانوالہ میں۔ یہ تو ہو گیا کب اور کہاں کا جواب۔ جہاں تک کیوں کا تعلق ہے، ذرا توجہ سے سنیے۔"

مَیں نے اپنا ہاتھ زانو سے اُٹھا کر ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیا اور تمام تر توجہ یوسف کے چہرے پر گاڑ دی۔ یوسف نے کیوں کی تشریح شروع کی:

"تو صاحب مہربان! عرصہ دو ماہ کا ہوا، اس حقیر نے حال سے مایوس ہو کر اور مستقبل سے اُمید باندھ کر قصد شادی کا کیا اور ایک اخبار میں اشتہار ضرورت رشتہ، کابدیں مضمون دیا کہ ضرورت ہے ایک خوش وضع وخوش اطوار نجیب الطرفین کنوارے رئیس زادے کے لیے ایک زہرہ جمال، خوش اوقات، پابندِ صوم وصلوٰۃ، میٹرک پاس حسینہ کی اور یہ کہ سنہری موقع ہے کہ نکتہ شناس والدین کے لیے، جو بصیغہ راز خط وکتابت کر سکتے ہیں۔"

پوچھا۔ "یہ نجیب الطرفین رئیس زادے تم ہی تھے؟"

بولا۔ "بے شک، یہ اسی خاکسار کا اشتہاری روپ تھا۔"

"پھر؟"

"پھر بیسیوں خط آئے۔ بیسیوں جواب گئے، لیکن ایک کے سوا جملہ والدین مع دختران ِ عزیز یکے بعد دیگرے میدان چھوڑے گئے اور جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار، لیکن ان کا نام قیس نہیں، خان کرامت علی خان ہے۔ گوجرانوالے میں بستے ہیں اور عین اسی لمحے پھولوں کے ہار لیے اسٹیشن پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم دن کا کھانا اُنہی کے ہاں کھائیں گے۔ دیکھیں گے، دکھوائیں گے اور پھر دو گھنٹے بعد اگلی گاڑی سے سفر جاری رکھیں گے۔"

"یہ فریب کاری ہے۔"

"مگر بے ضرر ہے اور آخر مقصد نیک ہے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اور اچھے دوست بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

"وہی جو مَیں کہوں۔ تم نے وعدہ کر رکھا ہے۔"

"اچھا بتاؤ، مجھے کب دولہا بننا ہے؟"

''گاڑی سے اُترتے ہی۔ پلیٹ فارم پر پاؤں رکھتے ہی تم یوسف ہو گے اور یہ خاکسار مسعود۔''

''آخر اس حرکت کی ضرورت؟''

''تم نے اس خاکسار کا شجرۂ نسب تو نہیں دیکھا، لیکن چہرہ تو ایک مدت سے دیکھ رہے ہو۔ کیا کسی زاویے سے اس روسیاہ میں رئیس زادگی کے آثار نظر آتے ہیں؟ ذرا ایمان سے کہنا۔''

ایمان کی رُو سے جواب نفی میں تھا۔ مَیں نے کہا:

''ایسے آثار تو ناپید ہیں، لیکن ہمارے چہرے سے بھی کسی ریاست کا پتہ نہیں چلتا۔''

''آپ کتنے ہی بے توفیقے کیوں نہ ہوں، اس ناچیز کے مقابلے میں پرنس علی خان لگتے ہیں۔''

''یعنی تم ہماری شکل کا استعمال محض شہزادی کے محل میں داخلے کے لیے کررہے ہو؟''

''بجا فرمایا حضور نے، ورنہ اس رنگ و رُخ کے ساتھ اس خاکسار کو اسٹیشن ہی سے رخصت کردیا جائے گا۔''

''بھئی تم صاحبِ کمال آدمی ہو، ہم تو محض نمائشی کھلونے ہیں۔''

''ابتدائی تعارف کے لیے شکل بڑی اکسیر شے ہے۔ کمالات بعد میں آتے ہیں۔''

''لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ پرنس علی خاں نے اگر سوئمبر جیت بھی لیا تو پرنس یوسف کو کیا ثواب مِلے گا؟''

''پرنس علی خاں اس کارِ خیر کے بعد کنارہ کش ہو جائیں گے اور شہزادی کا ثواب اس غلام کے حصے میں آئے گا۔''

''اگر شہزادی نے ایصالِ ثواب سے انکار کردیا تو؟ آخر وہ بھی منہ میں زبان رکھتی ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے زبان رکھتی ہے، ورنہ گونگی جورُو بڑی ناقابلِ فہم مصیبت ہوتی ہے۔''

''اچھا، ایک بات بتاؤ۔ اس لڑکی میں کوئی خاص خوبی ہے، جو اس قدر دیوانے ہورہے ہو؟''

''کئی خاص خوبیاں ہیں، لیکن ایک عارضی دولھے کو ان میں دل چسپی نہیں لینا چاہیے۔''

میں نے ہار کر کہا۔ ''اچھا کوئی آخری ہدایت میرے لیے؟ کوئی خاص حرکت جو مجھے کرنا یا نہ کرنا ہو؟''

''میں تمھارے ساتھ رہوں گا اور حسبِ موقع ہدایات جاری کرتا رہوں گا۔ تم بے فکر رہو۔''

''ٹھیک ہے، بے فکر رہوں گا۔''

بولا۔ ''اب جاؤ، غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھولو۔ سسرال قریب ہے۔''

مَیں غسل خانے سے نکلا تو گاڑی آہستہ آہستہ گوجرانوالہ اسٹیشن پر رُک رہی تھی۔ خدا جانے، یوسف نے اپنی اشتہاری سسرال کو کیا نشانی بتا رکھی تھی۔ میں گاڑی سے اُترا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے معزز سے بزرگ، چند کم بزرگ ساتھیوں کے ساتھ میری طرف بڑھے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:

''میرا خیال ہے، محمد یوسف آپ ہی ہیں۔''

میں نے اصلی یوسف کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک مثبت مسکراہٹ کے ساتھ نگاہیں نیچی کر لیں اور میں نے اشارہ پا کر کہا:

''جی قبلہ، میرا ہی نام محمد یوسف ہے۔''

''جیتے رہو، جیتے رہو۔ اچھا، مجھے تو تم جانتے ہی ہو، میں کرامت علی خاں ہوں۔ یہ سلامت علی خاں ہیں، حمیدہ کے ماموں۔ یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں فراست علی خاں۔ یہ انور ہیں یہ ارشد، حمیدہ کے چھوٹے بھائی۔''

میں نے نقلی مسعود یعنی یوسف کا تعارف کرایا:

''یہ ہیں میرے عزیز دوست اور باکمال ہم جماعت مسعود۔''

سب نے اس کے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ملائے۔ یوسف نے جوابی گرم جوشی میں حسبِ عادت کچھ لطیفے بھی شامل کر دیے اور سب لوگ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ انور اور ارشد کے ہاتھوں میں ہار تھے۔ ایک نے میرے گلے میں ڈال دیا، دوسرے نے یوسف کے گلے میں۔ اسٹیشن سے نکلے تو ہمیں کار میں بٹھایا گیا۔ خان صاحب ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اور ہم دونوں

پچھلی نشست پر۔ کار چلی تو خاں صاحب بولے:

"عزیز! تمھارے خطوں سے ہم تمھارے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ صرف دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ماشاءاللہ، تم سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔"

میں نے برخوردارانہ لہجے میں ہستہ سے کہا:

"آپ کی عنایت ہے۔"

"اچھا، بتاؤ، خان بہادر صاحب کا کیا حال ہے؟"

میرے منہ سے جھٹ نکلا:

"کون سے خان بہادر صاحب؟"

یوسف نے مجھے کھینچ کر کہنی ماری اور خان صاحب کو سنا کر مجھ سے کہا:

"خان صاحب، آپ کے اباجان کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟ اچھے ہیں، آپ کو سلام کہتے تھے۔"

"تو کیا وہ وطن لوٹ آئے ہیں؟ تم نے تو لکھا تھا، وہ دو ماہ سے انگلستان میں علاج کرا رہے ہیں۔"

اب میرے اباجان بخیریت تمام اپنے گاؤں میں چودھراہٹ کر رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، جواب دوں کہ فوراً یوسف نے کان میں سرگوشی کی:

"خط...... خط...... خط......"

چنانچہ میں نے کہا:

"اباجان نے آپ کو خط میں سلام لکھا ہے۔"

خان صاحب بولے۔ "تو کیا وہ ہوش میں آ گئے ہیں؟ ان کے دماغ میں رسولی تھی نا؟"

یہ میرے صبر کی آخری حد تھی۔ میں نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا:

"قبلہ، وہ رسولی کا ذکر تو میں نے ان کے والد کی علالت کے ضمن میں کیا تھا اور وہ بے چارے اللہ کو پیارے بھی ہو چکے ہیں۔"

خان صاحب نے جھٹ اناللہ پڑھی۔ یوسف سے اظہارِ تعزیت کیا، جو اسے قبول کرنا پڑی۔

پھر یوسف نے پورے زور سے مجھے کہنی ماری اور یہ اس کا حق تھا، اگر چہ میں درد سے بلبلا اٹھا۔

اتنے میں خان صاحب کا گھر آ گیا۔ خان صاحب کھاتے پیتے اور بظاہر خوش ذوق آدمی تھے۔ ان کے دیوان خانے کی آرائش مشرقی انداز کی تھی۔ چاندنی، گاؤ تکیے، شمع دان وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز صاف شفاف چم چم کرتی ہوئی۔ ایک طرف چوبی تخت پر چند موسیقی کے آلات رکھتے تھے۔ ستار، طبلہ اور ہارمونیم، جیسے ابھی ابھی کوئی ریاض کرنے والا ہو یا کر کے اٹھا ہو۔ یوسف کو اور مجھے ایک خاص مسند پر بٹھایا گیا اور باتیں شروع ہوئیں۔ یوسف نے چھوٹتے ہی مجلس کو زعفران زار بنا دیا اور تمام حاضرین کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ہمارے چہرے سے بہ مشکل وہ خفگی کی تہہ اُتری تھی جو ابا جان کی فرضی رسولی سے پیدا ہوئی تھی۔

اتنے میں ایک خادمہ آئی اور حمیدہ کی والدہ کا پیغام لائی کہ لڑکے کو زنانے میں بھیجا جائے۔ خان صاحب نے ساتھ کے کمرے کی چق اُٹھائی اور میرا بازو پکڑ کر اندر قدم رکھنے کو کہا۔ اندر قدم رکھا تو محسوس ہوا کہ روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام۔ کمرہ لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا، لیکن یہ بتانا مشکل نہ تھا کہ حمیدہ کون ہے۔ اس کا حسن ایک علامتی گھونگھٹ سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں ہوں مہرِ عالم تاب، میں ہوں حقیقت منتظر اور عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔ حمیدہ نے مجھے فقط ایک نظر دیکھا اور اِک تیر ایسا سینے میں مارا کہ ہائے ہائے اس قتالہ کے قابل تو شاید اصلی پرنس علی خاں بھی نہ تھے۔ بہر حال پرنس علی خاں کی عدم موجودگی میں سر دست دو اُمیدوار ہی تھے: یوسف اور ہم۔ ہمارے نزدیک ایک میراثی زادہ یقیناً اس دُرِ شہوار کا سزاوار نہ تھا۔ یوسف بے شک ہمارا دوست تھا اور باہمی معاہدے کی رو سے ہم محض عارضی دولھے تھے، تاہم اب وہ حالات نہ تھے، جو چق اُٹھنے سے پیش تر تھے۔ ہمیں کئی مقولے یاد آئے، جن کی رو سے ہم وعدے سے پھر سکتے تھے، مثلاً یہ کہ جنگ اور محبت میں ہر بات جائز ہوتی ہے، چناں چہ ہم نے طے کر لیا کہ حمیدہ اب ہماری ہے اور ہماری رہے گی۔ باقی رہے یوسف تو ان کی شادی کسی معقول میراثن سے کرا دی جائے گی۔

حمیدہ کی ماں نے بڑی شفقت سے ہمارا مزاج پوچھا۔ چند خواتین اور حمیدہ کی سہیلیوں سے ہمارا تعارف کرایا، لیکن ہمیں عشق کے اس ناگہانی حملے میں لڑکیوں کے نام یاد رکھنے کا

مزاج نہ تھا۔ اتنے میں حمیدہ کی ایک سہیلی نے سالیوں کے انداز میں ایک سوال کیا:

''چشم بدُور، آپ کس جماعت میں پڑھتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''فورتھ ایئر میں۔''

دوسری بولی۔ ''ماشاء اللہ، آپ کتنے سالوں سے فورتھ ایئر میں ہیں؟ دو سال سے؟ چار سال سے؟''

مَیں نے کہا۔ ''ابھی تو ایک سال بھی نہیں ہوا۔''

تیسری بولی۔ ''اری تم بے تاب کیوں ہوتی ہو، ابھی بچے ہی تو ہیں۔ وقت آیا تو دو چار سال میں فورتھ ایئر میں دم لے لیں گے۔''

حمیدہ کی ماں نے انھیں ڈانٹا۔ ''تم بہت شریر ہوگئی ہو نجمہ! یہ انشاء اللہ اسی سال پاس ہوں گے۔''

ایک بولی۔ ''پاس نہ ہوئے تو فیل ہو جائیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔''

مَیں نے اس مذاق کے جواب میں ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا اور سر اٹھایا تو ایک اور سنگ آیا:

''سنا ہے آپ گاتے بھی ہیں۔''

دوسری بولی۔ ''اور ستار بھی بجاتے ہیں۔''

مَیں نے برخورداری اور اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''جی نہیں۔''

تیسری جھٹ بولی۔ ''چپ رہو جی۔ انھیں موسیقی سے پرہیز ہے۔ حکیم نابینا نے منع کیا ہے۔''

چوتھی بولی اور ٹھیک بھی تو ہے۔ کل گونگے پہلوان نے ایک فلمی گانا سن لیا اور اسے خسرہ نکل آیا۔''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں نہیں۔ مجھے موسیقی سے پرہیز نہیں، سن لیتا ہوں۔''

اس پر نجمہ چلائی۔ ''لانا، لانا، مٹھائی لانا، بانٹنی ہے۔''

کسی نے پوچھا۔ ''کس خوشی میں؟''

نجمہ بولی۔ ''اس خوشی میں کہ بھائی جان موسیقی سن لیتے ہیں۔ ہے نا خدا کی قدرت۔''

ایک اور بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے موسیقی سے ٹکر نہیں لے لیتے۔''

اس پر قہقہہ پڑا اور ایک طناز سی لڑکی بولی۔ ''بھئی، انھیں تنگ نہ کریں۔ آخر گانا سننا کون سا کارِ ثواب ہے۔''

یہ سن کر خدا جانے میرے منہ سے کیوں نکل گیا۔ ''جی ہاں، شہنشاہ اورنگ زیب تو گانا سننا گناہ سمجھتا تھا۔''

کہیں سے آواز آئی۔ ''آپ کو معلوم ہے، ان کے عہد میں موسیقی کا جنازہ نکلا تھا۔''

یہ سنتے ہی میرے قریب بیٹھی لڑکی بلا تامل بولی۔ ''کیوں نہیں، بھائی جان خود اس جنازے میں شامل تھے۔''

اس پر طناز لڑکی نے اصلاح دی۔ ''یہ کیوں موسیقی کے سوگواروں میں شامل ہوتے، یہ تو جہاں پناہ کے ساتھ بیٹھ کر ٹوپیاں کاڑھتے تھے۔''

اس نوک جھونک کے دوران میں حمیدہ خاموش بیٹھی رہی۔ میں سمجھا، مشرقی شرم وحیا کا تقاضا ہے۔ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں، لیکن اتنے میں ناگہاں دیوان خانے سے ستار کی نشیلی جھنکار کا ایک مدھم، مگر دل آویز سا جھونکا آیا۔ معاً حمیدہ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اُس نے اپنے چشم و گوش کا رُخ چق کی طرف موڑ دیا۔ اگلے لمحے ستار کے پردوں سے نغمات کا ایک رنگا رنگ دریا بہنے لگا اور حمیدہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر چق سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ حمیدہ کے پیچھے پیچھے تمام لڑکیاں چق سے چمٹ گئیں۔ مَیں نے چق کے ایک گوشے سے دیکھنا چاہا کہ اس فردوسِ گوش کا خالق کون ہوسکتا ہے؟ اور کیا دیکھتا ہوں کہ ستار کو گلے سے لگائے یوسف تخت پر بیٹھا ہے۔ جی ہاں، وہی میرا کم ذات اور کم شکل دوست یوسف مگر بخدا یوسف اور ساز باہم مل کر مجسم حسن و جمال بن گئے تھے۔ کچھ اسی قسم کا حسن، جو ستارۂ صبح کی لاٹ میں ہوتا ہے، جو شبنم سے لدے پھول میں ہوتا ہے، جو معصوم بچے کے دل گداز تبسم میں ہوتا ہے۔ الغرض وہی حسن، جو چند لمحے پہلے مجھے حمیدہ کے گل گوں لب و عارض میں دکھائی دیا تھا..... اور ہاں، حمیدہ چق سے لگی بے خود کھڑی تھی، جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ حمیدہ کی سہیلیوں کی کھسر پھسر جاری تھی:

''یہ ستار نواز کون ہے؟''

''یہ بھائی جان کا دوست ہے۔ان کے ساتھ آیا ہے۔''

''کیا خوب صورت ستار بجاتا ہے۔''

''کس قدر حسین لگ رہا ہے۔''

مجھے شک ہوا کہ یہ آخری جملہ حمیدہ کے منہ سے نکلا تھا۔

آواز آئی۔''حمیدہ! ذرا دیکھو، تم بھی ستار بجاتی ہو۔''

''اری! یہ تو ستار بھی حمیدہ کی ہے۔''

''یہ ستار ایسے ہی ستار نواز کے قابل ہے۔''

''اللہ قسم، حمیدہ! تمھاری ستار ہی نہیں تم خود بھی......''

یہ کہہ کر لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ہم نے بادلِ نخواستہ جملہ مکمل کر لیا......اور پھر دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے، ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔

جتنی دیر یوسف ستار بجاتا رہا، حمیدہ کی محویت کا یہ عالم تھا کہ کسی چکور نے چاند کو اس وارفتگی سے نہ دیکھا ہوگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے یوسف ستار کے تاروں کی بجائے حمیدہ کے دل کے تار چھیڑ رہا ہے۔ موسیقی ختم ہوئی تو تالیوں کی گونج میں لڑکیوں نے مطالبہ کیا کہ یوسف کو زنانے میں بھیجا جائے۔ یوسف آیا اور اپنے ساتھ اپنی گفتگو کا زعفرانِ زار بھی لایا۔ ادھر سب سے پہلے حمیدہ نے یوسف کو سلام کیا۔ یہ منظر دلِ محزوں سے برداشت نہ ہو سکا اور ہم اپنے رُوئے زیبا کی روشنی میں چق اُٹھاتے ہوئے دیوان خانے میں آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد خان صاحب کھانے کا واسطہ دے کر بمشکل یوسف کو باہر لائے، لیکن کھانے پر بھی سب کی نگاہیں یوسف ہی پر مرکوز تھیں۔ گویا یوسف نوالے نہیں چبا رہا، ستار بجا رہا ہے۔ جو کچھ دسترخوان پر آیا، یوسف کے آگے ڈھیر کر دیا گیا۔ کیا مجال جو کوئی سبزی، کوئی ترکاری یوسف کو خراج ادا کیے بغیر ہم تک پہنچے، بلکہ ایک ایک چپاتی کے لیے جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار۔ ویسے یوسف ہمارے لیے بے شک سراپا تشکر تھا، لیکن اسے کیا معلوم کہ اب ہم تشکر کے تشنہ نہ تھے، حمیدہ کے حاجت مند تھے۔

رخصت ہونے لگے تو خان صاحب نے یوسف کا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہا:

''یہ ابھی چند روز یہیں ٹھہریں گے۔ آیئے، آپ کو اسٹیشن پر چھوڑ آؤں۔''

پلیٹ فارم پر خان صاحب مجھے خدا حافظ کہہ کر جانے والے تھے کہ میرے ڈبے کے ایک اور مسافر نے انھیں دیکھ لیا اور گاڑی سے اُتر کر ان سے تپاک سے مصافحہ کیا۔ جب گاڑی چل پڑی تو میں نے ہم سفر سے پوچھا:

''آپ خان صاحب کو جانتے ہیں؟''

بولا۔ ''انھیں کون نہیں جانتا۔ مہاراجا باﺅنڈی پور کے درباری گوّیا ہیں۔''

☆☆☆

شفیق الرحمٰن

بلڈ پریشر

''میرا بلڈ پریشر۔'' شیطان پھر بولے۔

''درست ہے۔'' مقصود گھوڑے نے پھر بات کاٹ دی۔ ''بات یہ ہے رونی کہ آج صبح جو میں اٹھ کر دیکھتا ہوں تو کائنات میرے لئے سنوری ہوئی تھی۔ سورج میرے لیے ضرورت سے زیادہ چمک رہا تھا اور اپنی چمکیلی اور سنہری شعاعیں براہِ راست میرے لیے بھیج رہا تھا۔ باغیچے میں لاتعداد پھول محض میرے لیے کھلے تھے اور پرندے صرف اس اُمید پر سریلے گیت گا رہے تھے کہ میں سنوں گا۔ پھر ناشتے پر مجھے دنیا کی بہترین چاۓ ملی جو صرف میرے لیے دارجیلنگ کی خوشنما پہاڑیوں سے چُنی گئی تھی اور دنیا کی تندرست ترین گاۓ نے اپنے لختِ جگر، منظورِ نظر بچھڑے کو نظر انداز کرتے ہوۓ میرے لیے دودھ کا ایک گلاس بھیجا۔ لاکھوں شہد کی مکھیاں مدتوں فقط میرے لیے محنت و مشقت کرتی رہی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کاوشوں کا نتیجہ شہد کی صورت میں میری خدمت میں پیش کیا۔ جسے میں نے بڑی فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے قبول فرمایا۔''

ہم مقصود گھوڑے کے ہاں رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ اس کا گھر ہمارے ہوسٹل سے سات میل دور تھا۔ وہاں سے رات کے دس بجے آخری بس چلتی تھی۔ ابھی ساڑھے نو بجے تھے۔ کھانے کے بعد باتیں ہو رہی تھیں۔ قنوطیت اور رجائیت پر بحث ہو رہی تھی۔

''لیکن اس میں ایسی خاص بات کیا ہے۔ ہر شخص صبح اٹھ کر سورج کو دیکھتا ہے اور حسبِ توفیق ناشتہ کرتا ہے۔ تم تو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر باتیں کر رہے ہو، بھلا آج تمھیں کونسی خوش خبری ملی ہے، جو اتنے مسرور ہو۔''

''آج تو مجھ سا خوش قسمت تمھیں آس پاس نہیں ملے گا۔ آج میں نے تیرہ ہزار مرتبہ سانس لیا ہے۔ آج میرا دل ستاون ہزار مرتبہ دھڑکا ہے۔ آج میں طرح طرح کے حادثوں سے

محفوظ رہا ہوں۔ آج میں کسی موٹر کے نیچے نہیں آیا۔ آج مجھ پر کوئی درخت نہیں آن گرا۔ آج میں کسی شبُے میں گرفتار نہیں کیا گیا۔ آج کسی نے میری جیب نہیں کتری۔ آج کسی لفنگے نے مجھے تفریحاً پیٹا نہیں۔ آج میں کسی پر عاشق نہیں ہوا۔''

''وہ اور بات ہے۔'' گیدی صاحب بولے۔'' لیکن حساس شخص کبھی بھی مسرور نہیں رہ سکتا۔ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ رجائیت پسند وہ ہے جو شیر سے ڈر کر درخت پر چڑھ جائے اور جب کہ شیر نیچے کھڑا ہو، وہ آس پاس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہے۔''

''دیکھئے! میں آپ کو ایک مثال دوں، اگر ہمارے سامنے پانی کا آدھا گلاس رکھا ہو، تو میں اس بات پر خوش ہوں گا کہ شکر ہے کہ اس میں پانی تو ہے اور آپ یہ سوچ کر غمگین ہوں گے کہ یہ آدھا خالی کیوں ہے؟''

دراصل ہم پریشان اس لیے ہوتے ہیں کہ آتی ہوئی مصیبت کو جلد از جلد رخصت کرنے کی بجائے اس کا استقبال کرتے ہیں اور اسے بیٹھنے کو کرسی پیش کرتے ہیں اور پھر ہماری توقعات بے شمار ہیں اور ہم بے حد خود غرض ہیں۔ چند سال پہلے میں نے باغیچہ لگا رکھا تھا تو ہر رات کو میں کچھ اس قسم کی دعا مانگا کرتا کہ اے خدا رات بالکل ہوا نہ چلے۔ اوس اگر پڑے تو صرف گلاب کے تختوں پر پڑے جس کونے میں خشک بیج ہیں، اس طرف کچھ نہ ہو۔ کل گیندے کے پھولوں کو خوب دھوپ لگے۔ لیکن ذخیرے پر دھوپ قدرے ہلکی ہو۔ اس کے بعد سہ پہر کو معمولی سی بارش ہو، تاکہ پھلدار پودوں کو پانی مل جائے لیکن ذخیرے پر بارش نہ ہو اور۔''

''حضرات میرا بلڈ پریشر۔'' شیطان بولے۔

''شرست ہے رُوفی۔'' مقصود گھوڑے نے پھر بات کاٹی۔'' بات دراصل یہ ہے کہ۔''

حضرات سنیئے۔'' شیطان زور سے بولے۔'' بات دراصل یہ ہے کہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ کب ایک اچھا بھلا مسخرا قنوطی بن جائے گا اور کب ایک روتا پیٹتا قنوطی چھلانگیں مارنے لگے گا۔ اس لیے یہ بحث ہی فضول ہے۔ اسی قسم کا ایک قصہ میں سنانا چاہتا ہوں جس کا تعلق نہ صرف اس موضوع سے ہے بلکہ میرے بلڈ پریشر سے بھی ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ تقریباً سال بھر سے میں قنوطی رہا ہوں۔ بالکل گیا گزرا قنوطی، اور میرا بلڈ پریشر دن بدن بڑھتا جارہا

تھا۔ میں صبح سے شام تک فکر کرتا رہتا اور شام سے صبح تک اگر کوئی فکر کرنے کی بات ہوتی، تب بھی فکر کرتا اور جب ایسی کوئی بات نہیں ہوتی، تب اور بھی فکر کرتا کہ ایسی بات کیوں نہیں ہے۔ پچھلے اتوار کو ڈاکٹر صاحب نے میرا بلڈ پریشر لیا تھا اور وہ بہت گھبرائے تھے کیوں کہ بلڈ پریشر کا بڑھنا نہایت خطرناک ہوتا ہے یہ ایک فکر تھا، جس نے میری زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ نہ مجھے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی تھی اور نہ جینے کی کوئی تمنا تھی۔ میرا یہی خیال تھا کہ یہ بیزاری بڑھتی جائے گی اور میرا بلڈ پریشر بھی بڑھتا جائے گا لیکن دفعتاً سب کچھ بدل گیا۔ حالات بدل گئے۔ دنیا بدل گئی کل صبح سے میری زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں آ گئیں۔ مجھے اتنی اُمیدیں اور مسرّتیں مل گئیں کہ اب یہی جی چاہتا ہے کہ ناچنے لگوں۔''

''بھئی خیال رکھنا، کہیں بس نہ نکل جائے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ابھی دیر ہے میں صرف چند منٹ لوں گا۔'' شیطان بولے۔ ''ہاں تو ہوا یوں کہ کل صبح یونہی مسکراہٹ کی ایک لہر میرے چہرے پر دوڑ گئی۔ میں کپڑے پہننے میں ہمیشہ لاپروائی سے کام لیا کرتا تھا۔ پتلون کسی سوٹ کی ہوتی تو کوٹ کسی سوٹ کا اور ٹائی کسی اور رنگ کی ہوتی۔ لیکن کل صبح میں نے نہایت اچھا لباس پہنا، تمام کپڑے ایک دوسرے کے مطابق تھے۔ کالج جاتے وقت میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میں اس سڑک کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کئی نئی عمارتیں دیکھیں۔ بہت سی نئی دکانیں اور نئے اشتہار نظر آئے۔ کئی نئے چہرے دکھائی دیئے۔ شاید تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے ہمیشہ سائنس کی برائی کی ہے اور کئی مرتبہ یہ بھی کہا ہے کہ شاید میں سائنس پڑھنا چھوڑوں گا۔ کیونکہ یہ مضمون مجھے بے حد خشک اور مشکل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کل مجھے معلوم ہوا کہ لیکچر روم میں جو بڑے بڑے چارٹ آویزاں ہیں، وہ بالکل آسان ہیں۔ پروفیسر صاحب نے جو کچھ بورڈ پر لکھا وہ نہ صرف آسان ہی تھا بلکہ دلچسپ بھی تھا۔ پھر میں نے اپنی ہم جماعت مس ہُدہُد کو غور سے دیکھا۔ سال بھر کے بعد مجھے دفعتاً معلوم ہوا کہ اس کی شکل بالکل معمولی ہے، بلکہ بالکل ہی معمولی ہے اور صبیحہ کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں۔ میرے خیال میں مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ جانے مجھے اس کا خیال کیوں آ رہا تھا میں نے دل کھول کر اپنے اوپر لعنت بھیجی۔ آئندہ اگر کبھی مجھے اس

سے باتیں کرتے دیکھ پاؤ تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ خیر اس کے بعد پریکٹیکل ہوا، جو آلے اور اوزار مجھے زہر دکھائی دیتے تھے۔ وہ کچھ اتنے بُرے معلوم نہیں ہوئے۔ پہلے تو میں پریکٹیکل خود کرتا ہی نہیں تھا۔ کل میں نے پریکٹیکل اپنے ہاتھوں سے کیا اور مجھے سائنس اس قدر دلچسپ معلوم ہوئی کہ اب میرا ارادہ ہے کہ ایم ۔ایس ۔سی کے بعد ریسرچ کروں۔ دوپہر کو کالج سے واپس آتے وقت دُور میں نے ایک تانگہ دیکھا جس میں صبیحہ بیٹھی تھی۔''

''صبیحہ بیٹھی تھی؟ سچ مچ؟؟'' کئی حضرات نے چونک کر پوچھا۔

''بھئی ذرا خیال رکھنا، کہیں بس نہ نکل جائے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں سچ مچ صبیحہ تھی۔ اس سڑک سے وہ ہر روز تانگے میں گذرتی تھی۔ لیکن میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی، جس نے مجھے اس کی جانب متوجہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں میں سائیکل پر اس کے تانگے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، میں نے سلام کیا، جس کا جواب ملا۔ کل مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ صبیحہ نہایت ہی پیاری لڑکی ہے اور اس سے بہتر آنکھیں کسی کی نہیں ہوسکتیں، دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں صبیحہ پر دوبارہ عاشق ہو رہا ہوں۔ ہوسٹل پہنچ کر میں نے آئینہ دیکھا۔ کبھی میرا چہرہ ترچھا نظر آتا تھا۔ کبھی لمبوترا اور کبھی بالکل گول دائرے کی طرح۔ یہ آئینے کا نقص تھا۔ غالباً اسی سستے آئینے کی وجہ سے مجھے اس قدر احساس کمتری تھا۔ لطف یہ کہ مجھے پہلے اس کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ میں فوراً بازار گیا اور ایک اچھا سا آئینہ خریدا۔ اس میں اپنا چہرہ غور سے دیکھتا ہوں تو زمین آسمان کا فرق تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ میں اتنا بُرا نہیں ہوں۔ شام کو میرا میچ تھا۔ میں گھبرا رہا تھا تو صرف اس بات سے کہ اگر میچ لمبا ہو گیا اور اندھیرا ہو گیا تو میں ضرور ہار جاؤں گا۔ کیوں کہ روشنی کم ہوتے ہی کھیل میں میری دلچسپی کم ہوتی جاتی تھی۔ کل شام کو میچ واقعی لمبا ہو گیا۔ آخری سٹ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ لیکن میں اُسی طرح کھیل رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب میں نے میچ جیتا ہے تو باقاعدہ تارے نکلے ہوئے تھے۔ تعجب ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ اندھیرے کو محسوس نہیں کیا اور ایسے مخالف کو ہرایا جس نے کئی سال سے میری زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ کھیل کے بعد میں نے صبیحہ کے گھر کا رخ کیا۔

''بھئی وہ ذرا بس کہیں۔'' میں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔

''وہاں صبیحہ کے ابا ملے۔ اس کی امّی ملیں۔ پہلے مجھے ان دونوں سے یہی شکایت تھی کہ وہ مجھ سے بے رُخی برتتے ہیں لیکن کل رات کو میں نے پہلی مرتبہ ان کی آنکھوں میں شفقت جھلکتی دیکھی۔ وہ میری جانب بڑی محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میری نظریں انگیٹھی پر رکھی ہوئی تصویروں کی طرف چلی گئیں، جہاں کنبے کے افراد کی تصویریں رکھی تھیں۔ وہاں ایک تصویر میری بھی تھی، یہ تصویر مجھے پہلے کیوں نہیں دکھائی دی؟ اس کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ مجھے کھانے پر ٹھہرالیا گیا۔ دستر خوان پر صبیحہ ذرا دور بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ بُری طرح شرما رہی تھی۔ میں رات گئے لوٹا۔ کوٹھی کے دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اوپر صبیحہ کے کمرے میں روشنی تھی اور کوئی دریچے میں کھڑا تھا، اس سے پہلے بھی میں کتنی مرتبہ رات گئے ان کے ہاں سے لوٹا تھا۔ صبیحہ کے کمرے میں روشنی بھی ہوا کرتی تھی اور شاید وہ دریچے سے مجھے دیکھا بھی کرتی۔ لیکن کل رات پہلی مرتبہ مجھے اس کا احساس ہوا۔ جب میں واپس لوٹا تو چاند مسکرا رہا تھا۔ تارے مسکرا رہے تھے۔ دنیا مسکرا رہی تھی۔ میرا رواں رواں مسرت سے ناچ رہا تھا۔ میرے خیال میں اتنے مختصر وقفے میں اتنی ساری خوش گوار تبدیلیاں کسی کی زندگی میں نہیں آئی ہوں گی۔ پرسوں میں ایک چڑچڑا اور بیزار لڑکا تھا، جس کی زندگی کا مقصد صرف خودکشی تھا۔ جس کے بلڈ پریشر کا گراف دن بدن اونچا ہوتا جا رہا تھا اور کل قسمت کچھ ایسی مہربان ہوئی کہ سب کچھ بدل گیا۔ میرے چاروں طرف جو دھند سی چھائی رہتی تھی وہ یک لخت دور ہوگئی۔ مجھے وہ چیزیں دکھائی دینے لگیں، جن سے میں پہلے آشنا نہیں تھا۔ یہی کائنات جو بے حد دھندلی، بے معنی اور دور دور معلوم ہوتی تھی۔ دفعتاً اپنی تمام رنگینیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ بالکل قریب آگئی۔''

''اور تمہارا بلڈ پریشر؟''

''ہاں! میرا بلڈ پریشر۔ آج صبح میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ انھوں نے میرا معائنہ کیا اور حیران رہ گئے۔ میرا بلڈ پریشر اس قدر گر چکا تھا کہ نارمل سے بھی نیچے تھا۔''

''کمال ہے۔''

''حد ہوگئی۔''

''لیکن روفی بلاوجہ تو یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہوگا۔''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔'' شیطان بولے۔

''پھر بھی۔شاید کچھ ہوا ہو۔پرسوں یا کل۔''

''کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ہوئی۔فقط میں نے ذرا۔''

''ہاں ہاں۔فقط کیا؟'' ہم سب نے پوچھا۔

''فقط میں نے اپنی عینک کے شیشے بدلوائے تھے۔'' انھوں نے اپنی عینک اُتار کر کہا۔'' پچھلے ہفتے میں نے دوبارہ اپنی بینائی کا معائنہ کرایا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے نئے شیشے تجویز کیے تھے۔یہ نئی عینک میں نے کل صبح سے لگانی شروع کی ہے۔''

ہم سب لاحول پڑھتے ہوئے اُٹھے اور بڑی پھرتی سے سڑک پر پہنچے آخری بس نکل چکی تھی۔

جب ہم سات میل لمبی سڑک پر پیدل ہوسٹل کی طرف آ رہے تھے تو ہمارے بلڈ پریشر کا گراف ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی اونچا پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

محمد خالد اختر

زبیرا اسکیم

زبیروں کو درآمد کرنے کا انوکھا خیال چچا عبدالباقی کے ذہن میں پہلے پہل غالباً اس اتوار کو آیا جب ہم ...... چچا عبدالباقی اُس کا سات سالہ لڑکا عبدالرحمٰن اور میں چڑیا گھر میں جانوروں کا معائنہ کرنے گئے۔ معائنے کا لفظ میں نے قصداً استعمال کیا ہے، کیونکہ جس طریق سے چچا جانوروں کو غور اور سنجیدگی سے دیکھتا ہے اس کے لئے معائنے کا لفظ ہی مناسب ہے۔

میں نے غالباً پہلے بھی کہیں عبدالرحمٰن کا ذکر کیا ہے۔ وہ نکلے ہوئے کانوں والا ایک شوخ لڑکا ہے جسے اپنے بڑوں کا ذرّہ بھر بھی پاسِ ادب نہیں۔ ایسے بچوں کی ہی وجہ سے بزرگ حضرات کو قیامت کے قرب کا احساس ہو چلا ہے۔ ان دنوں میں کچھ روز کے لئے چچا کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا، اور ایک طریق سے اس عبدالرحمٰن کی اتالیقی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اپنے اس شاگرد کی مستقل صحبت چند دنوں سے میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ عبدالرحمٰن میرا حددرجہ مشتاق ہو رہا تھا۔ پل بھر کے لئے مجھے تنہا نہ چھوڑتا اور مَیں سرد آہیں بھر کر اکثر اس بات پر تعجب کرتا کہ بعض انسان دوسرے انسانوں کے اس قدر مشتاق کیونکر ہو جاتے ہیں۔ چچا کے مکان پر ابھی مجھے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا اور اس عرصے میں عبدالرحمٰن مجھ سے میرا مفلر اور سگرٹ لائٹر بطور خود مانگے ہوئے تحفوں کے طور پر قبول کر چکا تھا۔ ایک دو روز سے وہ مجھے اس بات پر اُکسانے میں لگا ہوا تھا کہ میں اپنی کلائی کی گھڑی بھی اُسے نذر کر دوں۔ اس کا اسکول کا کام بھی میں کر کے دے رہا تھا۔ چچا عبدالباقی اپنے منہ بولے بھتیجے اور نوخیز ہونہار بیٹے کے درمیان اس قدر محبت اور دوستی کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا، اور اگر چہ وہ جانتا تھا کہ یہ محبت اور دوستی یک طرفہ ہے پھر بھی یہی ظاہر کرتا تھا جیسے میں عبدالرحمٰن پہ جان چھڑکتا ہوں اور اس سے گہری وابستگی اور اُنس رکھتا ہوں۔

انہی دنوں ایک چمکیلی، سنہری اتوار کو چڑیا گھر کے جانور ہمیں دیکھ کر بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ چچا عبدالباقی کے ہمراہ چڑیا گھر جانا ایک سعادت ہے، ہمارا جانوروں کے معائنے کا طریق کار یہ تھا کہ ہم ایک جانور کے پنجرے کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے...... چچا ہم سے ایک قدم آگے بالکل پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ پہنچ کر رُک جاتا، اور عبدالرحمٰن اور میں اس کے پیچھے صف آرا ہو جاتے۔ چچا عبدالباقی چشمہ ناک پر ڈھلکائے، ہاتھ میں بید کی سوٹی لیے اور مجسم متانت اور وقار کی تصویر بنا جانور کا معائنہ کرتا۔ معائنے کے دوران میں وہ اپنی سوٹی سے جانور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے اور عبدالرحمٰن کو اس جانور کی عادات و خصائل، طریق بود و باش، فلسفۂ زندگی وغیرہ پر ایک مبسوط لیکچر دیتا۔ مجھے مختلف جانوروں کے متعلق اسی روز کئی قسم کی معلومات ہوئیں جو بہت عجیب و غریب تھیں۔ ایک جگہ چچا کا یہ معائنہ پورا کامیاب نہ رہا۔ بدقسمتی سے جانور نے موقع کی سنجیدگی اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔ ہُوا یہ کہ چچا عبدالباقی برازیلی بندروں کے ایک جوڑے کے پنجرے کے ساتھ کھڑا ہوا میرے اور عبدالرحمٰن کے استفادے کی خاطر برازیلی بندروں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈال رہا تھا، اور چچا کی تقریر سننے کے لئے کئی تماشائی ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے، خود برازیلی بندروں کا جوڑا چچا کی باتوں کو گہری توجہ اور دلچسپی سے سُنتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس تقریر کے دوران میں چچا نے کسی مسئلے پر زور دینے کے لئے اپنی سوٹی اُٹھا کر بندروں کی طرف اشارہ کیا جس پر برازیلیوں میں سے ایک نے نہایت پھرتی اور صفائی سے سلاخوں میں سے پنجہ نکال کر سوٹی کو جھپٹ لیا۔ چچا کی تقریر لوگوں کے قہقہوں میں ختم ہو گئی۔ چچا نے ہمیں مڑ کر یقین دلایا کہ برازیلیوں نے یہ محض دل لگی کی ہے اور سوٹی چھین لینے کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ کہ وہ اس سے تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد اُسے لوٹا دیں گے۔ برازیلیوں کی مزاح کی حِس اور معقولیت کے بارے میں چچا کی خاص رائے تھی۔ ہم نے برازیلیوں کو کئی طریقوں سے سوٹی واپس کرنے پر اُکسایا۔ عبدالرحمٰن نے انہیں دو تین مونگ پھلی کے پیکٹ پیش کیے، مگر برازیلی اپنی مزاح کی حِس کو بہت دور لے جانے پر تلے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چچا عبدالباقی نے برازیلیوں میں اپنا اعتماد کھو دیا، ان کے متعلق اپنی رائے تبدیل کر دی، اور ان کو دھمکی دی کہ وہ چڑیا گھر کے

سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر چڑیا گھر کے بعض جانوروں کے بُرے اخلاق کی شکایت کرے گا اور اس سے اپنے نقصان کے ہرجانے کا مطالبہ کرے گا۔ اس کی نوبت نہ آئی اور چڑیا گھر کے ایک ملازم نے آخر خود پنجرے کے اندر جا کر چچا کی سوٹی کو برازیلیوں سے رہائی دلوائی۔

چچا کے سکونِ طبع کو دُوسرا دھچکا اس وقت لگا جب ہم شیر ببّر کے پنجرے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ شیر ببّر ایک معمر حیوان تھا اور سلاخوں کے پاس ٹہلتا ہُوا ہمیں ایک بیزاری کے عالم میں تک رہا تھا۔ چچا سلاخوں سے آدھ فٹ کے فاصلے پر اپنی سوٹی کو زمین پر ٹیکے شیر ببر کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ شیر ببر کی جرأت، اس کی وسعتِ قلبی اور اس کی خودی پر ایک تقریر کر رہا تھا، اور ہم پر واضح کر رہا تھا کہ کس طرح ایک شیر ببّر ایک عام شیر یعنی اس شیر سے جو ببّر نہیں ہوتا ہر لحاظ سے ممتاز ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ ہمیں یہ بتا رہا تھا کہ شیر دریا میں سیدھا تیرتا ہے اور اگر وہ تیرتے ہوئے بہاؤ میں مڑ جائے تو پھر واپس کنارے پر آ کر دوبارہ تیرتا ہے تو شیر ببّر نے احتجاج کے طور پر اُٹھ کر اپنے بڑے ایال دار سر کو جھنجھوڑا اور خوفناک طریق سے دہاڑا، چچا عبدالباقی اور ہم فوراً وہاں سے بھاگے اور زیبروں کے احاطے کے پاس آ کر دم لیا۔

احاطے میں دو زیبرے زمرّدیں گھاس پر ٹہل رہے تھے...... وہ چاق و چوبند دھاری دار زیبرے تھے! بھوری خاکستری کھال پر چوڑی سیاہ دھاریاں خوشنما معلوم ہو رہی تھیں اور چوپایوں کے خلاف اپنی جبلی مخاصمت کے باوجود میں انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ چچا عبدالباقی احاطے کی جالی کے ساتھ لٹکے ہوئے ایک لکڑی کے بورڈ کی طرف چلا گیا جسے چڑیا گھر میں منتظمین نے ان لوگوں کی خاطر لگوایا تھا جو زیبروں میں کسی قسم کی دلچسپی لیتے تھے۔ اس پر انگریزی میں زیبروں کے متعلق ہر نوع کی معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں۔ بورڈ کو بغور پڑھنے کے بعد چچا عبدالباقی ہماری طرف آیا اور اس نے عبدالرحمٰن اور مجھے فخر سے یہ اطلاع دی کہ احاطے میں وہ جو دو خچر نما جانور ہیں حقیقتاً زیبرے ہیں۔

چچا عبدالباقی نے اپنا بازو میرے بازو میں دیتے ہوئے کہا، ”بھئی، بختیار! یہ زیبرے اچھے خوبصورت جانور ہیں۔ اگر ان کی یہ دھاریاں نہ ہوں تو خچروں اور گھوڑوں کی طرح ٹمیالے اور غیر دلچسپ نظر آنے لگیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ان زیبروں کو وکٹوریہ تانگے کے

آگے گھوڑوں کے بجائے جوتا جائے تو کیسا رہے۔ ذرا تصور کرو کہ کراچی کی وکٹوریوں کے آگے مریل بھورے گھوڑوں کے بجائے چست دھاری دار زیبرے جتے ہوئے ہیں۔ سنو بھئی، بختیار، کیوں نہ ایک زیبرا درآمد کمپنی کھولی جائے اور نائجیریا سے زیبرے درآمد کئے جائیں اور وکٹوریہ والوں کو مہیا کیے جائیں؟ بڑا اچھا بزنس ہو سکتا ہے۔"

"زیبروں کو گاڑی کے لئے غالباً سدھایا جا سکتا ہے۔ میں نے زیبروں کے متعلق یہ بات کہیں پڑھی تھی یا کسی سے سُنی تھی۔"

"تم کو کس نے بتایا؟" چچا عبدالباقی نے روک کر احتجاج کیا۔ لوگوں نے شیروں وغیرہ کو سدھار کر چھوٹے چھکڑوں میں جوت رکھا ہے، زیبرے تو پھر زیبرے ہیں۔ آؤ، ہم زیبرے درآمد کریں گے اور بیچیں گے۔ میں خود ان کو سدھانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ جب وکٹوریہ والوں کو پتا لگے گا کہ انہیں معقول داموں پر خوبصورت چتکبرے زیبرے دستیاب ہو سکتے ہیں تو وہ زیبروں پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

"مگر، چچا! فائدہ کیا؟ گھوڑے کیا کریں گے؟ گھوڑے بے کار ہو جائیں گے۔"

"وقت آ رہا ہے جب گھوڑے بیکار ہو جائیں گے، بھتیجے، بختیار خلجی! واللہ گھوڑوں کے خلاف کوئی بغض نہیں۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مستقبل تاریک ہے۔"

چچا کے ڈرائنگ روم میں شکر کی چائے پیتے ہوئے بھی ہماری گفتگو کا موضوع زیبرے تھے۔

"دیکھو بھئی بختیار! میری بات سُنو۔" چچا نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "فرض کرو ہم پہلے پہل سو زیبرے درآمد کریں اور ان کی پہلی افزائشِ نسل کا انتظام کریں۔ سال کے آخیر تک اگر ہمارے پاس پانچ سو زیبرے بھی ہوں، ممکن ہے ہزار ہوں اور ہم ان کو پانچ سو روپیہ فی زیبرا کے حساب سے بھی فروخت کریں تو پانچ سو روپیہ ضرب پانچ سو کتنے ہوئے؟ عبدالرحمٰن بھئی پانچ سو کو ذرا پانچ سو سے ضرب تو دو۔"

عبدالرحمٰن نے اپنی کاپی پر ضرب دے کر جواب بتایا: پانچ سو پچاس۔"

پانچ سو پچاس روپے ہوئے۔ ہاں بھئی بختیار، پانچ سو پچاس...... مگر بھئی عبدالرحمٰن پانچ

سو پچاس کیسے ہوئے؟

''دولاکھ پچاس ہزار بنتے ہیں۔'' میں نے زبانی ضرب دے کر بتایا۔ میری ریاضی عبدالرحمٰن سے قدرے بہتر ہے۔

''دولاکھ پچاس ہزار روپیہ۔ چلو پچاس ہزار روپیہ چھوڑ دو۔ دولاکھ ہمیں پھر بھی بچتے ہیں اور کتنی مُدّت میں؟ صرف ایک سال کی مدت میں اور پھر ہمیں زیبرا درآمد کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے اپنے زیبرے بڑھتے رہیں گے۔''

''لیکن چچا وہ تو تم نے سال کے اخیر میں سب کے سب بیچ دیئے تھے۔''

''نہیں بھئی سارے کہاں بیچے تھے اور پھر جن کو ہم زیبرے فروخت کریں گے ان کو اس شرط پر فروخت کریں گے کہ ان میں سے جو زیبرے پیدا ہوں گے وہ ہماری ملکیت ہوں گے۔ ہم ان لوگوں سے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کرائیں گے۔''

مجھے ابھی تک اس اسکیم کی کامیابی کے بارے میں شکوک تھے۔ میں نے ماہنامہ ''الّو'' کے اجراء اور دوسری کئی اسکیموں کے حسرت ناک انجام کے متعلق سوچا۔ ہم نے ان کو کس طمطراق، کس خود اعتمادی سے شروع کیا تھا اور آخران کا حشر کیا ہوا؟ وہ تو پھر بھی کسی حد تک معقول اسکیمیں تھیں۔ یہ زیبروں کی درآمد کی اسکیم تو ایک بالکل بے معنی اسکیم تھی۔

''دیکھو، میرے بھتیجے، بختیار۔'' چچا نے میرے خیالات بھانپتے ہوئے کہا، ''جب کوئی باہمّت شخص نئی اور انوکھی چیز شروع کرتا ہے تو لوگ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ لیکن ہمیں لوگوں کے بے وقت قہقہوں سے نہ ڈرنا چاہیے۔ جب میں نے مرغیوں کی فارمنگ کا آغاز کیا تو کئی میرے اپنے احباب مجھ پر ہنستے تھے اور کہتے تھے: ''عبدالباقی، شرط رہی کہ مہینے کے اندر تم ان مرغیوں کو خود کھا جاؤ گے۔''

''اور چچا تم واقعی کھا گئے۔''

''تمہیں کیسے پتا ہے؟''

''تم نے خود ہی ایک دفعہ بتایا تھا۔''

خیر یہ تو دُوسرے قصّے شروع ہو گئے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ زیبروں کا معاملہ دُوسرا ہے۔ تم

بھی اس پر سوچو اور میں بھی اس پر غور وفکر کرتا ہوں۔"

"چچا پہلے ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ آیا گھوڑے گاڑی والے زیبرے جوتنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟"

"آمادہ کیوں نہ ہوں گے؟ آخر انہیں کون سا نقصان ہے؟ یہی تو میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پہلے پہل کوئی نئی بات کی جائے تو ہر کوئی ہنستا ہے۔ جب پہلے پہل ہنری فورڈ اپنی فیکٹری کی پہلی موٹر کار میں چڑھ کر باہر نکلا تو تمہیں پتا نہیں کہ دیکھنے والوں کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ گئے۔ زیبرے آ جائیں تو ان کو فروخت کرنے سے پہلے ہم ایک نمائشی زیبرا گاڑی رکھیں گے اور اس میں بیٹھ کر شام کو ہوا خوری کیلئے میکلوڈ روڈ اور الفنسٹن اسٹریٹ میں سے گزرا کریں گے۔ اس طرح لوگ زیبروں کو وکٹوریا کے آگے جتا ہوا دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ یہ جدّت جڑ پکڑنے لگے گی۔ یہ نمائشی گاڑی بڑی ضروری ہے۔ اب میں تمہیں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ شروع شروع میں جب میں کراچی آیا تو لوگ میری ترکی ٹوپی پر تعجب کرتے اور ہنستے تھے۔ اس وقت یہاں بہت کم ترکی ٹوپی پہننے والے لوگ تھے۔ اب تم خود جانتے ہو ترکی ٹوپی کس قدر عام نظر آتی ہے۔ کل ہی کی بات ہے میں الفنسٹن اسٹریٹ میں سے گزر رہا تھا۔ سامنے سے چار اچھے بھلے پُر وقار شخص ترکی ٹوپیاں پہنے اور ایک قطار میں چلتے میرے پاس سے گزرے۔ انہوں نے مجھے السلام علیکم کہا، حالانکہ وہ مجھ سے واقف نہ تھے اور مجھ سے پیراڈائز سینما کا راستہ دریافت کیا۔ تو یہ بات ہوتی ہے بھئی، بختیار! پہلے زیبروں کے خلاف تعصب کو دُور کرنا ہے۔ ایک دفعہ تعصب دور ہو گیا تو زمین ہموار ہے اور گھوڑوں کے متعلق میری اس بات کو پتھر کی لکیر سمجھ لو کہ گھوڑوں کا مستقبل قطعاً روشن نہیں تاریک ہے۔"

"تمہاری رائے میں گھوڑوں کا اب کوئی چانس نہیں۔ انہیں میدان چھوڑ دینا چاہیے۔"

"زیبروں کے سامنے وہ نہیں ٹھیر سکتے۔ یہ میرا ایمان ہے۔"

میرا اب بھی اطمینان نہ ہوا تھا مگر چچا عبدالباقی نے جمہوری اُصول کے مطابق ووٹ لے کر (جس میں اس کے پریذیڈنٹ کی حیثیت سے دو ووٹ تھے) اس امر کا فیصلہ کر دیا کہ

زیبرا امپورٹ کمپنی قائم کی جائے گی۔ سرمائے کی فراہمی کا کام میرے ذمے تھا اور باقی کاروبار کی شرائط وہی تھیں جو پہلی اسکیموں میں ہوتی تھیں۔ چچا عبدالباقی اس بزنس میں آدھے سے زیادہ کا حصے دار ہونے کا روادار نہ تھا۔ وہ بلا تنخواہ منیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرنے پر تیار تھا۔ اگر میں چاہوں تو عبدالرحمٰن کو بھی ایک تیسرے شریک کی حیثیت سے لیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کا فیصلہ کلی طور پر میری دلی منشا پر چھوڑ دیا گیا۔

''سرمایہ اب کیسے حاصل کیا جائے'' میں نے کہا: ''میرے پاس تو صرف چار روپے آٹھ آنے ہیں اور میرا اوالداب روپے کے معاملے میں سخت گیر ہو گیا ہے۔ اسے میری اسکیموں پر بالکل اعتماد نہیں ہے۔''

''ارے بھئی، بختیار! چچا عبدالباقی بولا'' لکھ کے تو دیکھو تین ہزار روپیہ شروع میں کافی ہوگا۔ میں نے سُنا ہے اس بار ہڈیوں کا زرخ کافی چڑھا ہوا تھا اور انہوں نے ہڈیوں کے کاروبار میں کافی ہاتھ رنگے ہیں۔ آخر تم ان کے اکلوتے بیٹے اور جائز وارث ہو۔ ان کا روپیہ تمہارے کام بھی تو آنا چاہیے۔ آخر کار تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ بھئی روپیہ کمانا چاہیے۔ اتنے تفکرات کے باوجود میں اب بھی صبح بستر سے اُٹھتا ہوں تو اپنے آپ کو مخاطب کر کے گاتا ہوں۔ ''او عبدالباقی، دیکھ، ایک اور نیا دن طلوع ہوا ہے۔ کیا تم اسے یونہی بے فائدہ گزر جانے دو گے؟''

''چچا میں بھی صبح اُٹھ کر اپنے آپ کو انہیں الفاظ سے مخاطب کرتا ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''مجھ پر بھروسہ کرو'' چچا عبدالباقی بولا۔ ''زیبرے ہماری مشکلات کو حل کریں گے۔''

(۲)

جہاں تک اسکیم کا تعلق تھا زیبرا درآمد کمپنی کی داغ بیل اسی شام چچا عبدالباقی کے ڈرائنگ روم میں پڑ گئی تھی، مگر سرمایے کے نہ ہونے کی وجہ سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اُٹھایا جا سکا۔ دن گزرتے گئے اور اس عرصے میں میں چچا کے مکان سے

کھارادر میں ایک فلیٹ میں ایک دوست کے پاس اُٹھ آیا۔ جب بھی میں چچا سے ملتا تو ہماری گفتگو کا موضوع زیورے ہوتے۔ میں اپنے والد کو روپوں کے لئے لکھنے سے ہچکچاتا تھا کیونکہ میں ان سے اپنی کئی روپیہ کمانے والی اسکیموں میں اتنی مرتبہ روپیہ لے چکا تھا کہ اب ان کا متاثر ہونا محال نظر آتا تھا۔ اپنے پچھلے خط میں انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مجھے ان سے اب ایک پائی بھی نہ ملے گی اور یہ کہ جہاں تک روپوں کا سوال تھا میں انہیں بھلادوں تو بہتر ہے۔

آخر مجھے لکھنا پڑا، روپیہ حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ واضح الفاظ میں روپے کا مطالبہ کرنے کے بجائے میں نے ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کیا۔ میں نے پہلے تو خط میں انہیں اس سال کے کاروبار میں خوب منافع کمانے پر مبارکباد دی اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ان پر واضح کیا کہ میں نے یہاں ایک امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھول لیا اور درآمد کا کام باقاعدہ شروع کردیا ہے۔ میں نے زیبروں کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ میرا خیال تھا بوڑھا آدمی میرے اشارے کو بھانپ جائے گا مگر پہلے تو انہوں نے خط کا جواب ہی نہ دیا۔ دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ منافع کے متعلق میری اطلاعات نہایت غلط تھیں اور انہیں امسال کم ازکم بچاس ہزار کا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے میری درآمد کمپنی کے کھولنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور پھر یہ نصیحت بھی کی تھی کہ سرمائے کی کمی سے نہ گھبرانا چاہئے اور یہ کہ جس وقت انہوں نے ہڈیوں کا دھندا شروع کیا تھا ان کی جیب میں کل ساڑھے پانچ آنے تھے میں نے یہ خط چچا عبدالباقی کو دکھایا اور دیر تک ہم بوڑھے آدمی کی خود غرضی اور کوتاہ نظری پر اظہار افسوس کرتے رہے۔ اس خط کے دوسرے دن ہی مجھے والد کی طرف سے ایک تار موصول ہوا کہ ''فوراً آؤ۔ تمہاری شادی کی بات چیت ہو رہی ہے اور تمہارا ہونے والا خسر تمہیں دیکھنے کا خواہاں ہے۔''

مجھے جانے میں قدرے تامّل تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد پہلے کئی ہونے والے خسر اپنے ارادے تبدیل کر چکے تھے۔ جب میں نے یہ تار چچا عبدالباقی کو دکھایا تو اس نے مجھے فوراً جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے مجھے کئی ایسے نیک دل خسروں کی مثالیں دیں جنہوں نے شادی کے وقت اپنے دامادوں کو تحفتہً پانچ ہزار یا اس سے زیادہ کے چیک عنایت کئے تھے۔ چچا

عبدالباقی کی رائے میں یہ میرے لئے ایک سنہری موقع تھا۔ چچا خود مجھے گاڑی پر چڑھانے کے لئے اسٹیشن تک آیا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ خود مجھے گاڑی پر سوار کرانے نہ آیا تو میں اپنا ارادہ بدل لوں گا۔ مجھے رخصت کرتے وقت اس نے مجھ سے ساڑھے چار روپے ٹیکسی کے لئے قرض لئے۔ چونکہ وہ مجھے سوار کرانے کے لئے آیا تھا، اس لئے غالباً وہ یہ مناسب سمجھتا تھا کہ میں اسے ٹیکسی میں واپس پہنچانے کا خرچہ برداشت کروں۔ اس دفعہ بھی وہ حسب معمول اپنے پیسے اپنے دوسرے کوٹ کی جیب میں بھول آیا تھا۔ وہ مجھ سے میری کلائی کی گھڑی بھی اُدھار لینا چاہتا تھا مگر میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں سے اسے اس بات کا موقع نہ دیا۔

میرے وہاں جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ میں چار ہزار روپے اُدھار لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈیڑھ ہزار تو بوڑھے آدمی سے بعض عجیب طریقوں سے اینٹھا گیا۔ کچھ میں نے اپنے چند پرانے دوستوں سے لیا جو اب بھتوں اور کپاس وغیرہ کے کاروبار میں خوب پیسے کما رہے تھے۔ ہم خلجی جب چاہیں کافی میٹھے اور چارمنگ لوگ بن سکتے ہیں اور ہمارے خاندان کے افراد ہمیشہ روپیہ اُدھار لینے میں اچھے رہے ہیں۔

جب میں روپیہ لے کر واپس پہنچا تو چچا سے زیادہ خوش آدمی کوئی نہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ اب اپنی اسکیم کو تیزی سے حقیقت بنا دیں گے۔ پہلے تو ہم نے میکلوڈ روڈ کی کئی انگریزی اور دوسری کمپنیوں کے چکر کاٹے اور ان کے مینجنگ ڈائرکٹروں سے تخلیہ میں ملاقات کی اور ان سے زیبرے فراہم کرنے کے لئے کہا۔ بہتوں نے سمجھا کہ ہم ان کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور فوراً ہمیں دفتر سے رخصت ہونے کی درخواست کی۔ بعض نے ہمیں احمقوں کا ایک بے مثل جوڑا سمجھا۔ ایک کمپنی کا ڈائرکٹر تو چچا کے اسکیم کی وضاحت کرنے پر اس قدر بے صبر اور غضبناک ہو گیا کہ اس نے ہم سے پوچھا کہ آخر ہمارا اس طرح اُس کا وقت ضائع کرنے سے کیا مطلب ہے اور ہمیں تنبیہ کی کہ اگر ہم اس وقت وہاں سے نہ چلے گئے تو وہ اپنے چوکیداروں کو بلوا کر ہمیں باہر پھینکوا دے گا۔

''اب ایک ہی صورت ہے'' چچا عبدالباقی بولا: ''ان کمپنیوں کو بزنس کرنا ہی نہیں آتا۔ بختیار، اب تم کو خود نیروبی جانا پڑے گا۔ وہاں جاتے ہی تم کو پہلے تو ایک شکاری، سفاری کا

انتظام کرنا ہوگا۔ میں تمہیں رائڈر ہیگرڈ کے ایک دو ناول ''شی'' وغیرہ پڑھنے کو دوں گا۔ اس سے تمہیں ایک سفاری کے انتظام کرنے کے موٹے موٹے اصولوں کا پتہ لگ جائے گا۔ پہلی چیز جو تمہیں کرنی ہوگی وہ ہے ایک اچھے قابلِ اعتبار زولو مہتمم کا انتخاب جو افریقی جنگلوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ زولو خود ہی سامان اُٹھانے والے قلیوں کا انتظام کردے گا۔ سامان میں تم ایک خیمہ، ایک سوٹ کیس اور کچھ کھانے پکانے کے برتن لے جاسکتے ہو۔ ہاں سانپوں کے کاٹنے کے علاج کا بکس ساتھ ضرور رکھنا۔ تم ہر بیسویں قدم پر سانپوں سے دوچار ہوگے۔''

آخر بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرا جانا ہر حالت میں ناگریز ہے اور میں نے پاسپورٹ کے لئے درخواست دے دی۔ چچا عبدالباقی اور میں نے ایئر لائن اور جہازوں کی کمپنیوں کے دفتروں میں جاکر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور کمپنیوں کے سفری لٹریچر کا مطالعہ بڑے انہماک سے کیا۔ ہم یہ طے نہ کر پائے کہ نیروبی جانے کے لئے میرے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا بہتر رہے گا۔ چند دنوں میں ہر کوئی زیبروں کی خرید کے سلسلے میں میرے نیروبی جانے کے متعلق جانتا تھا اور اُس کا اس قدر چرچا ہوا کہ بہت سے احباب کا خیال تھا کہ میں نیروبی سے واپس آ گیا ہوں۔ خود مجھے کبھی کبھی گمان ہونے لگتا کہ شاید نیروبی کا سفر کر آیا ہوں۔ کئی احباب مجھے بازار میں ٹھیرا کر میرے کراچی میں ہونے پر تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے کہ ان کے خیال میں میں ابھی نیروبی وغیرہ میں ہی تھا۔ بے حد سنجیدہ چہروں سے وہ مجھ سے دریافت کرتے کہ میں نیروبی سے کب واپس آیا ہوں اور یہ کہ میں کتنے زیبرے ساتھ لا سکا ہوں۔ ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے کافی ہاؤس میں مجھ سے فرمائش کی کہ میں ''نقاد'' کے خاص نمبر کے لئے نیروبی پر ایک رپورتاژ قلمبند کروں جس میں وہاں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈالوں اور ماہنامے کے قارئین کو زیبروں کے پکڑنے کے بارے میں معلومات بہم پہنچاؤں۔

اس چرچے اور غل کے باوجود میں نیروبی نہ جاسکا۔ اوّل تو پاسپورٹ ہی نہ بن سکا اور پھر نیروبی کی حکومت اپنے جانوروں کو بچانے کی اہمیت کے بارے میں تیار ہوگئی تھی اور اپنے ملک میں شکاریوں کے آنے پر قدغن لگا رہی تھی۔ چچا عبدالباقی کی مایوسی دیکھنے لائق تھی مگر میں اپنے

دل میں خوش اور مطمئن تھا۔ مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے اور رائڈر ہیگرڈ کے ناول "شی" کو پڑھنے کے بعد تو میں کسی حالت میں بھی افریقہ میں جانے کو تیار نہ تھا اور متحیر تھا کہ لوگ آخر وہاں رہتے کیوں ہیں۔

(۳)

ایک شام کو میں چچا عبدالباقی سے ملاقات کے لئے گیا تو ایک شخص کو اُس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا خوفناک شکل کا شخص تھا اور ان شخصوں میں سے تھا جن کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کے چہرے سے ہُن برستا ہے۔ مجھے یہ تو اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہُن کیا ہوتا ہے مگر اس آدمی کے چہرے سے یہ ہُن ٹنوں کے حساب سے برس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی زرد اور تاتاری تھیں، ہونٹ موٹے اور کچھ احمقانہ تھے اور اس کی مونچھیں لمبی اور اُلجھی ہوئی تھیں۔ وہ لمبا گلوبند، خاکی اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ غالباً مگرمچھ کے چمڑے کے اونچی ایڑی والے کیل دار فل بوٹ چڑھائے تھا۔ ایک چار بور کی رائفل اس کے سامنے میز پر پڑی تھی۔

میں اس کو دیکھ کر اُلٹے پاؤں جانے لگا تھا کہ چچا عبدالباقی نے مجھے آواز دی:

"آؤ بھئی بختیار! ہمارا کام بن گیا۔" چاروناچار میں کمرے میں داخل ہوا۔ چچا ایک دھوتی اور قمیص میں بڑے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور ایک مکمل معتنک شانت بدھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا جسے اس وقت نروان حاصل ہونے والا ہو، اس نے لمبی مونچھوں والے خوفناک اجنبی سے مجھے متعارف کرایا۔

"بھئی اچھا ہوا تم آ گئے۔ یہ میجر اے آر مسکین ہیں۔ بڑے مشہور بگ گیم ہنٹر ہیں، چنانچہ اب پھر بگ گیم کے شکار کے لئے نیروبی پرواز کرنے والے ہیں۔ ان کو کہیں سے پتا چلا ہے کہ ہمیں زیبروں کی ضرورت ہے اور یہ اسی لئے یہاں مجھے ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ہمارے لئے وہاں سے پچاس زیبرے ہر ماہ کے حساب سے شپ کر سکتے ہیں۔ مسکین صاحب یہ محمد بختیار صاحب خلجی میرے حصے دار ہیں۔"

میجر نے مجھے اپنی پیلی آنکھوں سے دیکھا اور ردِ عمل کے طور پر سامنے رکھی ہوئی رائفل کو

اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

میجر نے اپنی رائفل سے کھیلتے ہوئے مجھے اور چچا عبدالباقی کو مخاطب کیا۔

''ہاں تو، مسٹر عبدالباقی، بگ گیم ہنٹنگ کے لئے افریقہ کے گھنے زہریلے جنگلات میں کئی ہفتے گھومنا پڑتا ہے۔ اگر آپ حضرات نے ٹارزن کی فلمیں دیکھی ہیں تو آپ قیاس لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کتنے جان جوکھوں اور خطرے کا ہے۔ سفاری کے انتظام میں کافی خرچ آجاتا ہے، چونکہ میں آپ لوگوں کے کام پر نیروبی جارہا ہوں، اس لئے اصولاً تو آپ کو مجھے نیروبی جانے اور وہاں سے واپسی کا کرایہ دینا چاہیئے اور وہاں مہم وغیرہ کا خرچ بھی آپ کے ذمّے ہونا چاہیئے مگر میں آپ حضرات سے نہ کرایہ لوں گا اور نہ وہ خرچ جو زیبروں کی مہم کے انتظام پر آئے گا۔''

''یہ آپ کی بڑی عنایت ہے۔'' چچا عبدالباقی نے کہا۔

''یہ زیبروں کا پکڑنا سخت مشکل کام ہے۔ میں آپ حضرات کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ اچھا فی الحال آپ کو کتنے زیبرے درکار ہیں۔''

''ڈیڑھ سو۔'' چچا عبدالباقی بولا: ''کیوں بھئی بختیار فی الحال ڈیڑھ سو کافی ہوں گے؟''

''دو قسم کے زیبرے ہوتے ہیں۔'' شکاری نے کہا، ''ایک قسم ذرا بڑھیا ہوتی ہے۔ ایک تو سفید زیبرے ہوتے ہیں جن پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔ پھر بھورے زیبرے ہوتے ہیں جن پر سرخ اور ملگجی دھاریاں ہوتی ہیں۔ آپ حضرات کو کون سے زیبرے چاہئیں۔''

''ملے جلے ہوں۔'' چچا عبدالباقی نے کہا۔ ''زیادہ تر اگر سفید زیبرے مل سکیں تو اچھا ہے۔''

''اُن کے لئے مجھے نیروبی سے سو میل آگے زیمبو دریا میں کئی دن اور کئی راتیں سفر کرنا پڑے گا جیسا کہ آپ نے ''کنگ سالومنز مائن''، اور ''ٹارزن کا بیٹا'' فلموں میں دیکھا ہوگا۔ سفید زیبرے غوما کنٹری میں پائے جاتے ہیں۔ غوما کنٹری کے لوگ سخت وحشی اور مردم خود ہیں، اور سفید زیبرے کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لئے اس خطرے کے لحاظ سے جو مجھے غوما کنٹری میں شکار کھیلنے کے لئے مول لینا ہوگا، سفید زیبروں کی قیمت عام زیبروں سے زیادہ ہوگی۔

''عام زیبروں کی قیمت کتنی ہوگی؟''

''عام زیبرے آپ کو غالباً چار سو روپے جوڑے کے پڑیں گے اور سفید کوئی آٹھ سو

کے۔ آپ حضرات کل دس بجے میرے ہمراہ کمپنی افریقن ٹریڈنگ کمپنی میں آ ییے۔ میرا بڑا بھائی اس کا مینجنگ ڈائرکٹر ہے۔ آپ ٹرمس وغیرہ وہیں طے کر سکتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے ہمیں اپنے افریقی سفروں کے نہایت دل دہلا دینے والے قصے سُنائے۔ باتوں کے دوران میں وہ کئی دفعہ جوش میں آجاتا اور ہمیں جانور تصوّر کر کے ہم پر رائفل سے شست باندھ دیتا۔

''ہاں تو چیتا بس وہاں بیٹھا تھا جہاں، بختیار صاحب، آپ بیٹھے ہیں میں نے فوراً شست باندھی اور ڈز ڈز۔''

چچا عبدالباقی اور میں اُسے نیچے سڑک پر چھوڑنے کے لئے آئے۔ چچا عبدالباقی چاہتا تھا کہ میں میجر کو شہر میں لے جا کر کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا وغیرہ کھلاؤں اور سینما وغیرہ لے جاؤں۔ چچا نے مجھے ایک طرف لے جا کر کئی ایسے طریقے بتائے جن سے میجر مسکین پر اپنے روپے خرچ کر سکتا تھا۔ میں نے چچا کا ان مفید مشوروں کے لئے شکریہ ادا کیا اور میجر ایک گزرنے والی بس میں دوڑ کر چڑھ گیا۔

''میجر ہے اس کام کے لئے ٹھیک آدمی۔'' چچا عبدالباقی نے کہا ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ سب کچھ عبدالباقی پر چھوڑ دو۔''

دوسری صبح میجر اے آر مسکین چچا عبدالباقی کے مکان پر آیا اور ہمیں اپنے ساتھ اپنی کمپنی کے دفتر میں لے گیا۔ دفتر کھارادر میں ایک غیر اہم گلی میں تھا اور باہر ایک نئے رنگے ہوئے سائن بورڈ پر ''افریقین برادران لمیٹیڈ'' لکھا تھا۔ میجر اے آر مسکین تھوڑی دیر کے لئے ہمیں باہر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ ایک بڑے کمرے میں جو ایک دفتر کے بجائے ایک رہائشی ڈرائنگ روم سے زیادہ مشابہ تھا ایک بے حد موٹا آدمی میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر آدمی کو اکھاڑے اور دنگل کا خیال آتا تھا یہ آدمی ایک رنگین چھپکلیوں والی بش شرٹ پہنے تھا اور ایک بڑے خوش مذاق دیو کی طرح اپنے ساتھ میز پر رکھی ہوئی آلوچوں، سیبوں اور خوبانیوں کی کوئی آدھا درجن پلیٹوں کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ اُس کی دونوں گالیں فواکہات سے پھولی ہوئی تھیں اور اُس کے جبڑوں کو کام کرتے ہوئے

دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ اُس کے پاس ہی ایک چھوٹی میز پر ٹائپ رائٹر کے پیچھے ایک سیاہ چوہی نما عیسائی ٹائپسٹ لڑکی بیٹھی تھی اور وہ اور اُس کا ٹائپ رائٹر اس کمرے میں ایک کاروباری فضا پیدا کرنے کی ہلکی سی کوشش کر رہے تھے۔

خوش مذاق دیو نے کھڑے ہو کر چچا عبدالباقی اور مجھ سے پُر جوش طریقے پر ہاتھ ملایا۔ اُس کے چہرے پر اُس بڑے چیمپین پہلوان کا سا مربیانہ انداز تھا جو اکھاڑے میں چھوٹے اور معمولی پہلوانوں سے اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے معانقہ کر رہا ہو۔ اُس نے ہمیں فواکہات میں شرکت کے لئے کہا۔ میز پر اُس وقت فواکہات کا صفایا ہو چکا تھا۔

میجر مسکین نے میز پر بیٹھے ہوئے اپنے بھائی سے ہمارا تعارف کرایا۔

"بھائی تسکین! ان صاحبوں کو زیبروں کی ضرورت ہے۔ یہ اُن کو گاڑیوں کے آگے جوتنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا ہے کہ میں خود چند دنوں میں نیروبی جا کر جلد از جلد ان کو زیبرے شپ کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ اب یہاں ہم سے بزنس کی ٹرمس وغیرہ پر بات چیت کرنے آئے ہیں۔"

تسکین نے ہمیں ایک کاروباری خوش طبعی سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ حضرات مجھے اس ملک میں دو واحد سمجھ دار کاروباری آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بیحد مسرت ہوئی۔ زیبروں کو گاڑیوں میں جوتنے کا خیال خود مجھے آیا تھا مگر میں اور مسکین امپورٹ کے کام میں اس درجہ مصروف ہیں کہ ہم کسی اور بزنس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ آپ کی اسکیم نہایت خوبصورت ہے۔ زیبروں میں روپیہ ہی روپیہ ہے۔"

میجر مسکین نے کہا "میں نے ان کو سفید زیبرے کے لئے پانچ سو اور بھورے کے لئے ڈھائی سو روپے، ایف۔ او۔ آر کراچی پرائس کوٹ کی ہے۔"

مسکین نے ہمیں پُر جوش طریق سے یقین دلایا "حضرات یقین رکھئے آپ اس قیمت پر گویا زیبروں کو مفت حاصل کر رہے ہیں۔ ڈھائی سو روپے میں تو آج کل زیبرا تو زیبرا گدھا بھی نہیں ملتا۔ ہم نے اگلے روز چودھری سرکس کمپنی کے لئے دو سیاہ زیبروں کا ڈیڑھ ہزار کا آرڈر بک کیا ہے، چونکہ آپ حضرات ہم سے پہلی بار بزنس کر رہے ہیں اور آپ کا آرڈر بھی بڑا

ہے اس لئے آپ کو بہت کم قیمت بتائی گئی ہے۔"

تھوڑی اور بات چیت کے بعد چچا عبدالباقی افریقین برادران سے "مع سفید اور سیاہ زیبروں کا آرڈر بک کرنے پر تیار ہو گیا۔ یہ آرڈر کوئی بیس ہزار کا تھا اور افریقین برادران کی بزنس کی شرائط یہ تھیں کہ آرڈر دیتے وقت کل رقم کا ایک چوتھائی حصہ پیشگی ادا کر دیا جائے۔ افریقین برادران ہمارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور آخر میں وہ اس پر رضا مند ہو گئے کہ دو ہزار روپے پیشگی ادائیگی پر ہمارا آرڈر بک کر لیں گے۔

"اور ہم آپ سے ایک اور رعایت کرتے ہیں۔" تسکین نے کہا، "ہماری شرائط میں ہے کہ بقیہ رقم اس وقت ادا کرنی پڑتی ہے جب بندرگاہ سے ہمارے پاس انوائس پہنچ جائے کہ مال لاد دیا گیا ہے۔ آپ کو بقیہ رقم اُس وقت دینا ہوگی جب زیبرے یہاں ہمارے گودام میں پہنچ جائیں گے۔ ایسی شرائط آپ کو کراچی بھر میں کوئی ایکسپورٹر نہیں دے گا۔"

"آپ زیبروں کو انشور وغیرہ بھی کرانا چاہتے ہیں۔" میجر مسکین نے کہا۔

"ضرور!" چچا عبدالباقی نے جواب دیا "میرا خیال ہے انشور کرنا بہتر رہے گا۔"

"پیکنگ آپ کیسی چاہتے ہیں؟" تسکین نے پوچھا۔

"پیکنگ کا کیا مطلب؟" چچا عبدالباقی بولا "کیا آپ کا مطلب ہے کہ زیبروں کو پیکنگ کیا جائے گا۔"

"یقیناً۔ یقیناً" تسکین بولا "پیکنگ کے بغیر تو اُن کی کھال کی شفافیت اور خوبصورتی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آخر زیبرے ہیں کوئی گھوڑے اور گدھے تو نہیں کہ جیسے ہیں ویسے لاد دیا۔ عموماً اُن کو مومی کپڑے میں ملفوف کر کے جہاز پر لادا جاتا ہے۔"

"ہاں تو پیکنگ بھی کرائی جائے" چچا عبدالباقی نے کہا۔

عیسائی ٹائپسٹ لڑکی نے ہمارا آرڈر بک کیا۔ میں چچا کو وہیں چھوڑ کر گھر سے دو ہزار روپے پیشگی کی رقم لانے کے لئے گیا۔ جب میں واپس آیا تو چچا عبدالباقی ٹائپسٹ لڑکی کی بغل میں بیٹھا تھا، اور ٹائپ رائٹر کی کلک کلک ظاہر کرتی تھی کہ ہمارا آرڈر بڑی تیزی سے ٹائپ ہو رہا ہے۔

"آرڈر آخر بک کر دیا گیا۔ افریقین برادران سے آرڈر کی ایک کاپی اور دو ہزار کی رسید

لے کر ہم باہر آ گئے ۔ چچا عبدالباقی دونوں مسکین اور تسکین کیلئے تعریف اور تحسین سے پر تھا۔

''بزنس مین فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ کس چیز میں آج کل روپے ہیں۔'' اس نے کہا ''تم نے دیکھا، زیبروں کے نام ہی سے تسکین چونک پڑا۔ بختیار! میں تمہیں بتاؤں اُس شخص (تسکین) کی کھوپڑی میں واقعی کاروباری دماغ ہے۔ یہ دونوں بھائی ہمارے لئے خدا نے رحمت کے فرشتے بنا کر بھجوائے ہیں۔''

(۵)

ہم چوتھے پانچویں روز افریقین برادران میں زیبروں کے متعلق پتا کرنے جاتے۔ تسکین کبھی دفتر میں ہوتا، اور کبھی باہر مگر اس کی ٹائپسٹ مس میسی وہیں ہوتی۔ پہلی بار ہمیں بتایا گیا کہ میجر اے آر مسکین نیروبی پہنچ گیا ہے اور سفاری کے انتظام کرنے میں مشغول ہے۔ دوسری دفعہ جانے پر پتا لگا کہ وہ زولوشکاریوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ دریائے زمبی میں ہوچی ٹوچی کی طرف روانہ ہوگیا ہے۔ ایک مہینہ تک وہ وہیں تھا اور چچا عبدالباقی اور میں کچھ فکر مند رہے کہ کہیں اے آر مسکین کو ہوچی ٹوچی کنٹری کے مردم خور حبشی بھون کر نہ کھا گئے ہوں۔ ہمیں اے آر مسکین کے بھونے جانے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنے زیبروں کی۔ آخر ایک دن افریقین برادران میں جانے پر تسکین نے ہمیں اطلاع دی کہ تھوڑی دیر ہوئی اس نے نیروبی سے ایک ٹرنک کال موصول کی ہے۔ مسکین دوسو زیبروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ہے اور ان کی شپنگ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ دودن بعد ہمیں بتایا گیا کہ زیبرے ایس ایس ڈھمرا سے شپ ہوچکے ہیں اور دو ہفتے کے اندر اندر کراچی بندرگاہ میں پہنچ جائیں گے۔ چچا عبدالباقی اور میں اس خبر سے دیوانے ہوگئے اور چچا کی کوٹھی کے پچھواڑے ایک احاطے کو زیبروں کے قیام کے لئے صاف کر دیا گیا۔

دو ہفتے کے بعد افریقین برادران میں جانے پر تسکین ہنس کر بولا۔

''آپ کے زیبرے آگئے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' ہم نے بے تابی سے پوچھا۔

''صبر تو کیجئے۔'' تسکین بولا: ''میرا کلیرنگ ایجنٹ آج صبح ان کو کلیر کر کے لے آیا ہے۔

چنگی ان پر بہت پڑ گئی ہے مگر وہ سب نہایت چست حالت میں ہیں۔اس وقت وہ کلیرنگ ایجنٹ کے گودام میں ہیں۔ایک زیبرا میں نے بطور نمونہ اپنے گودام میں منگوالیا ہے۔آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔''

زیبروں کے آنے کی خبر سُن کر ہمارا خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔تسکین ہمیں کئی کمروں میں سے گذار کر ایک بند کمرے کی طرف لے گیا جس کا دروازہ مقفل تھا۔ایک کھڑکی میں سے جس میں سلاخیں لگی تھیں، ہم نے اندر جھانک کر دیکھا ایک خوبصورت سفید زیبرا اندر کھڑا گھانس کھا رہا تھا۔

''تسکین'' چچا عبدالباقی نے کہا'' دروازہ کھولو میں اُس زیبرے کو تھپکی دینا چاہتا ہوں اور نزدیک سے اُس کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''گودام کی چابی میرے پاس نہیں۔''تسکین بولا''اور دوسرے زیبرا سفر کی وجہ سے کچھ تھکا ہوا ہے خیر باقی زیبرے بھی سب اسی طرح خوبصورت اور تندرست ہیں۔آپ شام کو آکر یہاں سے ان کی ڈیلیوری لے سکتے ہیں۔پانچ ٹرکوں کا انتظام آپ کو کرنا ہوگا۔''

جب جانے لگے تو تسکین نے ہمیں بقیہ رقم کی ادائیگی کے لئے کہا۔ابھی انیس زیبرے آئے تھے اور ہمیں تین ہزار روپے اور افریقین برادران کو ادا کرنا تھا۔بقیہ رقم کے سوال نے اس خوشی کو جو زیبروں کے آجانے سے ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔قدرے ابر آلود کر دیا۔تسکین نے مس میسی کو فوراً ہمارا بل ٹائپ کرنے کے لئے کہا۔

''ابھی ہم ایک ہزار روپے دے سکتے ہیں۔''میں نے کہا۔

''آپ پندرہ زیبرے فی الحال لے جا سکتے ہیں۔''تسکین بولا۔''مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔باقی دو ہزار کے لئے میں ہفتہ تک انتظار کرنے کو تیار ہوں۔''

شام کو ہم پھر افریقین برادران پر دو ٹرک لے کر پہنچے۔کافی دیر ہم کو گلی میں ٹھہرنا پڑا، اور پھر تسکین باہر آیا اور ہمارے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر ہمیں اپنے کلیرنگ ایجنٹ کے مکان پر لے گیا۔اب کافی اندھیا سا ہو چکا تھا،کلیرنگ ایجنٹ ایک چھوٹا سا پھرتیلا آدمی تھا جسے آنکھیں مارنے کی بُری عادت تھی۔وہ ہمیں اپنے مکان کے پچھواڑے ایک احاطے کی طرف لے گیا۔

اس احاطے میں چالیس پچاس کے لگ بھگ زیبرے ہوں گے۔ بہت سے موم جاموں میں ملفوف تھے۔ چچا عبدالباقی اور مجھے یہ دیکھ کر کچھ مایوسی ہوئی کہ زیبرے کچھ قد میں چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ تسکین نے ہمیں سمجھایا کہ یہ بڑی جلدی بڑے ہو جائیں گے اور یہ کہ ان کو سدھانا اور گاڑی کے لئے تیار کرنا نسبتاً آسان ہوگا۔

زیبروں کو ٹرکوں میں لادنا کافی مصیبت ثابت ہوا۔ ایک دو نے مجھ پر دولتیاں چلائیں۔ آخر ڈرائیوروں اور مزدوروں کی مدد سے ہم ان کو ٹرکوں میں لادنے میں کامیاب ہو گئے۔ تسکین بڑا خوش معلوم ہوتا تھا اور اس کی ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔ چھوٹا کلیرنگ ایجنٹ تسکین کو بار بار آنکھ مار رہا تھا۔

ہم زیبروں کو چچا عبدالباقی کے مکان پر لے آئے۔ یہاں ان کو ٹرکوں سے اُتارا گیا اور اس احاطے میں چھوڑ دیا گیا جو خاص ان کے لئے صاف کر دیا گیا تھا اور جس کے گرد ایک چھوٹی چار دیواری تعمیر کی گئی تھی۔ چچا عبدالباقی کے کئی ہمسائے اپنی کوٹھیوں کی چار دیواری پر سے ہمیں اور ہمارے زیبروں کو دلچسپی اور دبی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھ رہے تھے اور چند چچا عبدالباقی کو زیبروں کی برآمد پر مبارک باد دینے کے لئے آئے تھے۔

تسکین ہمارے ساتھ چچا کے مکان پر آیا تھا اور ہمیں زیبروں کی پرورش کے متعلق مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ ان کو پہلے چند دن صرف دودھ اور تازہ کیلے دیئے جائیں۔ ان کو گرم پانی اور صابن سے ہرگز ہرگز نہ نہلایا جائے بلکہ برش سے رگڑ کر صاف کیا جائے وغیرہ وغیرہ مگر ہم اس قدر مضطرب اور خوش تھے کہ اس کی باتوں پر ذرا کم توجہ دے رہے تھے۔ جب تسکین نے ہم سے تمیں زیبروں کی وصولی کی رسید لے لی اور ایک ہزار روپیہ اپنی جیب میں ڈال لیا، تو وہ سیٹی بجاتا ہوا چلا گیا۔

اب کوئی دس بجے کا عمل ہوگا۔ زیبرے بڑے خاموش تھے، سفر نے انہیں مضمحل کر دیا تھا۔ عبدالباقی، میں اور عبدالرحمٰن احاطے کی چار دیواری کے باہر سے ان کی سیاہ کھالوں کو دیکھ رہے تھے۔

''بے چارے بڑے بھوکے ہوں گے۔'' چچا عبدالباقی نے کہا: ''بختیار! بازار جا کر ان

کے لئے اور دودھ لے آؤ۔ تسکین نے کہا ہے کہ پہلے چند دنوں تک ان کو کیلوں اور دودھ کے علاوہ کچھ نہ دیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ تین من دودھ اور بیس درجن کیلے کافی ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی، آج رات کے لئے تو کچھ کرو۔" چچا عبدالباقی نے کہا: "دیکھو بھوک کے مارے ان میں زندگی نظر نہیں آتی۔ کل سے ہمیں باقاعدہ کسی ڈیری اور کسی میوہ منڈی والے سے انتظام کرنا پڑے گا۔"

اتنے میں زیبروں میں سے ایک نے آواز نکالی۔ یہ آواز کچھ گدھے کے ہنہنانے سے ملتی جلتی تھی۔

"یہ تو گدھے کی سی آواز لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ غالباً احاطے سے باہر کسی گدھے کی ہے۔" چچا عبدالباقی نے کہا: "ویسے زیبرے کی آواز بھی گدھے جیسی ہوتی ہے۔"

میں چچا کے گھر سے کچھ مٹکے اور خالی ڈرم لے کر وکٹوریہ میں رکھ کر بازار گیا اور دو تین گھنٹے کے بعد کئی دکانوں پر پھرنے کے بعد دودھ اور کیلے خرید لایا۔ زیبروں کو دودھ پلانے کے بعد ہم سو گئے۔ علی الصبح جب میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا تو زیبرے احاطے میں تھے۔ ان کی دھاریوں میں مجھے کچھ عجب بات معلوم ہوئی۔ دوسرے یہ زیبرے بہت چھوٹے اور بیہودہ نظر آنے والے حیوان معلوم ہوتے تھے۔ تسکین نے ہمارے لئے اچھے اور بڑھیا نسل کے زیبرے درآمد نہ کئے تھے۔

چچا عبدالباقی اس وقت اپنے سوٹ میں ملبوس کمرے میں آیا۔

"بھئی، بختیار، تم ابھی تک بستر میں ہو۔ اٹھو بھائی، زیبروں کے ناشتے کا انتظام کرنا ہے اور اُن کو نہلا کر پوچھنا ہے۔ بیچارے بیحد میلے کچیلے دکھائی دے رہے ہیں۔"

عبدالرحمٰن نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے کہا" میں زیبروں کو نہلاتا ہوں۔"

اور وہ ایک گرم پانی کی بالٹی اور کپڑا لے کر نیچے اُن کو نہلانے چلا گیا۔ چچا عبدالباقی میرے پاس بیٹھ کر مجھے حساب کر کے بتانے لگا کہ اب زیبروں کے آجانے کے بعد اُن کو

پالنے پوسنے سدھانے وغیرہ کے لئے کتنا سرمایہ درکار ہوگا۔ میں اُسے صاف صاف کہنے والا تھا کہ میرے پاس اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں کہ اب عبدالرحمٰن نے نیچے زیبروں کے پاس سے آواز دی۔

''ابا جی۔ یہ ان زیبروں کی دھاریوں کا رنگ تو کچا ہے۔''

''کچا کیا مطلب؟'' چچا عبدالباقی نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا

''دھونے سے اُتر آتا ہے۔ اس زیبرے کو دیکھو میں نے اُسے نہلایا ہے اور اس کی دھاریاں مٹ گئی ہیں۔''

میں چلایا۔ ''میرے خدا، چچا عبدالباقی! یہ تو گدھے ہیں۔''

اسی وقت ڈھینچوں ڈھینچوں کی متحدہ آواز نیچے سے اُٹھی۔ اس دفعہ غلط فہمی کا کوئی احتمال نہیں تھا۔

ہم اسی وقت بھاگے بھاگے افریقین برادران کے دفتر میں پہنچے دروازہ کھٹکھٹانے پر تسکین نے دروازہ کھولا۔ وہ اپنی بنیان پہنے تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں مگدر تھا۔

''آیئے آیئے۔'' اس نے پُر جوش خوش طبعی سے کہا۔ ''میں صبح ڈنٹر پیلنے کا عادی ہوں۔''

''تم نے ہم سے دھوکا کیا۔'' چچا عبدالباقی نے بڑبڑا کر دونوں بازوؤں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا: ''وہ زیبرے نہیں، وہ سب گدھے نکلے۔''

''کیا مطلب ہے؟'' تسکین نے کہا: ''کل شام تم مجھ سے دیکھ بھال کے بعد زیبرے لے گئے۔ وہ رسید جو تم نے مجھے دی ہے اُس میں تم نے صاف لکھا ہے کہ میں نے تیس زیبرے وصول پائے۔ اب اگر کوئی راتوں رات زیبرے کھول کر لے جاتا ہے اور ان کے بجائے گدھے چھوڑ جاتا ہے تو ہم اس کے ذمے دار نہیں ہیں۔ لیکن تم کو کیسے یقین ہے کہ وہ زیبرے نہیں؟''

''زیبرے نہیں، زیبرے نہیں، کیا زیبروں کی آواز ایسی ہوتی ہے؟'' چچا عبدالباقی نے گدھے کے ہنہنانے کی ایک غیر مکمل سی نقل کی۔ ''اور گرم پانی سے دھونے سے ان کی دھاریاں سب ڈھل گئی ہیں۔''

''آپ صاحبان ذرا ٹھنڈے تو ہو جیئے۔'' تسکین نے کہا: ''آپ نے ان کو گرم پانی

سے دھویا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں زیبروں کے لیے گرم پانی مہلک ہے۔ آپ کو انہیں شیل ۱۰۰ سے دھو کر آئل کلاتھ سے صاف کرنا چاہیے تھا۔''

''میں تم پر مقدمہ چلاؤں گا۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔''

''تمہاری رسید میرے پاس ہے جس پر تم نے خود لکھا ہے کہ ہم نے تمیں زیبرے وصول پائے۔''

''تم چار سو بیس ہو، میں تمہاری مونچھیں کھینچ لوں گا۔''

''کیا؟ نکل جاؤ۔ نکل جاؤ، تسکین نے مگدر کو دھمکانے کے انداز میں اُٹھائے ہوئے گلی کے اخیر تک ہمارا پیچھا کیا۔

ہم نے غصّے سے کھولتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے بندر روڈ پر آ کر دم لیا۔ چچا عبدالباقی سخت غصّے کی حالت میں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اس دھوکے باز شخص پر مقدمہ چلائے گا اور اس سے ایک ایک پائی وصول کر کے رہے گا اور دو تین دن تک میں نے اسے بڑے قانون کی کتابوں میں منہمک پایا۔ اس دفعہ کے متعلق وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا، جس کے تحت افریقین برادران پر مقدمہ دائر کیا جا سکتا تھا اور آخر مقدمے بازی کا ارادہ چھوڑ دیا گیا۔ ہماری قانونی پوزیشن واضح نہ تھی۔

اس کے چند دن بعد جب میں افریقین برادران کی کمپنی کے پاس سے گزرا تو نیا رنگا ہوا بورڈ غائب تھا۔ دو لمبے چوڑے شخص جن کی مونچھیں منڈی ہوئی تھیں، ہاتھوں میں کتابیں اُٹھائے دروازے میں کھڑے، مجھے تمسخرانہ طریق سے دیکھ رہے تھے۔ وہ طالب علم تھے، اور ان کے چہرے بے حد آشنا لگے۔ جب میں ان کے پاس سے گزرا تو میں نے ایک لفظ ''زیبرے'' سنا اور آگے جا کر مجھے خیال آیا کہ وہ مسکین اور تسکین تھے...... مونچھوں کے بغیر!

یہ تھی زیبرا اسکیم۔

☆☆☆

مسعود مفتی

تُرپ چال

تھے تو ہمارے بھتیا۔لیکن رقیب بن گئے۔

ویسے تو چچا زادوں میں چھوٹی موٹی رقابت ہوتی ہی ہے اور اگر ان میں نہ ہو تو ان کے بارے میں ان کی ماؤں میں ہوتی ہے۔لیکن یہ رقابت ذرا بڑے پیمانے پر تھی جو عام طور پر پردۂ فلم پر دیکھنے میں آتی ہے یا دل ہلا دینے والے رومانی ناولوں میں پائی جاتی ہے،اور یہ ماؤں کی بجائے صرف ہمارے درمیان تھی کیونکہ مائیں یہ سمجھتی تھیں کہ ہم دونوں ابھی بالکل معصوم ہیں اور ان باتوں کا تو ہمیں پتہ بھی نہیں۔

خیر ماؤں کی بات چھوڑیئے۔وہ تو اپنے بچوں کے بارے میں جس انداز میں سوچتی ہیں اگر وہ درست ہوتا تو شاید اللہ میاں کو دوزخ بند کرنا پڑتی۔یہ قصہ تو بلقیس کا ہے جو ہمارے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ویسے تو اس قابل نہیں تھی کہ کسی کہانی کی ہیروئن بن سکے،یعنی نہ تو حُور شمائل تھی اور نہ فرشتہ خصائل،بس لڑکی تھی اور ادبی دنیا میں ہیروئین ہونے کے لیے یہ بہت کافی ہے۔بلقیس اُجلے کپڑے پہننا پسند کرتی تھی اور ہر فیشن کی فوراً نقل کیا کرتی تھی۔ ملنے والوں کے کپڑوں کو بڑے غور سے دیکھا کرتی تھی اور اس موضوع پر بولنے کی کوشش کیا کرتی جو مجلس میں چل رہا ہوتا باوجود اس امر کے کہ بولنے کے معاملہ میں عورتیں موضوع کی قیدی نہیں ہوتیں باذوق کہلانے کے شوق میں آرٹ وغیرہ سے مجبوراً دلچسپی کا اظہار کیا کرتی تھی۔اس مجبوی کی ماری ہوئی وہ کچھ ہمارے قریب بھی آگئی کیونکہ ہم کالج کی آرٹ ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور ویسے بھی کالج میگزین میں کارٹون بنایا کرتے تھے جو بہت مقبول ہوتے تھے اور جن کی وجہ سے ہم بھی مقبول تھے۔

ہُوا یوں کہ سال شروع ہونے کے تین چار ماہ بعد اس نے ''ہم بھی کچھ ہیں'' کے انداز میں ہمارے کارٹونوں اور تصویروں پر تنقید کر ڈالی اور ہم نے ''بڑے دیکھے ہیں'' کے انداز میں اس کی تنقید پر تنقید کر ڈالی۔ پھر یہی تنقید تقریب بہر ملاقات بن گئی اور یہ ملاقات، بعد میں بقول اس کے ہماری آرٹ سے عقیدت؛ بقول ہمارے اس کی ذات سے عقیدت؟ اور بقول لوگوں کے جوانی کی حماقت بن گئی۔

انہی دنوں عُرفی بھیا نے ہمارے ساتھ ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ ان کے لیے سال کے درمیان داخلہ لینا کوئی عجیب بات نہ تھی کیونکہ وہ تو ساری عمر کسی بھی کلاس میں مُدّتِ معیّنہ کی پابندی اپنے اوپر عائد کرنے کے قائل نہ تھے۔ اب اگر آپ پوچھیں کہ وہ ایم۔ اے تک کیسے پہنچ گئے تھے؟ تو اس کا جواب نہ تو ہم دے سکتے ہیں نہ ہی عرفی بھیا دینا چاہیں گے۔ صرف ان کے وہ ماموں دے سکتے ہیں جو محکمہ تعلیم میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ڈگری وگری تو ان کو بی۔ اے کی مل گئی تھی لیکن دراصل وہ شیزان تک ہی پڑھے ہوئے تھے۔ ہر شام جب وہ ہرے پیاز کے ڈنٹھل کی سی تنگ پتلون کسے، اٹالین شوز پھنسائے اور آدھ من کی عینک پر اپنا دُبلا چہرہ ٹکائے شیزان ریستوران پہنچتے تو ان کے کان میں سمرسٹ مام کی کسی کہانی یا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے کسی مضمون یا برنارڈ شا کے کسی ڈرامے کے نام کی بھنک پڑ جاتی جو شیزان آنے والے لوگ ٹرین کے لائن کلیر کی طرح کہیں راستے میں سے اُٹھا کر لائے ہوتے اور وہاں آ کر اسے اگلنا اپنا فرضِ شیزانی سمجھتے۔ اس لیے تین چار گھنٹے شیزان کے باہر کھڑے رہنے کے بعد جب عرفی بھیا کبھی چائے پیے بغیر اور کبھی کسی کے پلّے سے پی کر گھر لوٹتے تو ان کے دماغ میں اتنا مواد ضرور ہوتا تھا کہ دُوسرے دن کالج کی تفریحی مجالس میں ان کا چلتا چلتا ذکر کر کے سُننے والوں پر رُعب جما سکیں۔ اب یہ محض عرفی بھیا کی بدقسمتی تھی کہ ممتحن کبھی وہاں موجود نہ ہوتا تھا ورنہ وہ کبھی بھی ہر جماعت میں موروثی مزارعہ کی سی حیثیت اِختیار نہ کر پاتے۔

یہ تو خیر جُملہ معترضہ تھا، اصل قصّہ یہ تھا کہ جب عُرفی بھیا نے ہمارے ساتھ داخلہ لیا تو بلقیس کی ہمارے ساتھ دوستی، من تو شُدم تو من شدی، سے ایک درجہ کم تھی کچھ ہمیں ڈرائنگ کا جنون، کچھ اس کی نسوانی خودنمائی، کچھ ہمارے یہاں کے دُور دور سے محبت کرنے کے اُوٹ

پٹا نگ ڈھنگ۔ سب کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم اکثر اس کی تصویریں اور کارٹون بنایا کرتے: روز گارڈن میں، سکالرز گارڈن میں، اودل میں کسی خوشنما بنچ پر اور یہ سب تصویریں اس کی ایک البم میں محفوظ تھیں جن پہ اس قسم کے اُلٹے سیدھے عنوانات چسپاں تھے: ''بلقیس شاعرانہ موڈ میں''، روز گارڈن کا ایک روز''، ''بلقیس سوئی ہوئی''، ''بہار کی ایک صبح کو'' وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ کلاس نوٹس کا ضرورتاً یا مُصلحتاً تبادلہ؛ شیلے، کیٹس اور بائرن کی شاعری پر خواہ مخواہ کے تبصرے، لائبریری میں مل کر ایسی کتابوں کا ڈھونڈنا جن کے بارے میں علم ہوتا کہ نہیں ہیں؛ ہفتہ وار مضمون لکھنے کے لیے اس کا ذکر تک کیے بغیر سارا ہفتہ ملتے رہنا؛ اور جائز رنگ دینے کی کوشش میں اسی قسم کی دوسری معصوم گھاتیں تو عام تھیں۔

عرفی بھیا پہلے تو کچھ عرصہ دیکھتے رہے، پھر ایک روز انھیں احساس ہوا کہ ایک تو وہ شیزان کی زیرِ دہلیز مجلسوں میں عشق کی فرضی ڈینگوں میں پیچھے رہ رہے ہیں اور دوسرے کو ایجوکیشن والے کالج میں پڑھتے ہوئے برآمدے میں یا لائبریری میں کسی لڑکی سے گھل مل کر بات چیت کرنے کی سناب ویلیو بہت ہوتی ہے اور اگر لڑکی بھی بلقیس جیسی آرٹ اور ادب کی دِلدادہ ہو تو دیکھنے والوں پر بہت رعب پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی دن سے یہ ہمارے رقیب بن گئے۔

ہمارے پروفیسر ٹاپ گیئر چونکہ بہت تیز بولنے کے عادی تھے اس لیے کالج کا وقت ختم ہو جانے کے بعد ہم اور بلقیس لائبریری کے اُوپر والے کمرے میں بیٹھ کر نوٹس کا مقابلہ کر کے تصحیح کر لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے دیکھا کہ عین اسی وقت چند روز سے بلا ناغہ کرسی میں دھنسے، پائپ منہ میں اٹکائے، دنیا جہان سے بے خبر ہو کر شیکسپیئر پر ایک موٹی سی کتاب میں ڈوبے ہوتے۔ ہم اندر داخل ہوتے تو بڑی بے نیازی سے ایک آدھ نظر پھینکتے اور بس۔ پائپ منہ میں، کرسی میں نیم دراز، بھوئیں سکڑی ہوئی اور ایک پاؤں ہلتا ہوا۔ جب چار پانچ روز گزر گئے تو بلقیس نے گزرتے گزرتے پوچھا:

''عرفی صاحب آپ کلاس میں تو آتے نہیں، بعد میں باقاعدہ یہاں ہوتے ہیں۔'' تو پائپ جھٹک کر سر کا رُخ ہلکا سا موڑ کر بولے:

''ہاں۔ ہاں۔ کیا کریں؟ اَدب کا مطالعہ کوئی کلاس روم میں تھوڑا ہی ہوتا ہے، یہ تو

کتاب میں ڈوب جانے سے ہوتا ہے اور وہ تو میں اکیلا ہی بیٹھ کر، کر سکتا ہوں۔"

ابھی بلقیس کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ کتاب میں انگلی رکھ کر بند کر کے اس کا سرورق دکھاتے ہوئے بولے: "یہ نئی کتاب پڑھی آپ نے شیکسپیئر پر؟ بالکل نیا زاویہ نگاہ ہے نقاد کا۔ بس مجھے تو سُرور آ رہا ہے اس وقت۔"

"کون مصنف ہے اس کا؟" ہم نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوچھ لیا۔

"بھئی میں ختم کر لوں تو پُوچھنا بلکہ خود ہی لے جانا۔ اب تو مجھے یہ باب ختم کر لینے دو۔ کیا لکھتا ہے ظالم۔"

اور وہ سرور سے سر ہلا کر پھر سے کتاب میں غرق ہو گئے اور بلقیس اُن کا انہماک توڑنے پر پریشان سی ہوتی ہوئی کاپی اُٹھاتے ہوئے ہمارے پاس آ گئی۔

اگلے روز بھی وہ کرسی میں اسی طرح نیم دراز تھے اور کتاب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو منہ سے پائپ نکال کر ہوا میں ہلا کر ہمارے سلام کا جواب دیا اور پھر کتاب میں ڈوب گئے۔

اس سے اگلے روز بھی وہ ایسے ہی بیٹھے تھے اور جب ہم نوٹس کا مقابلہ کر رہے تھے تو بلقیس دبی آواز سے بولتی تھی تاکہ عرفی بھیا کے انہماک میں خلل نہ ہو۔

دو چار روز بعد اتوار تھا۔ ہم امّی کے ساتھ عرفی بھیا کے ہاں گئے تو وہ نہیں تھے۔ ہم ان کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ میز پر شیکسپیئر والی کتاب نظر پڑی۔ ہم نے اُٹھا کر دیکھا تو باہر سرورق شیکسپیئر کی کتاب کا تھا اور اندر ایک جاسوسی ناول رکھا تھا!

چند روز بعد بلقیس کی کتابوں میں ایک نئی کتاب نظر پڑی۔ ہم نے پوچھا کہاں سے لی ہے تو کہنے لگی: "عُرفی صاحب نے ابھی ابھی دی ہے۔ ولیم بلیک کے بارے میں بہت عمدہ تنقید ہے۔" ہم نے کتاب لے کر وَرق گردانی کی۔ کتاب تو بڑی معمولی سی تھی البتہ اس میں کالج یونین کے سالانہ مباحثے کا ایک اِشتہار تہ کیا ہُوا پڑا تھا جو ہفتے بھر بعد منعقد ہونا تھا اور اس کے مقررین کے ناموں میں عُرفی بھیا کا نام امیرِ ایوان کے طور پر تھا۔ ہم تو چونکے ہی تھے، بلقیس بھی حیران ہوئی۔

''عرفی صاحب پائے کے مقرر لگتے ہیں جو امیرِ ایوان بنا دیے گئے۔''

''ممکن ہے ہوں۔'' ہم نے جواب دیا اور دِل ہی دِل میں حیران ہو رہے تھے کہ عرفی بھیا اور تقریر؟ کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں۔ ہم تو ان کو اندر باہر سے جانتے تھے۔ بہر حال خاموش رہے۔ اشتہار پر اتنا بڑا نام چھپا ہونے کی صورت میں ہمارے کہنے کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ دُوسرے دن نوٹس بورڈوں پر، برآمدوں میں، کلاس روم کے دروازوں پر۔ ہر جگہ اشتہاروں میں عرفی بھیا کا نام چمک رہا تھا۔

اگلے روز نوٹس ملاتے ملاتے ہم کافی بور ہو گئے تو بات فلموں کی طرف چل نکلی۔ ہم نے کہا کہ ''جمعے کے روز ''پکنک'' لگ رہی ہے جو لا جواب پکچر ہے، وہ اسی روز دیکھیں گے۔''

''لیکن جمعے کو نہیں جا سکتے۔''

''کیوں؟''

''آپ بھی تو فارغ نہ ہوں گے۔''

''میں تو بالکل فارغ ہوں۔''

''وہ عرفی صاحب نے مباحثے کے لیے مدعو کیا ہے اور کہا تھا کہ حسن کو بھی ضرور لانا۔ اب آپ وہاں تو انکار نہیں کر سکتے۔''

عرفی بھیا کو سُننے کا ہمیں بھی شوق تھا اس لیے پکچر کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

بلقیس کے جانے کے بعد ہم ٹک شاپ کی طرف چلے۔ وہاں ایک طرف چچا ٹارزن اپنے پھکڑ دوستوں کے ساتھ اودھم مچا رہے تھے۔ اِدھر اُدھر چندر تو قسم کے لڑکے بیٹھے چائے پی رہے تھے کیونکہ رات دیر تک پڑھنے کی وجہ سے صُبح انھیں ناشتہ کرنے کا وقت نہ ملا تھا۔ ایک کونے میں ثامی اختر نظر پڑے جو چائے کی پیالی کی اوٹ میں کاغذ پنسل سے کشتی لڑ رہے تھے۔

''ثامی یہ کیا فضول حرکت ہے؟ ٹک شاپ میں بیٹھ کر لکھنا پڑھنا سخت بد اخلاقی ہے۔ بخدا کچھ تو وضع کے بھی پابند رہا کرو۔'' ہم نے کاغذ چھین لیا۔

''اررر ے...... یار سارا موڈ تباہ کر ڈالا۔ لاؤ۔ لاؤ...... لاؤ۔ کاغذ دو جلدی کرو۔'' وہ کاغذ لپیٹنے لگا ''بائی گاڈ آج عمر میں پہلی دفعہ اپنے پلّے سے چائے منگوائی ہے اور تم اس کا بھی

پورا فائدہ نہیں اٹھانے دیتے۔''

''لیکن کر کیا رہے ہو؟''

''تمہیں اس سے کیا؟ اندھا کیا جانے بسنت کی بہار؟''

''بہت بہتر۔ تو یہ اندھا آپ کے بسنت سمیت جا رہا ہے۔'' ہم نے کاغذ لپیٹ کر جیب میں ڈالتے ہوئے چلنے کی تیاری کی۔

''ارے نہیں۔'' وہ اُٹھ کر کاغذ چھیننے لگا، بائی گاڈ نہیں۔ بڑی مشکل سے موڈ بنایا ہے۔ یار تقریر لکھ رہا ہوں۔ پہلے ہی وقت کم رہ گیا ہے۔''

''تقریر کس کے لیے لکھ رہے ہو۔'' ہمیں یقین تھا کہ عرفی بھیا اس کہنہ مشق مقرر سے لکھوا رہے تھے۔

''یار وہ سالانہ مباحثے میں میں امیرِ ایوان ہوں۔ اس وقت خدارا ٹل جاؤ۔ اس روز آ کر جتنا مرضی ہے چھیڑ کر لینا۔''

''امیرِ ایوان؟ وہ کیسے؟ وہ تو عرفی ہے۔'' ہم حیران رہ گئے۔

''ہاہاہا۔ یار بڑا کایاں ہے یہ بھی اور ہم بھی یاروں کے یار ہیں۔ بس یہ کچھ چکر ہے۔ تم یہ کاغذ مجھے دو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

''کاغذ کی ایسی تیسی! یہ معاملہ کیا ہے؟ بائی گاڈ جب تک بتاؤ گے نہیں کاغذ نہیں ملے گا۔''

''نہیں مانو گے۔ اچھا تو جنٹلمنز ایگریمینٹ۔ تم کاغذ مجھے دو اور میں ابھی بتاتا ہوں۔''

ہم نے کاغذ اسے واپس دیا تو نامی اختر بولے:''یار اپنا تو ہر دفعہ اشتہاروں میں نام چھپتا ہے۔ اس دفعہ عرفی کہنے لگا کہ میرا نام چھپ لینے دو تقریر تم کر لینا آخر وقت پر اعلان کر دیں گے کہ عرفی صاحب بیمار ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے صاحب تقریر کہیں گے۔''

''اور تم مان گئے؟''

''ارے بھئی مانتا کیسے نہ؟ ایک تو اس نے مجھے اور پریذیڈنٹ کو شیزان میں زوردار چائے پلائی، اور پھر دو پکچروں کے دکھانے کا وعدہ کیا۔ میں نے بھی سوچا بولیں گے تو تیاری سے لیکن نام ہو جائے گا فی البدیہہ۔ بس ذرا شان بن جائے گی۔''

جمعے کے روز شام کے وقت مباحثہ تھا۔ ہم اور بلقیس صبح لائبریری کے اُوپر والے کمرے میں نوٹس ملانے گئے تو آج عرفی بھیا مع شیکسپیئر والی کتاب کے غائب تھے۔

''مباحثے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔'' بلقیس نے قیاس لگایا۔

''ممکن ہے۔'' ہم کہتے بھی کیا؟ ہمارے تو بھائی تھے!

تھوڑی دیر بعد لیڈیز روم کی ملازمہ نے لا کر ایک بند لفافہ بلقیس کو دیا۔

اس نے کھول کر پڑھا تو افسوس سے چچ چچ کرنے لگی اور پھر رقعہ میری طرف بڑھا دیا:

ڈیر مس بلقیس!

کوئٹہ سے ماموں کا ٹیلیگرام آنے کی وجہ سے مجھے فوراً وہاں جانا پڑ رہا ہے اس لیے مباحثے میں شرکت نہ کر سکوں گا۔ چونکہ آپ کو مدعو کیا تھا اس لیے اگر آپ کو اطلاع نہ دیتا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا۔ اُمید ہے آپ میرے بغیر بھی مباحثے میں شرکت کریں گی اور لُطف اندوز ہوں گی۔ عرفی

''بڑے بااخلاق ہیں عُرفی صاحب۔'' بلقیس بولی۔

''بھائی کس کے ہیں؟'' ہم نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

اسی طرح عرفی بھیا نے بہت پینترے بدلے اور مختلف انداز میں کئی دفعہ کوشش کی۔ لباس کا داؤ تو وہ مستقل کھیل رہے تھے: اٹالین شوز، تنگ پتلونیں، ادنیٰ ٹائیاں، چھوٹے کالر کے ساتھ ٹائی کی مُنی سی انگلش ناٹ اور اس میں ہلکا سا جھول، بڑے کالر کے ساتھ اُونٹ جتنی امریکن ناٹ، کراس پاکٹ کے کوٹ، ایک بٹن کے سُوٹ، پھن دار سانپ کی طرح اکڑے ہوئے پلاسٹک کے کالر، چکنے رخسار کو شرمانے والی چمک دار بُوٹ پالش، لیونڈر کی ہلکی سی خوشبو، کوٹ پر مناسب سا پھول، ہونٹوں پر ہلکی سی سیٹی کی انگریزی دھن، سر کے جھٹکوں سے سنبھلنے والے متحرک بال اور ہر وہ لیپ پوت جو لڑکوں کے سیدھے سادے جسم اور عرفی بھیا کے بے ڈھنگے جغرافیے پر ہو سکتا تھا وہ کرتے تھے۔ اب یہ اور بات ہے کہ مردانہ حسن میں اُن کا جسم اہلِ روما کے معیاری تناسب کی بجائے آم کی چُوسی ہوئی گٹھلی کی مانند تھا اس لیے ان کا چُست لباس دیکھنے والے کو ہمیشہ اس اُلجھن میں ڈال دیتا تھا کہ انگریزی لفظ ''سمارٹ'' کا اُردو ترجمہ کہیں چغد تو نہیں ہے!

اِس مستقل داؤ کے علاوہ دائیں بائیں سے حملے تو وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔ مثلاً بلقیس کی موجودگی میں پائپ پیتے ہوئے ''تھری نن'' کے تمباکو کا ڈبہ بار بار کھولنے کے باوجود لائبریری کے چپراسی سے سگرٹ منگواتے اور اسے ہر دفعہ دس روپے کا نوٹ دیتے جو انھوں نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے یا کسی اور سے اُدھار لیا ہوتا۔ باتوں باتوں میں میرا یا بلقیس کا انگریزی تلفظ غلط بتاتے ہوئے اُسے ذرا بگاڑ کر آکسفورڈ کے تلفظ کا حوالہ دیا کرتے۔ لائبریری کے باہر نئی کتابوں کے سرورق بورڈ پر لگائے جاتے تو ان کے اندرونی چہرے پر جو تعارفی نوٹ ہوتا ہے اسے چوری چوری پڑھتے اور پھر اُسی کتاب کے طرزِ تحریر، مواد، خیالات اور مصنّف کے بارے میں بلقیس کو اس اعتماد سے بتاتے گویا ساری کتاب کئی بار پڑھ چکے ہوں۔ یہ کام بعض اوقات کتابوں کے تبصرے اور دیباچے پڑھ کر بھی کیا کرتے تھے۔ بلقیس جو چیز پسند کرتی اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے اور اگر ہم کسی کتاب، فلم یا نظم کی تعریف کرتے تو منہ بنا کر کہتے: ہاں بُری نہیں ہے......لیکن یُو نو (you Know) میں ذرا مِس بلقیس کی طرح بہتر چیز سے متاثر ہوتا ہوں۔'' اور اس بات پر شہ پا کر بلقیس میری رائے سے ذرا مختلف رائے دینے کی کوشش کرتی۔ شہر میں کسی ادبی مجلس، ڈرامے یا کلچرل شو کی بھنک کبھی کان میں پڑ جاتی تو بلقیس کے سامنے اس اعتماد سے ذکر کرتے گویا وہیں سے اُٹھ کر آرہے ہیں اور یہ ذِکر بڑا سوچ سمجھ کر ہمیشہ ایسے موقعے پر کرتے تھے جب عجلت یا کسی اور وجہ سے تفصیل سے بات کرنے کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔

لیکن ان تمام داؤ پیچ کے باوجود حالت یہ تھی کہ

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

بلقیس کی ہمارے ساتھ دوستی ویسی ہی تھی۔ وہ عرفی بھیا کی علم دوستی سے متاثر ضرور تھی لیکن یہ تاثر دماغ تک تھا، دِل تو ہمارے برش میں اٹکا تھا، اور جب کالج میگزین میں ہمارا کوئی کارٹون چھپتا یا ہم آرٹ ایسوسی ایشن میں کوئی تصویر بناتے تو وہ اس کی تعریف میں لوٹ لوٹ جاتی اور اس کی آنکھوں میں وہ تحریر نظر آجاتی جو عرفی بھیا کے لیے کبھی لکھی نہ گئی تھی۔ دراصل

اسے کچھ تو آرٹ سے فطری لگاؤ تھا اور اس سے زیادہ وہ فیشن کے طور پر آرٹ کی دِلدادہ کہلوانا پسند کرتی تھی۔ چونکہ عورتوں میں فیشن کے تقاضے فطرت پر حاوی ہوتے ہیں اِس لیے اپنے آپ کو کسی نہ کسی آرٹ سے منسلک کرنا اُس کی کمزوری بن گئی تھی۔ اس کا اندازہ عرفی بھیّا کو بھی اس روز ہوا جب ہم نے آئیل کلر میں بلقیس کی ایک بڑی خوبصورت تصویر بنائی اور نیچے کونے میں اپنا نام ''حسن'' لکھا تو اس نے شوخی سے میرے ہاتھ سے برش لے کر ''حسن'' سے پہلے قدرے بڑے حروف میں ''بلقیس'' لکھ دیا اور مجھے ''بلقیس حسن'' لکھا ہوا دکھا کر معنی خیز انداز میں ہنس دی۔ عرفی بھیّا نے نہ معلوم کیوں پوچھا۔

''یہ بھلا کس لیے؟''

تو کھنک کر کہنے لگی: ''یہ تصویر میں اپنے کمرے میں سجاؤں گی اور لوگ سمجھیں گے کہ میں نے بنائی ہے۔''

اور پھر خود ہی تھوڑی دیر سوچ کر سنجیدگی سے کہنے لگی ''عرفی صاحب آپ کو کیا معلوم مجھے مصوّری کا کتنا شوق ہے۔'' پھر شریر چتون سے میری طرف دیکھ کر دبی مسکراہٹ سے بولی: ''اِسی لیے تو آرٹسٹ مجھے اچھے لگتے ہیں۔'' اور اس کے گالوں میں ننھے ننھے گڑھے بھنور کھانے لگے۔

اگلے روز سے عرفی بھیّا کالج سے غائب ہو گئے۔ جب مسلسل ایک ہفتے تک نہ آئے تو کچھ تشویش ہوئی، لیکن یہ خیال اغلب تھا کہ اکثر اوقات دو مہینے کی تعلیمی مصروفیت کے بعد انھیں ڈیڑھ دو سال کے جس آرام کی ضرورت پڑتی ہے، ممکن ہے وہ شروع ہو گیا ہو لیکن دو ہفتے گزرنے کے بعد ایک دن چچی آئیں تو انھوں نے بتایا کہ ان کے سر پر تو ڈرائنگ سیکھنے کا بھوت سوار ہے۔ صبح صبح نیشنل کالج آف آرٹس میں چلا جاتا ہے اور واپس آ کر سارا وقت کمرے میں صراحیاں، گلاس، کتابیں، کپ، گملے، اُلٹے سیدھے رکھ کر ان کی تصویریں بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

ہمیں حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی کیونکہ اسکول کے دنوں میں عرفی بھیّا ڈرائنگ کے پیریڈ کو تفریح کے گھنٹے کے ساتھ ملا کر اپنے انداز میں اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کے قائل تھے۔ اگر کبھی ہفتے عشرے میں کلاس میں آتے بھی تو ہمارے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے

مونگ پھلی اور ٹافیاں چبایا کرتے اور ہم ان کا کام کر دیتے۔ ڈرائنگ کے امتحان میں ان کا پاس ہونا ہمارا اور ان کا تجارتی راز تھا جس کا کھلے بندوں ذکر اُس معاہدے کے خلاف ہے جس کے نتیجے میں ہم اُن کے پلّے سے کئی پکچر دیکھ چکے تھے۔ پچی کی بات کے ساتھ ہمیں بھیا کا ان دنوں کا گھبرایا ہوا چہرہ یاد آ گیا جب کبھی ڈرائنگ ماسٹر صاحب پر اپنی سہ ماہی کارگزاری دکھانے کے لیے سختی کا دورہ پڑتا تھا اور عرفی بھیا کو مجبوراً کلاس میں آنا پڑتا تھا۔ وہ سہمے ہوئے سے سیٹ میں دبکے رہتے اور جب ڈرائنگ ماسٹر صاحب ادھر سے گزرتے تو گھبرائی ہوئی انگلیوں سے ہم سے بنوائے ہوئے ادھورے خاکے پر پنسل پھیرنا شروع کر دیتے۔ ہمیں اُن کی تازہ ترین مہم فرہاد کی کوہکنی سے کم نظر نہ آئی اور ہم اُسی شام ان کے ہاں پہنچ گئے۔

بھیا تو گھر پر نہیں تھے البتہ اُن کا کمرہ اُن کی مصروفیات کا پورا حال بتا رہا تھا۔ میز پر ایک ماڈل بنا تھا جس میں بورڈ کے اُوپر بارہ من کی دھوبن کے پڑھنے والی کتاب تھی۔ اس پر بسکٹوں کا گول ڈبہ اور ساتھ آڑی نکی ہوئی دیگچی تھی۔ سب سے اُوپر ایک کپ پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف کھڑکی پر کھیس تان کر اندھیرا کیا گیا تھا اور دوسری طرف سے کھڑکی کے جڑے پورے کھول کر روشنی اور شیڈ بنایا گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کرسی کے اِردگرد سینکڑوں کاغذ بکھرے پڑے تھے جن پر اس ماڈل کا خاکہ بنانے کی لگاتار کوششیں کی گئی تھیں۔ ہم نے اٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔

دُنیا میں بڑی بڑی چیزیں ناممکن کہی گئی ہیں لیکن وقت گزرنے پر کسی نہ کسی زمانے میں وہ سب ممکن ہو گئی ہیں۔ حتیٰ کہ لوگ چاند پر پہنچنے لگ گئے ہیں۔ لیکن بخدا یقین کریں جو کچھ ہم نے ان کاغذوں میں دیکھا اس کو صحیح طور پر بیان کرنا قرن ہا قرن تک ممکن نہ ہوگا۔ خاکوں کو دیکھ کر اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ کس چیز کی ڈرائنگ بنائی گئی ہے۔ (بشرطیکہ آپ کسی مجبوری کی وجہ سے اُسے ڈرائنگ مان لیں۔) خطوط کا انداز یہ تھا کہ:

نہیں ساحل تیری قسمت میں اے موج
اُبھر کر جس طرف چاہے نکل جا!

کونوں کی جگہ گولائیاں تھیں، گولائیوں کی جگہ مربعے اور بعض خطوط اگر بھرپور انگڑائیاں نہ لے رہے ہوتے تو شاید سیدھے خطوط کہلا سکتے۔ کسی خاکے کا مجموعی اثر یوں تھا جیسے اُونٹ میز

کرسی پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہو، کوئی ایسے لگتا تھا جیسے ساحل کی چکنی ریت پر کیڑے چلتے رہے ہوں۔ ایک میں دیگچی کی ہلکی سی شبیہہ ضرور تھی وہ بھی ایسی جیسے ابھی ابھی میاں بیوی کی لڑائی میں بطورِ دلیل استعمال کی گئی ہو۔ ٹیڑھی میڑھی، دبی پچکی ہوئی۔ کپ کا کسی خاکے میں دُور دُور تک نشان نہ تھا اور کتاب غالباً اپنے سائز کی وجہ سے کسی خاکے میں سمانہ سکتی تھی۔ ربڑ البتہ چاردانگ میں تباہی مچاچکا تھا اور اس کے نقشِ پا ٹریکٹر کے نشانوں کی طرح کاغذ کے سینے پر بکھرے پڑے تھے۔ بار بار مٹانے سے کاغذ کی سطح کھردری ہوگئی تھی اور کہیں کہیں اس کے چھوٹے چھوٹے رووں نے عُرفی بھیا کا گاڑھا پسینہ اس انداز میں چُوسا تھا کہ خاکے میں شیڈ بھرنے کی مزید گنجائش نہ تھی۔

ابھی ہم اس خانۂ عجائب کو دیکھ رہے تھے کہ عرفی بھیا نمودار ہوگئے۔ بغل میں کاغذوں کا دستہ، ہاتھوں میں رنگوں کے ڈبے، جیب سے نئی پنسلیں جھانکتی ہوئیں اور چہرے پر عجب بے زاری ہمیں کمرے میں دیکھا تو وہ تمام لوحِ محفوظ ہمارے ہاتھ سے چھینتے ہوئے چلاّئے:

''تمہیں کس نے کہا تھا میرے کمرے میں آؤ؟ خواہ مخواہ ساری چیزوں کا ستیاناس کر رہے ہو۔''

ہم نے کہا: ''بھیا یہ کیا قصہ ہے؟ آخری وقت میں مسلمان کیوں ہو رہے ہو۔''

''بکو نہیں۔'' بھنا کر بولے ''ہر شخص کی اپنی اپنی ہابی ہے۔''

''ہابی اور قید بامشقت میں بڑا فرق ہے بھیا اور پھر ہابی تو آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے، کوئٹے کے زلزلے کی طرح ایک دم ہی تو نازل نہیں ہو جاتی۔''

''میں نے کہا زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں۔ چلو نکلو میرے کمرے سے تم چچی سے ملنے آئے ہو، وہ نیچے بیٹھی ہیں۔''

''نہیں، میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں۔'' ہم نے ڈھٹائی سے کہا۔

''کالج میں تھوڑا مغز چاٹ لیتے ہو جو یہاں بھی سر پر سوار ہو جاتے ہو؟ امّی یہ حسن کو نیچے بُلا لیں، خواہ مخواہ میری چیزیں خراب کرتا ہے۔''

''آجاؤ حسن بیٹا تم نیچے، اس کا کمرہ تو آج کل کعبہ بن رہا ہے، جو جاتا ہے اُس سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔'' چچی بھی جلی بیٹھی تھیں اور ہم لڑائی کا باقی حصہ اُدھار کر کے نیچے اُتر آئے۔

اِتفاق ایسا ہوا کہ پھر دو تین ہفتوں تک ہم بھیا سے مِل نہ سکے۔ راوی کا کہنا ہے کہ اس عرصے میں انھوں نے ڈرائنگ سیکھنے کے لیے پُورا چلّہ کاٹا لیکن کامیابی اتنی ہی ہوئی کہ آدمی بناتے تو دُمدار تارہ بن جاتا، گھوڑا بناتے تو ہندو پاکستان کا نقشہ بن جاتا، اور کوئی پرندہ بناتے تو گوبھی کا پھول نظر آتا۔ دشمنوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے بازاری تصویروں کو کاربن پیپر سے دُوسرے کاغذ پر اُتارنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن شیڈ کے بغیر خالی خاکہ تو ہل چلے کھیت کی مانند نظر آتا ہے اور شیڈ بھیا کے بس کا روگ نہ تھا۔ بہر حال جب دو ہفتے بعد انھوں نے پھر کالج آنا شروع کیا تو صاف ظاہر تھا کہ آرٹسٹ بننے کا سارا نشہ ہرن ہوگیا اور انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ چند دن بعد ہم ان کے گھر گئے تو وہ سارے خاکے جو اُنھوں نے دیگچی والے ماڈل سے بنائے تھے۔ لکڑیوں والی کوٹھڑی میں پڑے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ویسے اُن کی خاموشی سے اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ بلقیس کو قابو کرنے کے لیے کوئی اور چال سوچ رہے ہوں۔

چند دنوں بعد ہم اور بلقیس آرٹ کی ایک نمائش دیکھ کر آئے اور لائبریری میں بیٹھے اس کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ نمائش میں کچھ تصاویر تجریدی آرٹ کی بھی تھیں اور وہ ان کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔

"دراصل یہ ایبسٹر یکٹ آرٹ ہے، اور ڈِکشنری کے مطابق یہ ایبسٹر یکٹ وہ چیز ہے جو غیر مادّی ہو اور حواسِ خمسہ سے نہ جانچی جائے۔ اس لیے ظاہر ہے جب تک کوئی چھٹی حِس نہ ہو ہم اسے سمجھ نہیں سکتے۔"

اور وہ خود ہی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اِتنے میں عُرفی بھیا بھی آ گئے۔ ہم تجریدی آرٹ کے بارے میں بات چیت کرتے رہے اور وہ خاموشی سے بیٹھے سُنتے رہے۔ بلقیس کو اور ہنسانے کے لیے ہم نے وہ لطیفہ سنا ڈالا کہ دو ٹیڈی بوائز پولیس والوں سے چھپ کر ایک آرٹ گیلری میں گھس گئے۔ وہاں وہ ایک دیوار کے پاس کھڑے ہو کر سامنے کے اسٹینڈ پر تصویریں دیکھ رہے تھے۔ اِتنے میں ایک کی نظر پیچھے گئی تو پُشت والی دیوار پر تجریدی آرٹ کا ایک شاہکار آویزاں تھا لڑکے نے سمجھنے کی کوشش کی لیکن جب کچھ پلّے نہ پڑا تو دُوسرے سے

کہنے لگا: ''جلدی کرو، بھاگو یہاں سے ورنہ لوگ کہیں گے کہ ہم نے اس تصویر کو بگاڑا ہے۔''

وہ ہنستے ہنستے بے دم ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے اُلٹے ہوئے سانس کو سنبھالا اور ضبط کر کے بولی: ''اور وہ نہیں سنا آپ نے کہ تجریدی آرٹ شروع کیسے ہوا تھا؟ کہتے ہیں ایک سنکی خط لکھ رہا تھا تو ایک مکھی اس کی دوات میں گر پڑی۔ کھی کھی کھی کھی۔'' اس کی ہنسی چھوٹ پڑی۔

''تو وہ......تو وہ کھی کھی کھی......تو وہ......تو اس نے مکھی نکال کر کاغذ پر رکھی تو کھی کھی کھی......'' اُس نے منہ میں دوپٹہ ٹھوس لیا اور پیٹ پکڑ کر ہنسی روکنے لگی۔

''مکھی نے جب کاغذ پر اِدھر اُدھر چلنا شروع کیا تو سیاہی میں لتھڑی ہونے کی وجہ سے......کھی کھی......ہی ہی ہی......کاغذ پر اُلٹے سیدھے نقوش بن گئے تو اس سنکی نے مذاق کے لیے وہ کاغذ فرانس کی اکیڈمی آف آرٹس کو بھیج دیا، جنھوں نے......کھی کھی کھی......''

ہنستی ہنستی وہ آنکھوں سے پانی صاف کرنے لگی: ''کھی کھی کھی......تو انھوں نے...... اوفوہ......کھی......ریسرچ کر کے اس پر سو صفحات کا مضمون لکھا کہ ایک نئے آرٹ کا پتا چلا ہے۔''

اور ہمارے ہنسنے کا اِنتظار کیے بغیر وہ ہنستی ہنستی بے دم ہو کر گر پڑی اور بے تحاشا کھلکھلانے لگی۔

عُرفی بھیّا اسے بڑی حسرت سے دیکھتے رہے۔ ایک دم ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی جیسے کوئی تُرپ چال سوجھی ہو اور وہ اُٹھ کر چلے گئے۔

اس کے بعد تین چار روز تک وہ غائب رہے۔ جب آئے تو کتابیں ہاتھ میں اٹھانے کے بجائے چرمی بیگ میں ڈالی ہوئی تھیں۔ ہم نے پوچھا تو بولے: ''اپنا اپنا ذوق ہے۔ مجھے اس طرح اچھی لگتی ہیں۔'' ایک چیز ہم نے خاص طور پر نوٹ کی، اور وہ یہ کہ عرفی بھیا تین چار روز یہ کوشش کرتے رہے کہ بلقیس کی موجودگی میں بات تجریدی آرٹ پر چل نکلے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوتا رہا کہ جب بھی وہ ہر پھر کر اُدھر لاتے تو موضوع کسی وجہ سے بدل جاتا۔ بالآخر چند روز بعد وہ کامیاب ہو گئے اور جب بلقیس نے پھر سے مذاق اُڑانا چاہا تو بڑی سنجیدگی سے بولے:

''نہیں مِس بلقیس اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو آرٹ کی سب سے ماڈرن

شکل ہے اور آپ اس پر ہنس کر دُوسروں کے دل میں یہ خیال پیدا کرتی ہیں کہ آرٹ کے معاملے میں آپ کا ذوق بھی انیسویں صدی میں ہے۔''

آرٹ کے ذوق کے بارے میں بلقیس کوئی بات سُنتا گوارا نہ کر سکتی تھی اس لیے وہ بحث پر تل گئی اور اُس نے تجریدی آرٹ کو بالکل لغو کہہ ڈالا۔ عرفی بھیا طنز سے ہنسنے لگے:

''مجھے آپ جیسی روشنی خیال خاتون کے منہ سے یہ بات سُن کر حیرت ہوتی ہے غالباً آپ کو تجریدی آرٹ کی تھیوری کا علم نہیں۔''

''علم ہے جی سب کچھ۔'' بلقیس کی بحث خالص نسوانی رنگ اختیار کر گئی، بڑے آئے ہیں یہ لوگ آرٹ والے! کیا ہے اس میں نئی بات بھلا؟''

''اب اگر میں آپ کو سمجھانے بیٹھوں تو کئی دن درکار ہوں گے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ بیسویں صدی میں ادب، آرٹ فلسفے وغیرہ کی تمام تحریکیں خارجی ذریعۂ اظہار سے ہٹ کر داخلی ذریعۂ اظہار اختیار کر چکی ہیں۔ اِس طرح ماڈرن آرٹ میں بھی بجائے اس کے کہ مصوّر کسی چیز کی شکل و شباہت کو کاغذ پر فوٹو گراف کی طرح بالکل اُسی جیسی بنا ڈالے وہ اس کی شکل کے بارے میں اپنے داخلی تأثرات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے۔''

''وہ کیسے بھلا؟'' بلقیس اب بھی اَڑی ہوئی تھی۔

''وہ ایسے کہ.....'' انھوں نے اپنا چرمی بیگ کھولا، سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور اندر سے ایک تصویر نکال کر بلقیس کو دی'' اسے دیکھ کر آپ بتائیں کہ کیا سمجھیں؟''

تصویر میں مختلف رنگوں سے داغ دھبّے ملا کر ایک چتکبرا سا ڈیزائن بنایا تھا جس میں کہیں سُرخ رنگ کی زیادتی تھی اور کہیں نیلے کی۔

بلقیس نے اسے دیکھا اور بولی: ''میں کیا خاک سمجھوں گی اس سے! میرے خیال میں تو کسی نہایت گھٹیا کاریگر نے چھینٹ ڈیزائن بنانے کی کوشش کی ہے۔''

''اررر رے!'' عُرفی بھیا افسوسناک لہجے میں بولے'' کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ تو پکاسو کی مشہور تصویر ہے۔ شکر ہے آپ نے میرے ہی سامنے یہ بات کی ورنہ خوش ذوق لوگوں کی کسی محفل میں بات کرتیں تو خواہ مخواہ نکو بن جاتیں۔''

''بھاڑ میں جائیں خوش ذوق لوگ!'' وہ دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

''نہیں یہ بات نہیں۔'' عرفی بڑے ناصحانہ انداز میں بولے۔ ''یہی میں کہتا ہوں کہ اس آرٹ کے سمجھنے کے لیے ذوق کی خاصی تربیت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے اپنے ذوق کی مناسب نشوونما کی ہوتی تو آرٹسٹ نے جس داخلی کیفیت کا اظہار کیا ہے وہ آپ فوراً سمجھ جاتیں۔''

''کیا داخلی کیفیت ہے؟ ذرا ہم بھی تو جانیں۔'' وہ اسی ضد سے بولی۔

''اچھا ٹھہریئے، میں آپ کو بتاؤں۔'' انھوں نے تصویر کو سامنے رکھا اور آنکھیں میچ کر غور سے دیکھنے لگے، پھر بولے: ''دراصل یہ تصویر بتاتی ہے کہ مصوّر شام کے وقت دریا کے کنارے اپنی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہے اور اِنتظار کی کیفیت اِس تصویر میں دکھائی گئی ہے۔ اب آپ کا فرسودہ آرٹ ہو تو وہ پہلے دریا بنائے گا پھر پس منظر میں ڈوبتا ہوا سورج اور شفق اور کنارے پر ایک آدمی کو انتظار کرتے دکھائے گا لیکن ماڈرن آرٹ یہ سب چیزیں نہیں دکھاتا، بلکہ اس اِنتظار کرنے والے کی ذہنی کیفیت بتاتا ہے؛ اور باقی چیزوں کی صرف جھلک دکھاتا ہے نچلے حصّہ میں جو دھبّے ہیں، وہ آپ دیکھتی ہیں کہ سُرخ اور نیلے رنگ سے مل کر بنے ہیں۔ سُرخ رنگ اُمید ظاہر کرتا ہے اور نیلا رنگ مایوسی۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ انتظار کرنے والا اُمید اور مایوسی کے درمیان لٹک رہا ہے اور اس کی یہی ذہنی کیفیت مصوّر نے کاغذ پر بنا ڈالی ہے۔ حالانکہ اس تصویر میں آپ کو آدمی نظر نہیں آتا بلکہ اس کی ذہنی کیفیت کا نہایت فنکارانہ عکس ہے۔''

''اور دریا کِدھر ہے؟'' ہم نے ''وہ مارا'' کے طریقہ سے اعتراض کیا۔

''وہ تو دیکھنے والے کے تخیّل پر چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ یہ تصویر ہے فوٹوگراف نہیں اور مصوّر یہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے والے کا ذوق آرٹ کے معاملے میں اتنا پروردہ ہے کہ ضروری جزیات کو خود بھر لے گا۔''

''اور محبوبہ؟''

''وہ تو ابھی آئی ہی نہیں۔''

''ہٹائیے پرے۔'' بلقیس بے دلی سے بولی، ''ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا۔ یہ جو سب کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا..... معاف کیجئے..... ذوق پروردہ نہیں، ورنہ آپ تصویر پر ایک نظر میں ہی سب کچھ سمجھ جاتیں..... اچھا ٹھہرئیے میں دوسری مثال دیتا ہوں۔''

عرفی بھیا نے چرمی بیگ پھر کھولا اور ایک اور تصویر نکالی۔ تب ہمیں پتا چلا کہ بھیا تین چار روز سے چرمی بیگ کیوں اٹھائے پھر رہے تھے۔ اس تصویر میں پیازی رنگ کے پس منظر پر صفحے کے ایک کونے میں آدھی آنکھ تھی، جس کے گرد بہت بڑا سفید حلقہ تھا۔ تھوڑا نیچے ایک باریک چاند بنا تھا اور صفحے کے نچلے کنارے کے پاس ایک ہار کے دو تین موتی نظر آتے تھے، جن کے درمیان ایک کالا دھبہ تھا۔

''یہ بھلا کیا ہے۔'' وہ بلقیس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

''ہائے اللہ۔ مجھے کیا معلوم؟''

''یہ تصویر میں نے بنائی ہے۔''

''آپ نے؟ تو کیا آپ بھی آرٹسٹ ہیں؟''

''ہاں، لیکن میں ماڈرن آرٹسٹ ہوں۔ مجھے اِس فرسودہ روایتی آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں..... جانتی ہیں اس تصویر میں میں نے کیا دکھایا ہے؟''

''میں کیا جانوں؟''

''یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ کا ذوق پختہ نہیں۔ ورنہ آپ فوراً سمجھ جاتیں کہ یہ آپ ہیں؟''

''میں؟..... اوئی اللہ وہ کیسے؟''

''وہ اِس طرح کہ یہ آنکھ آپ کی علم دوستی اور بصیرت کو ظاہر کرتی ہے اور آدھی سے مراد یہ ہے کہ ابھی آپ کا ذوق پختہ نہیں۔ اس کے گرد بڑا سا حلقہ آپ کی شاندار دماغی صلاحیتوں کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ جو چاند ہے، وہ دراصل آپ کے ہونٹوں کی خوبصورتی کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی یہاں ہونٹ نہیں دکھائے گئے بلکہ ان کی خوبصورتی کا مظہر دکھایا گیا ہے اور یہ کالا داغ آپ کی گردن کے تِل کو ظاہر کرتا ہے۔ گردن کی خوبصورت تراش کو ہار کی حسین قوس سے دکھایا گیا ہے۔ پیازی پس منظر یہ بتاتا ہے کہ ان نشانیوں کے علاوہ، جو لڑکی کے خصوصی حُسن کو دوبالا کرتی ہیں، وہ عام طور پر بھی دوسری لڑکیوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔''

بلقیس اس بیان کے ساتھ ساتھ شرم سے لال ہو رہی تھی اور اپنی تعریف سُن کر اس کا چہرہ کھلتا جا رہا تھا۔

''ہائے اللہ لیکچر کا وقت ہو رہا ہے۔'' وہ گھڑی دیکھ کر بولی اور ہم سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

چند روز بغیر کسی خاص واقعہ کے گُزر گئے۔ سوائے اس کے کہ عرفی بھیا پھر سے کہیں غائب ہو گئے اور کافی دن غائب رہے۔

ایک دن بلقیس حیرت زدہ سی ہمارے پاس آئی اور ایک لفافہ دیتی ہوئی بولی: ''یہ دیکھا آپ نے۔''

کھولا تو اس میں بلقیس کے نام ایک دعوت نامہ تھا۔ جس میں درج تھا کہ لاہور گورنمنٹ کالج کے مایہ ناز آرٹسٹ عرفی کی تصاویر کی نمائش لگ رہی ہے جس کا اِفتتاح نیشنل کالج آف آرٹس کے پرنسپل کریں گے۔

ہم دنگ رہ گئے۔ نمائش وغیرہ لگوانا تو عرفی بھیا کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن اس میں تصویریں کیا ہوں گی؟ یہ سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔

بہر حال اگلے روز ہم وہاں جا پہنچے۔

کافی مہمان موجود تھے، جب ہم پہنچے تو عرفی بھیا نے بڑی فخریہ مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا اور بلقیس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا حسین پمفلٹ دے دیا جس میں نمائش کی تصویروں کی فہرست کے علاوہ عرفی کے آرٹ پر ایک تبصرہ بھی تھا۔ بیٹھنے کے بعد بڑی پُر تکلف چائے دی گئی۔ پھر پرنسپل صاحب نے عرفی کے آرٹ کو سراہتے ہوئے تقریر کی۔ تب نمائش کے کمرہ میں جانے کے لیے فیتہ کاٹا گیا۔

ہم بڑی بے تابی سے کمرہ میں داخل ہوئے۔

......اندر پچیس تیس تصویریں بڑے خوبصورت چوکھٹوں میں آویزاں تھیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان میں زیادہ تر وہی تھیں جو دیگچی والے ماڈل سے بنی تھیں اور اتنے دن لکڑیوں والی کوٹھری میں پڑی جھک مارتی رہی تھیں اور ماڈرن آرٹسٹ بننے کے بعد بھیا نے انہی کو کوٹھری

میں سے اُٹھایا اور کسی میں سے بسکٹوں کا ڈبہ حذف کر ڈالا۔ کسی میں سے دیگچی نکال دی۔ کسی کے کسی حصے میں کوئی رنگ بھر ڈالا اور کسی کے اوپر سیاہی اور رنگ سے آڑے ترچھے خطوط لگا دیے۔ کسی کا چہرہ رنگ دار دھبّوں سے مسخ کر ڈالا تھا اور نیچے اس قسم کے عنوانات دیے تھے:

''عورت''

''انتظار۔''

''کسان کی بیوہ لڑکی۔''

''غروب آفتاب سے ایک منٹ پہلے۔''

''تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی۔''

''ایک تأثر۔''

چلمن کے پیچھے۔''

شہر خموشاں۔'' وغیرہ وغیرہ

عرفی بھیا بلقیس کو ساتھ لے کر گھماتے پھرے اور کبھی کدو کی شکل سے عُمر خیام کے کسی شعر کا حوالہ نکالتے تھے، کہیں رنگ کے دھبّوں سے بیسویں صدی کے سیاسی بحران کے معنی نکالتے تھے، کہیں ایک تکون سے اقبال کے پاکستان کا خواب تعبیر کرتے اور اسی طرح ہر اُوٹ پٹانگ چیز سے کوئی باریک نکتہ نکال لاتے۔

نمائش کے خاتمے پر عرفی ہمارے ساتھ نہ آئے کیونکہ، بقول اُن کے، پریس فوٹو گرافر کچھ تصویروں کی فوٹو لینا چاہتا تھا۔ گو ہمیں فوٹو گرافر نظر نہ آیا۔ واپسی پر میں نے راستے میں بلقیس سے پوچھا۔

''کچھ سمجھ آیا۔''

تو بولی: ''اللہ قسم میرے پلّے تو خاک بھی نہیں پڑا۔ لیکن اتنے لوگ جو تعریف کر رہے تھے تو کچھ تو ہوگا نا ان میں میرا تو ان چیزوں میں ویسے بھی ابھی ذوق پختہ نہیں۔''

''لیکن تعریف تو تم بھی کر رہی تھیں۔''

''اب میں بھلا تعریف نہ کرتی، تو لوگ تو یہی سمجھتے کہ مجھے ماڈرن آرٹ سمجھنے کا سلیقہ

نہیں۔اس لیے تعریف کرنا ہی پڑتی ہے۔''

اگلے دن مجھے دو ایک روز کے لیے راولپنڈی جانا پڑا۔لیکن وہاں جا کر تھوڑا بیمار ہو گیا اور کوئی ڈیڑھ ہفتہ بعد واپس آیا۔واپسی کے فوراً بعد میں بلقیس کے گھر گیا۔اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ موجود نہ تھی۔نوکر اندر دیکھنے گیا اور میں اس کے کمرے میں بیٹھ گیا۔

میں جب بھی بلقیس کے کمرے میں جاتا تھا، اُس تصویر کے نیچے بیٹھتا تھا جو میں نے بنائی تھی اور جس کے نیچے اُس نے ''بلقیس حسن'' لکھ ڈالا تھا۔لیکن اُس روز وہ تصویر غائب تھی اور اس کی جگہ آدھی آنکھ، ہار اور تِل والی وہی تصویر آویزاں تھی، جو عرُفی بھیا نے کالج میں بلقیس کو ماڈرن آرٹ پر بحث کرتے وقت دکھائی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کے کونے پر بلقیس کی تحریر میں ''بلقیس عرُفی'' لکھا تھا۔

میں نے بلقیس کی البم اٹھائی تو اس میں سے بھی میرے کارٹون اور تصویریں غائب تھیں، اور انہی عنوانوں کے تحت عرُفی بھیا کے بنائے ہوئے تجریدی آرٹ کے نمونے تھے۔میں دیکھنے لگا۔

ایک تصویر میں کچھ دائرے، کچھ قوسیں اور کچھ تکونیں تھیں اور عنوان تھا ''بلقیس بہار کی صبح کو۔''

دوسری میں آڑے ترچھے خطوط تھے، جن میں کچھ چکر لٹکے تھے اور نیچے لکھا تھا: ''روز گارڈن کا ایک روز۔''

ایک صفحہ بالکل خالی تھا۔صرف ایک حاشیہ لگا تھا اور عنوان تھا ''سوئی ہوئی بلقیس''۔میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو میری بنی ہوئی سب تصویریں صوفے کے نیچے زمین پر بکھری پڑی تھیں۔

اتنے میں بلقیس کی دبی آواز سے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں نے پردہ ہٹا کر دروازے میں سے جھانکا، تو ساتھ کے کمرے میں بلقیس اور عرُفی بھیا تھے اور۔۔۔۔اُن کی آپس میں دوستی میری اور بلقیس کی دوستی سے ایک قدم آگے بڑھ چکی تھی۔

میں نے اپنی تصویریں اُٹھائیں اور باہر نکل آیا۔

☆☆☆

مظفر حنفی

مہمان

کافی دلچسپ جوڑا تھا۔!

نکلتا قد، سانولی رنگت اور بڑی گہری گہری آنکھیں بیوی کی تھیں جو عمر کی کم از کم تیس بہاریں تو ضرور دیکھ چکی تھیں۔ بھڑ کیلے کپڑوں کی شوقین معلوم ہوتی تھیں یا شاید یہ کپڑے مہمانی کے لیے ہی مخصوص رہے ہوں!

میاں مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ بدن سے گوشت نام کی چیز شاید مدتوں قبل داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ ہڈیوں پر کھال منڈھی ہوئی جس پر وہ بنگالی کرتا، کھدر کا پاجامہ اور واسکٹ ٹانگتے تھے! آنکھوں پر دبیز شیشوں اور پرانے فریم کا چشمہ اپنی بہار دکھاتا تھا۔ عمر کے اُس حصے کو پہنچے ہوئے تھے، جہاں دن رات انسان کو پنشن مل جانے کا دھڑ کا لگا رہتا ہے۔

منصور نے پہلے انھیں کبھی دیکھا تو نہ تھا لیکن اتنا جانتا تھا کہ وہ اس کے ماموں کے بڑے سالے کے کچھ لگتے ہیں۔ تین دن سے وہ بہ حیثیت مہمان براجمان تھے اور مکان کو زعفران زار بنا رکھا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے لطیفے یاد تھے بھائی کو۔

''ایک بار یوں ہوا۔'' انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں تجسس اُبھارنے کے لیے جملہ ادھورا چھوڑ دیا، ناک سے چشمہ اُتارا، بڑی نفاست سے اس کے شیشوں پر منھ سے بھاپ چھوڑ اور کُرتے کے دامن سے صاف کرنے میں مشغول ہو گئے۔

''اے! میں کہتی ہوں یہ تم بیچ میں بات ادھوری کیوں چھوڑ دیتے ہو۔''

''ارے... ہاں۔'' انھوں نے جلدی سے چشمہ ناک پر چڑھا لیا۔ ''میں کہہ رہا تھا کہ ایک مرتبہ بڑا لطف آیا۔ اپنے حاجی رحیم بخش کو تو تم جانتی ہی ہو، ارے وہی جو پان والے چورا

ہے پر بزازی کرتے ہیں اور ہر سال حج کو جاتے ہیں۔"

"ہاں ہاں جانتی ہوں لیکن تم کچھ کہو بھی تو۔"

کہوں کیا دراصل وہ حاجی نہیں ہیں۔"!

"جی کیا فرمایا آپ، نے؟" منصور کی دلچسپی بڑھ گئی۔" ہر سال حج کو بھی جاتے ہیں اور حاجی بھی نہیں ہیں! یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ممکن ہے میاں!" انھوں نے ٹھنڈی سانس لی۔" آج کل سب ممکن ہے۔ جن حاجی رحیم بخش کا میں تذکرہ کرر ہا ہوں وہ اسی قسم کے حاجی ہیں، جنھوں نے کوئی حج نہیں کیا۔ ہر سال حج پر جانے کے لیے چندہ اکٹھا کرتے ہیں، حاجیوں کے ساتھ بمبئی تک جاتے ہیں وہاں اسی پیسے سے اپنی دوکان کے لیے مال خریدتے ہیں اور واپسی میں حاجیوں کے ساتھ ہی لوٹتے ہیں پھر سال بھر تک اپنے گاہکوں کو دیندار بننے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔"

منصور نے کہا——

"آپ کو کیا معلوم کہ وہ حج پر نہیں جاتے؟"

"اتفاقاً معلوم ہو گیا۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔"ایک بار میں اُن کی دوکان سے کپڑا خرید رہا تھا اور وہ زیارت مکہ معظّمہ کے فضائل بیان فرمارہے تھے کہ میں غیرارادی طور پر پوچھ بیٹھا:

"حاجی صاحب قبلہ! آپ نے سنگِ اسود کے دیدار تو ضرور کیے ہوں گے" فرمایا......

"میاں تم دیدار کی بات کرتے ہو وہ بھلا آدمی تو روز آ نہ مجھ سے ملنے میرے ڈیرے پر آتا تھا۔ بیسوں بار میں نے اس کے ساتھ قہوہ پیا ہے۔ بڑا با اخلاق آدمی ہے۔ یہاں ہندوستان میں ایسی ہستیاں کہاں اور ہاں! تم اسے کب سے اور کیسے جانتے ہو۔؟"

میں نے حیران ہو کر کہا۔" حضرت! یہ کس سنگِ اسود کی بات کرر ہے ہیں؟"

"اے میاں!" انھوں نے اینٹھ کر کہا۔" ایسے کیا دس بیس سنگِ اسود ہیں مکہ شریف میں! میں انھیں حاجی سنگِ اسود کی بات کرتا ہوں جو وہاں بڑے چوک میں پان کی دوکان لگاتے ہیں!"

میں نے ہنس کر کہا......

''قبلہ! میں تو اس پتھر کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو حرمِ پاک میں نصب ہے۔''

''میں حاجی ہوں۔'' انھوں نے جھنجھلا کر فرمایا۔'' وہاں کے بارے میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ گئے ہو کبھی مکّے شریف؟ بولو جواب دو!''

میں نے قدرے قائل ہوتے ہوئے عرض کیا۔

''جی گیا تو نہیں لیکن کتابوں میں ضرور پڑھا ہے اور اللہ بخشے ہمارے دادا جان بھی حاجی تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ سنگِ اسود......''

''پتھر ہے۔'' میرا جملہ انھوں نے مکمل کیا۔'' رہا ہوگا ان کے زمانے میں جب مجھ سے ملا تو اچھا خاصا آدمی بن چکا تھا!''

منصور ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ بیوی مسکراتی رہیں اور بڑے میاں چشمہ صاف کرنے میں منہمک ہو گئے، تبھی دوسرے کمرے کے دروازے سے عطیہ نے منصور کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور وہ انھیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اٹھ گیا

''کیوں؟''

''ذرا آہستہ بولیے۔'' عطیہ سرگوشی میں بولی۔'' مہمان نہ سُن لیں کہیں ورنہ بڑی ناموسی ہوگی۔''

''بات کیا ہے؟''

''گھی اور ٹوسٹ ختم ہو گئے ہیں۔ کچھ پیسے ہوں گے آپ کے پاس؟''

''جانتی ہو کہ ہفتے کی آخری تاریخیں ہیں۔ یہی چالیس پچاس روپے بچ رہے ہیں۔ لے لو۔''

اور پھر اگلے چار دنوں میں وہ روپے بھی ختم ہو گئے لیکن مہمان اب تک برقرار تھے اور اُن کے لطیفوں کا اسٹاک بھی ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

''ایک شخص نے اپنی زندگی کا نیا نیا بیمہ کروایا تھا۔ کسی دکاندار سے جھگڑا ہو گیا کہنے لگا بیٹا! بیمے کی قسط نہیں داخل کی ہے ورنہ تجھ سے نپٹ لیتا۔''

منصور نے بڑے خلوص کے ساتھ ہنستے ہنستے دوہرا ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

کیونکہ پھر عطیہ اسے اشارے سے بلا رہی تھی۔ وہ اٹھ گیا۔

''کیوں بھئی کیا بات ہے؟ اب میرے پاس پیسے ویسے نہیں ہیں۔'' اس نے دبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پھر میں کیا کروں؟'' عطیہ رہانسی آواز میں بولی۔ ''باورچی خانے میں تقریباً سبھی سامان ختم ہے۔ مہمانوں کے سامنے بڑی سبکی ہوگی۔''

''دیکھو کوشش کرتا ہوں شاید دوکاندار قرض دے دے۔ اب تک تو ایسا سابقہ نہیں پڑا۔''

منصور باہر آیا تو بڑے میاں نے آواز دے کر کہا۔

''میاں سنو تو کہاں جا رہے ہو؟ بڑا شاندار قصہ ہے۔''

''جی! فرمایئے!''

''ہماری بیگم کے ایک چچازاد بھائی ہیں۔'' انھوں نے نہایت شوخ نظروں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کا بکرا ایک بار مسجد میں گھس گیا۔ لوگوں نے پکڑ کر پٹائی شروع کر دی۔ بے چارے بچانے پہنچے تو ان پر بھی لعن طعن شروع ہوگئی۔ سنتے سنتے تنگ آ گئے تو ہاتھ جوڑ کر بولے۔

''بھائیو! بے زبان جانور ہے۔ بے چارے کے عقل تو ہے نہیں ورنہ مسجد میں کیوں گھستا۔ مجھے دیکھیے چالیس سال سے مسجد کی بغل میں رہتا ہوں کبھی ایسی غلطی کی ہے۔؟ نہیں نہیں انصاف سے آپ ہی بتلایئے؟''

منصور نے ایک فرمائشی قہقہہ جبراً صادر کیا اور قرض لینے چلا گیا۔ پھر قرض سے حاصل کیا ہوا سامان بھی ختم ہو گیا اور نئی تنخواہ بھی جواب دے گئی لیکن مہمان کے لطیفے ڈرائنگ روم میں گونجتے رہے۔

''......پھر کیا؟ بڑے میاں نے سمجھایا کہ نیا نیا خون ہے اور بنواؤ مسجد اپنے گاؤں میں، آخر تمہارے آباواجداد بھی تو تھے وہ کیوں بغیر مسجد کے گزر کرتے رہے ارے بھئی! یہ اپنا گاؤں اللہ میاں کے بھول کھاتے میں پڑا تھا اسی لیے لوگ بہت کم مرتے تھے اب تم نوجوانوں نے مسجد بنوائی ہے۔ صبح ہی صبح اٹھ کر چلاتے ہو، یہ رہا گاؤں، یہ رہا گاؤں موت کے فرشتے نے سن لیا

پلنگ تو صرف بہانا ہے۔"

عطیہ کے اشارے پر منصور بغیر مسکرائے اٹھ گیا۔

"آخر یہ لوگ کب تک براجمان رہیں گے۔" اس نے تشویشناک لہجے میں دریافت کیا۔

"اب میں کیا بتاؤں۔؟" شانے سکوڑتے ہوئے منصور نے جواب دیا۔

"آئے تھے تو کہتے تھے بیوی کو ڈاکٹر اکبر علی کو دکھانا ہے، دو تین دن قیام کریں گے۔"

"ڈاکٹر واکٹر کا تو بہانہ ہے جی!" منصور نے منہ بنا کر کہا۔" ابھی کل ہی ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہہ کر نکلے تھے لیکن اپنا بڈھو کہہ رہا تھا کہ یہاں سے سیدھے ناولٹی ٹاکیز پہنچے اور ٹکٹ لے کر اندر......!"

"آپ کے کوئی قریبی عزیز ہیں کیا؟ میں نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔"

"اجی توبہ کرو!" منصور بولا۔" ماموں جان کے سالے کے کوئی شناسا ہیں۔ میں نے خود کبھی نہیں دیکھا تھا!"

عطیہ نے ماتھا پیٹ لیا۔

"تو پھر گھر میں گھسائے کیوں بیٹھے ہو؟ یہ لوگ ہمیں چوپٹ کرنے پر تلے ہیں۔ کم بختوں کے پیٹ ہیں یا کوٹ دن پھر چرتے ہیں!"

"کیا کروں؟" منصور نے غرّا کر کہا۔ ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کروں مکان سے؟ مہمانوں کے ساتھ یہ بھی تو نہیں کیا جاتا!"

"عذابِ جان کہو جی! مہمان کہاں کے" عطیہ نے زور سے کہا۔ منصور نے جلدی سے اُس کا منھ بند کر دیا اور دونوں ایک دوسرے کو پریشان نظروں سے تاکنے لگے۔

اسی دن رات کو عطیہ نے جھنجھوڑ کر منصور کو جگایا۔

"سنیے تو! بڑے میاں اپنی بیوی کو بڑا شاندار لطیفہ سنا رہے ہیں۔"

"ساڑھے تین بج رہے ہیں۔" منصور نے ٹائم پیس دیکھ کر کہا۔" یہ بھی کوئی لطیفے سنانے کا وقت ہے؟"

"ذرا دھیرے بولیے نا!" عطیہ نے کہا۔ "سُن لیں گے تو غضب ہو جائے گا۔"

''اجی اب تو سن ہی لینے دو۔'' منصور نے بیبا کی سے کہا۔ ''میں اس تکلف بازی سے عاجز آچکا ہوں۔ انھوں نے اپنے باوا کا مکان سمجھ رکھا ہے کیا؟ مہینے بھر سے دھرنا دے کر بیٹھے ہیں۔ میں تو ایسی میزبانی سے عاجز آچکا ہوں۔''

''لیکن سنیئے تو۔'' عطیہ نے اسے پچکارا۔ ''وہ بے چارے تو خود اس مرض کا علاج کرانے ہمارے یہاں آئے ہیں۔''

''کیا بکتی ہو؟ میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''اے اللہ! میں مذاق کب کر رہی ہوں۔ یہی لطیفہ سنانے کے لیے تو آپ کو جگایا تھا۔ ان بے چاروں کے گھر پر خود دو مہینے سے ایک مہمان صاحب بمعہ چار عدد بچوں کے براجمان ہیں۔ جن سے جان بچا کر یہ ہمارے یہاں بھاگ آئے ہیں!''

''عطیہ! سنو! تم بھی تو بہت دنوں سے اپنے بھائی جان کے یہاں نہیں گئی ہو۔''

''ہاں تو پھر ــــ؟''

''کل جب بڑے میاں ڈاکٹر کے ہاں سے پلٹیں گے تو ہمارے مکان میں تالا لگا ہوگا اور ہم دونوں تمہارے بھائی جان کے مہمان ہوں گے!''

عطیہ ہنسنے لگی۔

لیکن جب صبح ہوئی تو بڑے میاں نے منصور کو بلا کر کہا ــــ

''میاں یہ لطیفہ اب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے رات کو تم لوگوں کی گفتگو سُن لی ہے۔ معاف کرنا۔ کیا کریں برخوردار زمانہ ہی کچھ ایسا آ لگا ہے کہ ذرائع آمدنی تو بہت کم ہیں اور تکلفاتِ زندگی کا شمار نہیں۔ بہر حال تمہیں کہیں مہمان ہو کر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج ہم لوگ گھر واپس جا رہے ہیں۔ دعا کرنا کہ وہ ہمارے مہمان وہاں استقبال کرنے کے لیے اب تک موجود نہ ہوں!''

منصور اس بار واقعی روح کی تمام تر شگفتگی کے ساتھ ہنسا، عطیہ نے بھی اُس کا ساتھ دیا لیکن جانے کیوں ساتھ ہی ساتھ اُن سب کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

☆☆☆

جمال درّانی

سرکار بنام سوہنی مہینوال

میں نے اپنے اندر باہر پرکارڈیوائڈر لے کے مختلف زاویوں سے اپنی ذات کا پوسٹ مارٹم کیا تو کئی نئے نئے دریچے بلکہ کواڑ کھلتے گئے۔ پھر میز کرسی پلنگ درخت چرند پرند جانور حتیٰ کہ اپنی شریک حیات اور اقربا کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھتا چلا گیا اور ایک عجیب وغریب منظر سے بہرہ ور ہوا اور انوکھی سی مسرت دل میں پھوٹنے لگی۔ برقی جن بوتل سے تو نکل ہی چکا تھا اس کی تندو تیز نگاہیں کائنات کا احاطہ کرنے لگیں اور تاریخ کے اوراق کو چیرتی ہوئیں شاہ دولہ گیٹ گجرات شہر پر جا کر رک گئیں جہاں ساتھ ہی قدیم زمانے میں دریائے چناب کی سرکش لہریں، جنہوں نے ایک عشق کی لازوال داستان رقم کی ٹکرایا کرتی تھیں۔

انشائیے کے باوا آدم کہتے ہیں کہ انشائیہ محض کسی چیز یا واقعہ پر جواب مضمون کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک ایسا سائنسی اور تجریدی عمل ہے جس سے اس چیز یا واقعہ کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اس صنفِ ادب کا نام ہے جس میں چیزوں کو یا کسی واقعہ یا شخصیات کو ایک ہی کنارے یا زاویہ سے دیکھنے کی بجائے دوسرے کنارے پر کھڑے ہو کر زاویہ معکوس بنا کر دیکھئے۔ آپ کو حیرت انگیز تبدیلی کا احساس ہوگا۔ ذوقِ جنوں بڑھا تو مارکیٹ میں بڑی تلاش کی لیکن شاید کسی بلیکیے نے ایسی نادر کتب کی تمام جلدیں غائب کر دیں یا شائقینِ انشائیہ مہنگے داموں خرید کر لے گئے بہر حال تلاشِ بسیار کے باوجود ہر طرف سے ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا تو سوچا کتابیں پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بقول ورڈز ورتھ۔ ''قدرت خود ایک ہمہ جہت کتاب ہے ان بوسیدہ پتوں کو بند کر کے چار دیواری سے باہر آیئے اور قدرت کے دلفریب رازہائے سربستہ کی گرہیں کھولئے!''

میں خاک افتادہ بھی اسی شوق میں دریائے چناب کی شرقی کدھی پر گجرات شہر کے عین

مقابل جا بیٹھا۔ اسی جگہ کبھی بلخ بخارے کا شہزادہ مرزا عزت بیگ المعروف مہینوال کسی مہ پارہ کے انتظار میں دلِ سرکش کو مضبوطی سے تھامے بیٹھا کرتا تھا اور دریا کے دوسری جانب سے تاروں کی چھاؤں اور اور چندر ما کی چاندنی میں دریا کی طوفانی لہروں سے کھیلتی ہوئی اس کی محبوبہ گھڑے پر تیرتی ہوئی اپنے پیا سے ملنے آیا کرتی تھی۔ یا خدا خیر بیچ میں کچا گھڑا کہاں سے آ گیا؟

میری نظریں اس وقت گجرات شہر میں مرکوز ہیں جہاں محلہ کمہاراں کے قریب ہی کمپنی باغ میں کچہری لگی ہوئی ہے۔ بے شمار بچے بوڑھے جوان یہاں جمع ہیں۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ اتنے میں قاضیُ القضات کی بگھی کچہری کے سامنے آ کر رکتی ہے۔ ایک باریش شخص سر پر سفید عمامہ اور لمبا کالا چوغہ زیبِ تن کئے بڑی تمکنت سے بگھی سے اُترا اور ڈنڈا برداروں کے جلو میں کچہری میں داخل ہو گیا۔ اس کے دائیں اور بائیں دو فرشتے بیٹھ گئے۔ دروازہ سبز پوش سنہرے کمر بند سے مزین دربان نے اکڑ کر سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر بعد بلند آواز میں پکار ہوئی..........................

''مرزا عزت بیگ المعروف مہینوال حاضر ہو!''

دو چوبدار ہاتھوں میں برچھیاں تھامے مہینوال کو پابہ زنجیر عدالت میں پیش کرتے ہیں۔ قاضیُ القضات میز پر ڈنڈا کھڑکاتا ہے اور سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ قاضیُ القضات وکیل سرکار سے'' کیا دعویٰ ہے آپ کا مرزا صاحب کے خلاف؟'' وکیل سرکار: جنابِ والا ملزم مرزا عزت بیگ المعروف مہینوال بغیر ویزا پاسپورٹ ہماری سلطنت میں چور راستوں سے داخل ہوا اور سمگل شدہ مال از قسم زر و جواہر ہینگ نسوار اپنے ساتھ لایا۔ یہ ایک ایسے گینگ سے تعلق رکھتا ہے جو بلخ بخارے سے سمگلنگ کے علاوہ خوبصورت عورتوں پر ڈورے ڈال کر انہیں بلخ بخارے پہنچا دیتے تھے۔ اس دھندے میں ملزم کے ہمراہ اس کا ایک ساتھی بھی آیا اور دونوں شہر گجرات جو اپنے حسن و جمال کے لئے ہند سندھ میں مشہور تھا، میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ دن کو دونوں شہر میں تاڑی بازی کرتے اور رات کو پہرہ داروں سے بچنے کے لئے دریا پار جا کر کپاس کے کھیتوں میں چھپ جاتے۔ جنابِ والا اب میں اصل واقعہ کی طرف آتا ہوں۔ ایک روز ملزم کا ساتھی جو اس جگہ سے قریب ہی واقع ہے جہاں جناب والا تشریف

فرماتیں۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کو بھی قریب ہی سے سوہنی کی خوشبو کے بُلّے ضرور آ رہے ہونگے۔

قاضی القضات میز پر ڈنڈا کھڑکاتا ہے اور غضبناک آواز میں وکیل سرکار کو تنبیہ کرتا ہے۔ ''وکیل سرکار قانون اور اخلاق کے جزیوں سے باہر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ٹھیک ہے ہم نے بھی سوہنی کے حسن کے چرچے گوش گزار کیے ہیں لیکن یہ خیال رہے کہ اس وقت وہ ہماری عدالت میں بطور ملزمہ پیش ہے۔وکیل سرکار توہین عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نقطہ پر فیصلہ کو محفوظ رکھتے ہیں۔آپ اپنا بیان جاری رکھئیے۔'' جناب والا استغاثہ کی داستان کچھ اس طرح ہے کہ تلا گواہ استغاثہ کی کالری گیٹ گجرات شہر کے بالمقابل محلہ کمہاراں میں ایک بہت بڑی برتنوں کی دکان ہے جہاں اس کی جواں سال پری چہرہ بیٹی سوہنی بیٹھا کرتی تھی۔ایک روز ملزم کے ساتھی کا گزر اس بازار سے ہوا اور وہ کچھ برتن سوہنی سے خرید کر کے لے گیا۔اس نے جا کر سوہنی کے حسن و جمال کا ذکر اپنے ساتھی ملزم عزت بیگ المعروف مہینوال سے کیا جو اپنے چھتر وہیں چھوڑ کر بھاگا بھاگا سوہنی کی دکان پر پہنچا اور پہلی ہی نظر میں اس کے حسنِ لازوال کی چمکار سے گھائل ہو گیا۔ جب اس پر غشی کا دورہ پڑنے لگا تو اس کے دوست ملزم نے اسے اپنی جھولی میں سہارا دیا۔سوہنی بھی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئی اور اس کے دوست مجرم اشتہاری سے ناک پر انگلی رکھ کر پوچھنے لگی ''وے بھراوا اینوں کی ہو گیا اے؟'' اس کے ساتھی نے جواب دیا کہ تیرے حسن سے گھائل ہو کر اسے دل کا انجائنا ہو گیا ہے جب تک تو اسے اپنے ہاتھ سے شربت نہیں پلائے گی یہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر تیرے قدموں میں اپنی جان دے دے گا۔وہ دوڑی دوڑی گئی اور مٹی کے پیالے میں بھینس کی میٹھی لسی لے آئی۔سوہنی کے ہاتھ کے لمس سے مرزا صاحب اچھل کر بیٹھ گئے اور لسی کم اور شربتِ دیدار زیادہ پینے لگے۔وہ مٹی کا پیالہ مرزا صاحب نے بیش قیمت جواہرات کے عوض خرید لیا۔اب وہ ہر روز آتا اور اپنی دولت کے عوض مٹی کے برتن سوہنی سے لے جاتا۔سوہنی ایک پاک باز صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھی جس کے حسن و جمال کی دھوم آگ کی طرح ہند سندھ میں پھیل گئی تھی۔اس وجہ سے اس کے باپ نے نوعمری ہی میں اس کے پر کاٹ دیے اور اس کی شادی کر دی لیکن مرزا صاحب اپنا جال پھیلاتا رہا اور اسے

پھانسنے کی ہر ترکیب آزماتا رہا۔ سوہنی بالآخر اس کی بدنیت بھانپ گئی اور اسے ڈرایا دھمکایا کہ وہ شادی شدہ ہے اسے اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ اگر اس کے باپ کو پتہ چل گیا تو وہ دونوں کا قیمہ بنا کر مٹی کے بھانڈے بنا دے گا لیکن مہینوال کے سر پر جنون سوار تھا۔ وہ اپنے ساتھی کو بھیجتا رہا جو سوہنی کو آموں اور مالٹوں کے سبز باغ دکھلاتا رہا۔ بالآخر قصہ کوتاہ یہ کہ وہ معصوم اس کے جال میں پھنس گئی اور اس کے عشق میں تڑپنے لگی۔ ادھر مرزا صاحب ٹکے ٹکے کے محتاج ہو گئے۔ ان کا ساتھی بھی ان کی بدحالی دیکھ کر اپنی جان بچا کر فرار ہو گیا۔ سوہنی نے ان پر ترس کھا کر اپنے باپ سے سفارش کی اور اسے بھینسوں پر چرواہا رکھوا دیا۔ لیکن یہ کمینہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔

وکیل صفائی: میرے موکل کو فاضل وکیل نے کمینہ کہہ کر اسکی توہین کی ہے اور عدالت کی بھی توہین کی ہے۔

قاضی القضات: وکیل سرکار کو تنبیہ کی جاتی ہے اور لفظ ''کمینہ'' ریکارڈ سے حذف کیا جاتا ہے۔

وکیل سرکار: جناب والا کمینہ کوئی گالی نہیں۔ یہ کام کرنے والے کو کہتے ہیں۔

قاضی القضات: عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ عدالت کے حکم پر نکتہ چینی توہین عدالت کے زمرہ میں آتی ہے۔ اس کا فیصلہ بعد میں سنایا جائے گا۔ آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔

وکیل سرکار: جناب والا میں عرض کر رہا تھا کہ ملزم سوہنی کو سروٹوں اور جنگل بیلے میں اغوا کر کے لے جا رہا تھا کہ کوتوال صاحب نے دونوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔ ملزم نے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے اور کسی قسم کی رو رعایت کا مستحق نہیں۔ اسے شہر گجرات کا لری گیٹ کے چوراہے میں سنگسار کئے جانے کا حکم صادر فرما کر کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

بیان بکرم سنگھ گواہ نمبر ا

قاضی القضات: بکرم سنگھ واہ گرو جی کی قسم کھا کر کہو جو کہو گے سچ اور صرف سچ کہو گے۔

بکرم سنگھ: واہ گورو جی کا خالصہ، ست سری اکال جو بولے سونہال، میں واہ گورو جی کی قسم کھا کر تا ہوں کہ جو کہوں گا سچ کہوں گا اور صرف سچ کہوں گا!

قاضی القضات: واقعہ بیان کرو!

بکرم سنگھ: جناب والا چندر ما کی رات تھی۔ من کوتوال منشی لدھا رام اور کرم علی چوبداران کو لے کر اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں دریائے چناں کی کدھی کدھی چوروں ڈاکوؤں کو پکڑنے کے لئے کشتی پر گشت کناں جا رہا تھا کہ چاند کی چاندنی میں مجھے دریا کی سطح پر کوئی چیز لشکتی ہوئی نظر پذیر ہوئی۔ میری آنکھیں چندیا گئیں۔ اپنی کشتی ذرا تیز کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جل پری پانی کی سطح پر تیر کر پرلے کنارے کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔ دریا کے دوسرے کنڈے سے میرے کانوں سے آواز ٹکرائی ''سوہنی!'' جو فضا کی وسعتوں میں پھیل کر غائب ہوگئی۔ میں ٹھنک گیا کہ واہ گورو جی نے آج الف لیلےٰ کی پرستان والی کہانی کا نقاب میری نظروں کے سامنے پلٹ دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ چمکتی ہوئی حسین وجمیل جل پری دریا کے دوسرے کنڈے پر پہنچ کر ایک شخص سے ملی اور دونوں سرکنڈوں سے ہوتے ہوئے بیلے کے جنگل میں چھپ گئے لیکن بکرم سنگھ بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ جل پری نہیں گھر سے بھاگی ہوئی کوئی عورت ہے جسے کوئی شخص اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔ چنانچہ جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میں اپنے چوبداروں سمیت اس خاردار بیلے میں گھس گیا اور دونوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔ ان کی مشکیں کس لیں اور ان کو تھانے لا کر ان کی خاطر تواضع کی تو یہ شخص جس نے اپنا نام مرزا عزت بیگ بتلایا معافیاں مانگنے لگ پڑا اور اقبال جرم کیا کہ اس نے واقعی تلے کمہار کی بیٹی سوہنی کو ورغلا پھسلا کر اغوا کیا تھا۔

مہینوال: حضور کوتوال صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں گرفتار ضرور کیا ہے لیکن ہم تو کنارے پر بیٹھ کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بے شک سوہنی سے تصدیق کر لی جائے۔

قاضی القضات: سوہنی کیا یہ سچ ہے کہ کوتوال صاحب نے تم دونوں کو جنگل میں سے پکڑا تھا اور یہ شخص تمہیں ورغلا پھسلا کر لے گیا تھا۔

سوہنی: میں مہینوال توں صدقے تھیواں۔ کوتوال صاحب نے بڑا ظلم کیا ہے۔ اس نے ہمیں دریا کی کدھی سے پکڑا تھا۔ میرے مہینوال کی چمڑی اس نے چھترول سے ادھیڑ دی اور مجھے.........

قاضی القضات: کہو کہو یہ عدالت ہے ڈرو مت!

سوہنی: بس کیا بتاؤں مجھے دو دن تک اپنے کوارٹر میں رکھا۔

کوتوال: جناب والا یہ دونوں بکواس کر رہے ہیں۔ ہاں البتہ سچ اگلوانے کے لئے میں نے مہینوال کی معمولی سی چھترول کی تھی اور سوہنی سے اپنے کواٹر پر دو دن انٹیروگیشن کرتا رہا پھر جا کر اس نے اپنا صحیح حسب نسب اور تمام واقعات بتلائے۔

قاضی القضات: کوتوال صاحب آپ قانون کے محافظ ہیں۔ قانون آپ کو اجازت نہیں دیتا کہ آپ سچ اگلوانے کے لئے کسی کی چھترول کریں یا کسی خاتون کو اپنے کواٹر پر رکھیں۔ اس کا فیصلہ بعد میں سنایا جائے گا۔

قاضی القضات: گواہ ٹلے کو حاضر کیا جائے۔

ٹلا گواہ حاضر ہوتا ہے۔

قاضی القضات: کلمہ پڑھ کر کہو کہ جو کہو گے سچ اور صرف سچ کہو گے!

ٹُلا: لَا اِلٰہَ اِلّا اللہ محمد الرسول اللہ ۔ میں جو کچھ کہوں گا سچ اور صرف سچ کہوں گا۔

قاضی القضات: واقعہ بیان کرو!

"جناب والا اس دھوکہ باز فریبی کو میں نے رحم کھا کر اپنے ہاں بھینسوں پر ملازم رکھا جس کا صلہ اس نمک حرام نے یہ دیا کہ میری معصوم بیٹی کو ورغلا پھسلا کر اغوا کر لیا۔ حضور اسے سنگسار کرنے کی سزا سنائی جائے۔"

قاضی القضات وکیل صفائی سے: آپ جرح کرنا چاہیں گے!

وکیل صفائی: دیکھو ٹلے تمہاری بیٹی کی عمر کتنی ہوگی؟

"ہوگی تیرہ سال"

وکیل صفائی: "شادی کب کی تھی؟"

"کوئی چھ ماہ ہوئے"

وکیل صفائی: "لڑکی کی رضامندی تم نے یا نکاح خواں نے لی تھی؟"

ٹُلا غصے سے: "مجبور لڑکیوں کی رضامندی کون لیتا ہے۔ وہ تو مہینوال کرتی تھی۔

تجربہ میں اس لفنگے کو اپنی لڑکی کا باجو کیسے پکڑا دیتا جس کا نہ آگا نہ پیچھا۔

وکیل صفائی: جناب والا لفنگا تہذیب سے گرا ہوا لفظ ہے۔ پہلے بھی گواہ نے اسی قبیل کے الفاظ استعمال کئے تھے جو درگزر کئے گئے۔ اسے تنبیہ فرمائی جائے۔"

قاضی القضات: "گواہ کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ ایسے الفاظ توہین عدالت کے زمرہ میں آتے ہیں۔ لفظ لفنگا عدالت کے ریکارڈ سے حذف کیا جاتا ہے۔"

وکیل صفائی: "تمہیں علم ہے کہ شرح محمدیؐ میں شادی کے وقت لڑکی کی رضامندی ضروری ہے؟"

وکیل سرکار: "جنابِ عالی یہ قانونی نقطہ ہے۔ سوال غیر مؤثر ہے۔"

قاضی القضات: "اگلا سوال پوچھیے؟"

وکیل صفائی: یہ بتاؤ کہ اپنی حسین وجمیل نوجوان لڑکی کو برتنوں کی دکان پر کیوں سجا کر رکھا ہوا تھا؟ لامحالہ کسی نے تو اس کے حسن کا شکار ہونا تھا۔"

وکیل سرکار: "جناب والا۔ یہ خواتین کے حقوق پر شرمناک حملہ ہے۔ وکیل صفائی کو ایسے سوالات پوچھنے سے باز رکھا جائے۔"

قاضی القضات: "وکیل صفائی کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ ایسے سوالات پوچھنے سے باز رہیں۔"

وکیل صفائی: "جنابِ والا میں اپنی جرح ختم کرتا ہوں۔"

وکیل سرکار: "جناب والا میں سوہنی کو بطور وعدہ معاف گواہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

قاضی القضات: اجازت ہے۔

سوہنی بدستور مہینوال کی طرف دیکھ رہی ہے اور آہیں بھر رہی ہے۔

قاضی القضات: سوہنی ہماری طرف دیکھو۔ کلمہ پڑھ کر کہو تم جو کہو گی سچ کہو گی۔!

سوہنی قاضی القضات کی طرف نہیں دیکھتی اور کہتی ہے۔ "مہینوال تو صدقے تھیواں"

دل دا کلمہ عاشق پڑھدے، کی جانن یار ہوئی ہو
ایہہ کلمہ اساں نوں پیر پڑھایا، میں سدا سہاگن ہو

قاضی القضات حیرانگی سے: یہ لڑکی پاگل تو نہیں ہے!

تُلا: حجور! مہینوال نے اس پر جادو ٹونہ کیا ہوا ہے۔ ہم نے بڑے منتریوں سے اسے دھونیاں دلوائیں لیکن مہینوال کا جن نہیں اترا۔ جناب والا میں اسے اس کے سسرال ضلع جھنگ بھیج دوں گا۔ اس کی ساس' نندیں انشاءاللہ اس کا جن اتار دیں گی۔

قاضی القضات: اپنی بکواس بند کرو! پہلے بھی تمہیں تنبیہ کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم بار بار عدالت کی کاروائی میں مخل ہو رہے ہو۔

عدالت وکیل سرکار سے: یہ اتنی بھیڑ کیسی ہے؟

وکیل سرکار: جناب والا یہ سوہنی کے عاشقانِ زار ہیں جو اس کی جھلک دیکھنے کے تمنائی ہیں۔

قاضی القضات: مقدمہ کی کاروائی کھلی کچہری میں جاری رکھنا ممکن نہیں۔ آئندہ کاروائی بند کمرے میں ہوگی۔

بند کمرے میں

قاضی القضات: سوہنی ہماری طرف دیکھو۔ کہو جو کہو گی سچ اور صرف سچ کہو گی!

سوہنی: میں مہینوال توں صدقے تھیواں! میں کسی اور نہیں دیکھ سکتی۔

وکیل سرکار: جناب والا یہ مہینوال کے عشق میں ہوش کھو بیٹھی ہے۔ اسے قسم سے مستثیٰ قرار دیا جائے۔

قاضی القضات: سوہنی دیکھو تمہیں مہینوال نے ورغلایا پھسلایا۔

سوہنی: جھوٹ! دھروئی رب دی جھوٹ! میں صدقے تھیواں اپنے ماہی توں! مجھے اس نے نہ ورغلایا نہ پھسلایا۔ میں تو اس کے عشق میں دریا پار کر کے اسے ملنے اپنی مرضی سے گئی تھی۔

قاضی القضات: سوہنی دیکھو! تمہارے والد نے تمہاری شادی کر دی ہوئی تھی۔

سوہنی: ناں! میری شادی میرے مہینوال کے ساتھ عرشوں پر پڑھی گئی تھی۔ پھر شادی پر شادی کون کر سکتا ہے۔ میں کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتی۔ میں تو اپنے مہینوال کے لئے تڑپ رہی ہوں اور زندگی بھر تڑپتی رہوں گی۔

قاضی القضات: دیکھو مرزا عزت بیگ المعروف مہینوال۔ تم نے اپنے خلاف شہادت

سن لی ہے۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔؟

مرزا عزت بیگ: حضور والا میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔ عشق کیا ہے اور عشق کرنے کا گناہ گار ہوں۔ سوہنی کو دیکھ کر۔

''خونے نہ کردہ ام کسے رانہ کشتہ ام

جرم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ام''

(نہ میں نے کسی کا خون کیا ہے نہ ہی کسی کو قتل کیا ہے میرا جرم فقط یہ ہے کہ اس چاند سے مکھڑے سے عشق کیا ہے۔)

قاضی القضات وکیل صفائی سے: آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

وکیل صفائی: جناب والا میرا موکل اس مقدمہ میں بالکل بے گناہ اور بے قصور ہے۔ کوتوال صاحب نے تشدد اور چھتر ول سے میرے موکل سے زبردستی اقبال جرم کروایا جس کی تصدیق خود سوہنی نے اپنے بیان میں کر دی ہے۔ جناب والا عشق کرنا کسی تعزیری جرم میں نہیں آتا۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے سے عشق فرماتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ جناب والا جب میاں بیوی راضی ہیں تو کیا کرے گا قاضی۔

قاضی القضات غصہ سے: آپ اس سے پہلے بھی توہین عدالت کے مرتکب ہو چکے ہیں۔

وکیل صفائی: جناب والا میں نے تو ایک معروف ضرب المثل کا حوالہ دیا ہے۔

قاضی القضات: وکیل صاحب اپنے جامے میں رہیں۔ ابھی آپ کو پتہ نہیں کہ قاضی کیا کچھ کر سکتا ہے۔!

قاضی القضات: اب عدالت اپنے فیصلہ کھلی کچہری میں سنائے گی۔

فیصلہ

''عدالت نے مقدمہ کے تمام واقعات بیانات گواہان وملزمان پر کما حقہ' غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مرزا عزت بیگ المعروف مہینوال کے ورغلانے پھسلانے پر سوہنی اپنے گھر سے بھاگی اور دریا پار کر کے اپنے عاشق مہینوال ملزم سے اپنی مرضی سے ملنے گئی۔ اس طور

پر اس نے مہینوال ملزم کے جرم میں اعانت کی اور اس کے ساتھ مجرمہ ٹھہری۔ بکرم سنگھ کوتوال نے عدالت میں جھوٹی شہادت دی کہ اسنے دونوں کو بیلے سے رنگے ہاتھوں پکڑا۔ کوتوال نے خود تسلیم کیا ہے کہ اس نے مہینوال کی چھتر ول کی اور سوہنی سے دو دن انٹیروگیشن کرتا رہا لیکن تعجب کی بات ہے کہ جب اس کے بیان کے مطابق مہینوال نے اقبال جرم کر لیا تھا تو سوہنی کو انٹیروگیشن کے لئے اپنے کوارٹر پر رکھنے کا سوائے بدنیتی کے کیا جواز ہوسکتا ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ تلا گواہ نے اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف پڑھوایا۔ لہٰذا عدالت ایسے غیر اخلاقی اور غیر شرعی نکاح کو فسخ کرتی ہے۔ لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح دوبارہ شرعی طریقہ سے پڑھوایا جائے۔

عدالت مرزا عزت بیگ المعروف مہینوال کو ایک نابالغہ کو اغوا کرنے کے جرم میں تیس کوڑے اور دو سال قید سخت کی سزا سناتی ہے۔ سوہنی کے والد تلا۔ نکاح خواں اور نکاح کے گواہان کو زبردستی ایک نابالغہ کا نکاح پڑھوانے کے جرم میں تیس تیس کوڑے اور تین سال قید سخت کی سزا دی جاتی ہے۔ بکرم سنگھ کوتوال جو لوگوں کی جان و مال کا محافظ تھا، نے نہ صرف اپنے فرائض منصبی سے روگردانی کی بلکہ ایک قبیح جرم کا مرتکب ہوا اس لئے اسے چار سال قید سخت اور ایک صد دروں کی سزا سنائی جاتی ہے۔ ہر دو وکلا صاحبان سرکار و صفائی دوران سماعت مقدمہ توہین عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہر دو کے لائسنس وکالت ضبط کئے جاتے ہیں اور ہر دو کو توہین عدالت میں ایک ایک سال قید محض اور پانچ پانچ ہزار درہم جرمانہ کیا جاتا ہے۔ اب صرف سوہنی کے خلاف جرم کی سزا رہ جاتی ہے۔ سوہنی کی کم سنی، معصومیت اور حسن ملیح کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے لئے تا برخواست کچہری کی سزا کافی سمجھی جاتی ہے۔ وہ عرصہ دو سال تک پروبیشن پر ہمارے حرم میں زیر نگرانی رہے گی۔

تو صاحبو! آپ نے سوہنی مہینوال کا قصہ آج ایک نئے زاویہ سے ملاحظہ فرمایا امید ہے محظوظ ہوئے ہونگے.......... آپ ضرور سوچ رہے ہونگے کہ آخر سوہنی مہینوال کا انجام کیا ہوا۔ تو آپ بھی دعا کریں اور میں بھی کرتا ہوں کہ سوہنی کو پروبیشن سے رستگاری مل جائے اور مہینوال کو جیل سے۔ تب تک کے لئے رب راکھا!

☆☆☆

پرویز یداللہ مہدی

عمر بھر کا ساتھ

پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر گھستا چلا گیا۔ ابھی وہ برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ ایک کھنکتی ہوئی نورانی آواز کانوں سے ٹکرائی! ''آیئے تشریف لایئے'' اُسے یوں لگا جیسے کہیں پاس ہی شیشے سے شیشہ ٹکرایا ہو اور پھر پلک جھپکتے ہی ایک چنچل سی نازنین کا سراپا نمودار ہوا اور اُس رنگ و نور کے مجسّمے کو دیکھتے ہی اُس کا دل مچل اُٹھا۔

شیشے پھر کھنکے ''بندی کو نازش کہتے ہیں۔ نام آپ کے لیے نیا نہیں ہے اور چہرہ بھی دیکھا بھالا ہے۔ میری تصویر کو آپ نے خوب جی بھر کر دیکھا ہوگا، تین مہینے سے آپ کے پاس ہے غالباً پسند آئی ہوگی، بے شک آئی ہوگی تب ہی تو بات بڑھ سکی ہے نا......''

''سُنیے تو محترمہ......''

''جی نہیں، آپ بس چُپ چاپ یہاں تشریف رکھیے۔ آج آپ کچھ سُنانے نہیں بلکہ ہماری سُننے کے لیے تشریف لائے ہیں۔''

''سُننے کے لیے! مگر محترمہ سُنیے تو میرا مطلب ہے۔ دیکھیے تو......''

''دیکھیے شوق سے دیکھیے جی بھر کر دیکھیے۔ لیکن سُنیئے صرف ہماری آیا۔ خیالِ شریف میں ؟'' جی وہ خیالِ شریف تو آپ کی اس پنجے جھاڑ شرافت کو دیکھ کر ہی نو دو گیارہ ہو گیا''۔ ''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اس وقت امّی اور ابّو بھی نہیں ہیں۔ ہم ذرا کھل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں میں نے اِسی سال بی، اے کیا ہے سکینڈ ڈویژن۔ یقیناً جانتے ہوں گے۔ کیوں کہ شادی کے سلسلے میں آپ کی پہلی شرط یہی ہے کہ لڑکی گریجویٹ ہو، سائنس کی ہو تو ترجیح دی جائے گی اور اگر آرٹس کی ہو تو وہ بھی چلے گی۔ مگر تھرڈ ڈویژن نہیں اور اس سلسلے میں بدقسمتی سے

میں خوش قسمت ہوں۔ ہاں تو اس ایک شرط کے علاوہ آپ کی چند اور بھی شرائط ہیں۔ مثلاً یہی کہ لڑکی خوب صورت ہو، کھلتا ہوا رنگ، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، دراز گھنیری زلفیں، قد کم از کم پانچ فٹ پانچ انچ، صحت قابلِ رشک ہو بے باک ہو، مگر نہ بہت زیادہ فیشن ایبل ہو اور نہ ہی ایک دم دقیانوسی پھٹیچر ٹائپ۔ انگریزی فر فر بولتی ہو۔''

''جی ہاں فر فر بلکہ اس فر فر میں ''الف'' اور ''ر'' کا اضافہ کیا جائے تو کیسی رہے گی؟

''الف'' اور ''ر''......اوہ سمجھی، آپ کا مطلب ہے فرار......''

''بہت خوب۔ اشارہ سمجھ لیا ہے میں نے۔ ویسے فرار ممکن ہے۔ لیکن ابھی نہیں۔ پہلے مجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ لینے دیجئے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ آپ اپنی شریکِ حیات میں ان تمام چیزوں کو ایک جا دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اسی لئے اپنی والدہ اور بہنوں کے دماغ میں ایک ایسی ہی لڑکی کا اسکیچ اُتار دیا اور وہ بے چاریاں نکل کھڑی ہوئیں اُس کی تلاش میں اور پھر ایک دن اُن کی خوش قسمتی اور ہماری بدقسمتی کا میل ہوا۔ وہ ہمارے گھر آدھمکیں اور مجھے دیکھتے ہی اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے دماغ پر چھائی ہوئی وہ تصویر انسانی روپ میں ڈھل گئی اور بس۔''

''جی نہیں، صرف بس نہیں بلکہ ڈبل بس۔''

''دیکھئے آپ یوں بار بار مداخلت نہ کیجئے۔''

''غلطی ہوگئی۔ معافی چاہتا ہوں۔ دراصل میں یہ بھول گیا تھا کہ آپ کے دولت کدے میں داخل ہوتے ہی میں ہر قسم کی جائز مداخلت کے حق سے بھی محروم ہو چکا ہوں، خیر آپ سنائیے اپنی داستان۔''

''اب داستان رہ ہی کیا گئی ہے، آپ کی والدہ اور بہنوں نے مجھے دیکھتے ہی پسند کرلیا اور دوسرے ہی دن لین دین اور جوڑے وغیرہ کی رقم کے سلسلے میں بات چیت شروع ہوگئی جو میری نظر میں اصل فتور کی جڑ ہے......''

''اور آپ کی یہ بڑ، اسی فتور کی جڑ کے متعلق ہے......''

''جی ہاں، میں اس جوڑے گھوڑے کے سخت خلاف ہوں۔ کبھی آپ نے کسی باپ کو اپنی بیٹی کو یوں ہی کسی کے گلے باندھتے ہوئے دیکھا ہے، ایک باپ اپنی حیثیت کے مطابق بلکہ

اکثر اپنی حیثیت سے بڑھ کر ہی اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان لڑکے والوں کی یہ طرح طرح کی مانگیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہونے والے داماد صاحب کی پانچ ہزار، دس ہزار کی اِس مانگ کو میں قطعی ناجائز سمجھتی ہوں اور پھر بات اس جوڑے گھوڑے تک ہی ہوتی تو غنیمت تھا۔ اصل رونا تو یہ ہے کہ ایک کثیر رقم کی مانگ کے علاوہ اور بھی کئی چیزوں کی بطورِ خاص فرمائش کی جاتی ہے۔ آپ سُن رہے ہیں نا جناب؟''

''جی ہاں بالکل۔ مجھے تو اب دِل چسپی پیدا ہو رہی ہے۔ آپ نہایت خوبصورتی سے حقیقت پر پڑا ہوا پردہ اُٹھا رہی ہیں، میں اِس قسم کی نقاب کشائی کا مدتوں سے منتظر تھا بہر حال آپ آگے کہیے، میں نہ صرف سُن رہا ہوں بلکہ سمجھ بھی رہا ہوں۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ہاں تو فرمائشوں کی یہ فہرست ویسے تو ہمہ اقسام کی الّم غلّم چیزوں سے بھری ہوتی ہے مگر میں یہاں صرف چند خاص چیزوں پر ہی روشنی ڈالوں گی۔ ایک عدد سکوٹر یا سائیکل کی فرمائش اس فہرست کا اہم جز ہوتی ہے، پھر ایک ریڈیو گرام یا ریڈیو کا نمبر آتا ہے۔ پھر ایک عدد گھڑی وہ بھی درآمد شدہ اور اس کے علاوہ......''

''فریج، ٹائپ رائٹر، بجلی کا پنکھا، سنگھار میز، اسٹیل کی الماریاں، فوم ربر کے بستر سے لیس پلنگ، صوفہ سیٹ، ڈِنر سیٹ، فروٹ سیٹ، ٹی سیٹ......''

''معافی چاہتا ہوں، دراصل آپ کے اس جذباتی اندازِ بیان نے ذرا مجھے بھی جذباتی بنا دیا تھا۔ اس لئے میں بہک گیا۔ لیجئے اب میں چُپ ہوں۔ آپ آگے کہیے۔''

''آگے کہنے سے پہلے یہ بات واضح کر دوں کہ میری اس گفتگو سے آپ کہیں یہ اندازہ نہ لگا لیجئے کہ میں کسی مفلس وقلاش باپ کی بیٹی ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ کے فضل سے میرے ابّو کی مالی حالت اس قابل ہے کہ میری شادی پر پندرہ بیس ہزار تک خرچ کر سکتے ہیں۔ باجی کی شادی پر تو انہوں نے چالیس ہزار کے لگ بھگ خرچ کئے تھے۔''

''کئے ہونگے صاحب، ضرور کئے ہوں گے۔ اللہ دولت دے تو خرچ کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کی باجی کی شادی پر تو چالیس ہزار کے لگ بھگ خرچ کر دیئے لیکن آپ کے سلسلے میں پچاس فیصدی بجٹ کیوں گھٹا دیا؟''

''صاف ظاہر ہے، باجی کی شادی کے وقت وہ برسرِ کار تھے اور اب وظیفہ یاب ہیں۔ بہر حال پندرہ بیس ہزار تک خرچ کر دینا اب بھی اُنکے لئے مشکل نہیں، مگر آپ نے جو اپنی فرمائشوں کی فہرست بہ طورِ خاص بھیجی ہے......''

''فرمائشوں کی فہرست نہیں، بلکہ الکٹرک بل ہوگا۔''

''چلئے بل ہی سہی۔ بہر حال آپ کے اس بل کو دیکھ کر دِل تھام لینا پڑا، کیونکہ آپ کی فرمائشوں کی فہرست دیکھ کر پتہ چلا کہ پندرہ بیس ہزار سے تو آپ کا پتہ بھی نہیں ہلے گا۔ آپ کی اس فہرست نے میرے اس تصور کو بڑی طرح مجروح کر دیا جو میں نے اپنے شریک زندگی کے متعلق باندھ رکھا تھا۔ فرض کیجئے میں ایک مفلس باپ کی بیٹی ہوں تو کیا میرا بھی وہی حشر نہ ہوتا جو اور ہزاروں لاکھوں غریب لڑکیوں کا ہوتا ہے...آخر آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا ان غریب لڑکیوں کے سینوں میں ارمان نہیں ہوتے، جذبات نہیں ہوتے، احساسات نہیں ہوتے؟ کیا ان کے دِل میں اپنے گھر کی، شوہر کی، بچوں کی آرزو نہیں ہوتی؛ آرزو جس کی تکمیل کی خاطر انہیں اپنی عزت و آبرو سے خود کھیلنا پڑتا ہے، اور پھر انجام کار رسوائیوں کے گہرے غار میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتی ہیں اور اُن کی اس تباہی و بربادی کا ذمہ دار ہے ہمارا یہ کھوکھلا سماج اور یہ بزدل نوجوان، جو لڑکی سے زیادہ اُس کی دولت کے بھوکے ہوتے ہیں۔''

''جی ہاں بالکل بے شک بھوکے ہوتے ہیں۔ خدا اُن کی اس بھوک کا خاتمہ بالخیر کرے ورنہ ایک دن وہ آئے گا جب اِن معصوم لڑکیوں کی آہوں کا ایک ریلا اٹھے گا اور اُن سب کو فنا کر دے گا اور آنے والی نسلیں اُن بزدل نوجوانوں کے بارے میں کہیں گی کہ خس کم جہاں پاک......''

''جناب آپ میری ہاں میں ہاں کیوں ملا رہے ہیں۔''

''جی نہیں میں تو آپ کی ناں میں ہاں ملا رہا ہوں۔ خیر آپ آگے کہئے، میں مثلِ خرگوش ہمہ تن گوش ہوں۔''

''آپ کی اِس زندہ دِلی کا اعتراف کرتے ہوئے کہنا یہ ہے کہ میں اپنی سہیلیوں کے سامنے عہد کر چکی ہوں کہ میں صرف اُسی شخص کو اپنا شریکِ زندگی بناؤں گی جسے صرف میری چاہ ہو،

میرے روپے پیسے کی نہیں اور اِسی لئے آج آپ کو یہاں بلایا ہے، تاکہ میرے خیالات جاننے کے بعد شاید آپ اپنی فرمائشوں کی فہرست پر نظرِ ثانی کریں۔ ویسے آپ کی فرمائشوں کی فہرست دیکھنے کے بعد ہی ارادہ تھا کہ فوراً انکار کردوں لیکن پھر سوچا کہ کیوں نہ آپ کو ایک موقع دیا جائے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مانا کہ آپ خاندانی ہیں۔ صورت شکل بھی بُری نہیں اور پھر پڑھے لکھے بھی ہیں، انجینئرنگ کی ڈگری رکھتے ہیں۔ پانچ سو روپے تنخواہ پاتے ہیں۔"

"پ...... پہ...... پانچ سو روپے......"

"جی ہاں۔ اور اِس دور میں لڑکیوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بلکہ اُبلی پڑی ہیں، کوئی بھی باپ بہ خوشی یا مجبوراً آپ کی ساری جا و بے جا فرمائشیں اور مانگیں پوری کرہی دے گا۔ اب بتایئے آپ کا کیا فیصلہ ہے، اپنی فرمائشوں کی لسٹ واپس لے کر مجھے اپنا بنانے کا، یا پھر اپنی فرمائشوں کا پٹارہ لے کر کوئی اور در کھٹکھٹانے کا، ایسی صورت میں مجھے انکار کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ابّو نے مجھے پوری آزادی دے رکھی ہے......"

اُسی پل ایک ملازمہ ہانپتی کانپتی داخل ہوئی اور آتے ہی کہنے لگی۔ بی بی جی، بی بی جی! غضب ہوگیا! وہ جو چھٹی آپ نے امجد میاں کے نام لکھی تھی نا! اُسے پڑھنے کے بعد اُن کے سارے گھر میں وہ ہلڑ مچا کہ اللہ کی پناہ! کوئی آپ کو آزاد، اُوباش کہہ رہا ہے تو کوئی آپ کو یوں امجد میاں کے نام چھٹی لکھنے اور انہیں اکیلے بلانے پر طرح طرح کے نام دھر رہا ہے اور امجد میاں کی اماں تو کہہ رہی تھیں کہ اچھا ہوا شادی سے پہلے ہی اُس چھوکری کی قلعی کھل گئی۔ اتنی دیدہ دلیری توبہ توبہ!"

"اری کم بخت یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟" نازش نے گڑبڑا کر کہا، اور پھر اُس اجنبی نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "ذرا انہیں غور سے دیکھ! کیا یہ امجد نہیں؟"

"نہیں بی بی جی، یہ امجد میاں نہیں۔"

"کیا کہا یہ امجد نہیں؟" اس کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں اور پھر وہ اُس اجنبی پر برس پڑی۔ "جناب آخر آپ ہیں کون جو اتنی بے تکلفی سے یہاں اتنی دیر سے براجمان ہیں۔"

"دیکھئے محترمہ، آپ یوں آنکھیں لال پیلی نہ کیجئے۔ میں یہاں اپنی مرضی سے بیٹھا

نہیں بلکہ بٹھایا گیا ہوں۔نوجوان نے نہایت ادب سے کہا، اور نازش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ ذرا نرم لہجے میں بولی "معاف کیجئے مجھ سے غلطی ہوگئی۔ دراصل میں نے آپ کو وہ سمجھ لیا تھا جو کہ آپ نہیں ہیں۔"

"اب جب کہ آپ نے مجھے وہ سمجھ ہی لیا ہے جو میں نہیں ہوں، حالانکہ میں وہی ہوں جو میں ہوں تو کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔" نوجوان نے جواب طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اُس کے ہلکے سے اشارے پر نہایت سلجھے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔" مجھے امتیاز کہتے ہیں۔ میں اسٹیٹ الکٹرک ڈپارٹمنٹ میں انسپکٹر ہوں۔ آپ کے الکٹرک میٹر کے بارے میں آپ کے ہاں سے متعدد شکایتیں آئی تھیں، اسی لئے میں میٹر بدلنے آیا تھا۔ لیکن آپ نے مجھے کچھ اور سمجھ لیا، میں نے اِس درمیان کئی بار اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی، مگر آپ نے ہر بار چپ کرادیا اور میں بھی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق بس آپ ہی کی سنتا رہا اور شروع شروع میں سر دھنتا رہا۔ مگر جوں جوں آپ کی گفتگو بڑھتی گئی۔ میری دِلچسپی بھی بڑھتی گئی اور میں متاثر ہوتا گیا۔ دراصل اس لین دین اور جوڑے وغیرہ کے سلسلے میں میرے بھی بالکل آپ کے سے خیالات ہیں، یعنی اِس سلسلے میں ہم دونوں ہم خیال ہیں۔ میں بھی ان باتوں کو ایک لعنت سمجھتا ہوں۔ دراصل خود لڑکی کے والدین نے ان غیر ضروری چیزوں کو اپنے اوپر فرض تصور کرلیا ہے۔ بہرحال آپ کی بے باکی اور صاف گوئی نے مجھے کچھ زیادہ متاثر کیا ہے کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کہیں اِسے گستاخی نہ سمجھ لیں، اِسی لئے کہنے سے جھجک رہا ہوں......"

"جھجکنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ بے خوف ہوکر کہیے......"

"دیکھئے میرے پاس انجینئرنگ کی ڈگری تو نہیں ہے، ہاں الکٹریل انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا ہے، اور آجکل ڈگری کی تیاری کررہا ہوں، میری تنخواہ بھی فی الوقت پانچ سو نہیں بلکہ سوا تین سو ہے، البتہ خاندانی ضرور ہوں۔ آپ کے چچازاد بھائی اشفاق میرے خاندان سے اچھی طرح واقف ہیں، ایک آبائی مکان ہے جس میں ہم سب رہتے ہیں، بڑے بھائی، بھابی صاحبہ اُن کے چار بچے اور ایک چھوٹا بھائی۔ والد صاحب کی فی الوقت پانچ چھ سو روپے ماہوار

آمدنی ہے۔ بھائی صاحب کے سوا دو سو کے لگ بھگ آتے ہیں اور میرے سوا تین سو روپے ہیں۔ مگر سب خوش ہیں۔ معیارِ زندگی متوسط ہے۔ اب رہا صورت شکل کا سوال، تو جو بھی کچھ ہوں جیسا بھی ہوں، آپ کے سامنے ہوں۔ بہرحال میرے بارے میں اتنا سب جاننے کے بعد اگر آپ بُرا نہ مانیں تو اپنی والدہ اور بھابی کو بھیجوں، آپ کے والدین کے پاس.....'' ایتاز کے ایک ایک لفظ سے سچائی اور خلوص ٹپک رہا تھا۔

''نازش کی نظریں شرم سے خود بہ خود جھک گئیں، اس نے زبان ہلانی چاہی مگر لب صرف پھڑ پھڑا کر رہ گئے، اُس کی بے باکی جانے کہاں رفو چکر ہوگئی تھی، امتیاز اُس کے اِس انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا، ''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا، کیا میں اپنی بھابی اور والدہ کو بھیجوں آپ کے ہاں...''

''آپ کی مرضی..'' پل بھر کو نظر اُٹھی، لب ہلے اور وہ شرما کر اندر بھاگ گئی، اور امتیاز گنگناتا ہوا خوش خوش برآمدے سے باہر نکلا ہی تھا کہ شیشے پھر کھنکے'' میٹر تو بدلتے جایئے......''

''وہ تو بدلا جاچکا......''

''کب؟ کون سا؟''

''ابھی ابھی، وہی جو سینے میں دھڑکتا ہے......'' وہ بڑی برجستگی سے بولا اور اُدھر ایک نازک سا ہاتھ کھڑکی کی اوٹ سے لہرایا'' خدا حافظ'' اور امتیاز مسکراتا ہوا باہر نکل گیا......''

☆☆☆

سلمٰی یاسمین نجمی

کوئے ملامت

ادھر سولہواں سال لگا اُدھر پیغامات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نہ لوگوں کو ہی والدین کے گھر میں ہمارا قیام بھلا لگا اور نہ امّی جان ہی اس بات کی قائل نظر آتی تھیں کہ لڑکیاں ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھیں۔ انہی پیغامات میں سے ایک ان حضرت کا بھی تھا جن کو آگے چل کر ہمارے مجازی خدا بننے کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔ بات چیت چل رہی تھی بلکہ یوں سمجھئے کہ رینگ رہی تھی۔ ہم ابھی ایف اے میں تھے اور ہمارا ذاتی خیال پی ایچ ڈی کرنے کا تھا۔ مسز کے دم چھلّے سے زیادہ نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ لگانے کی تمنا تھی۔

ہم اپنی تمنا کی تکمیل میں محو تھے اور لوگ اپنی ریشہ دوانیوں میں۔ ویسے بھی یہ صاحب سات سمندر پار تشریف رکھتے تھے۔ لہٰذا فوراً آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہماری امّی جان نے بن دیکھے تقویٰ اور پرہیز گاری کی بنیاد پر اور لوگوں کی باتوں پر اعتبار کر کے اُن کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا اور جواب میں ایک عدد بڑی جناتی قسم کی انگوٹھی عطا ہوئی، جس میں ہماری کوئی انگلی بھی سمانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی، البتہ اگر ہم اسے زیب گلو کرنے کا قصد کرتے تو دوسری بات تھی۔ ہماری چھوٹی ہمشیرہ نے پوری ایک عدد دھاگے کی پیچک بڑے استقلال اور صبر سے استعمال کی۔ تب کہیں جا کر وہ محترمہ ہماری ایک نحیف انگلی میں چند لمحوں کے لیے ٹک سکیں، چونکہ زیور کپڑے سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا لہٰذا اس کے عظیم الجثہ ہونے کا افسوس بھی نہ ہوا۔

منگنی کے بعد ہمارے بہن بھائیوں نے بڑی ضد کی کہ یہ کیا ہوا کہ بھائی جان نہ ہم سے ملے نہ ہم نے انہیں دیکھا۔ ایک بار پاکستان تشریف بھی لائے تو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور چپکے سے کھسک گئے۔ ہم ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔ اب کم از کم تصویر ہی منگوا دیجئے۔ آئیڈیا تو

ہو کہ حضرت ہیں کس قبیل کے۔ آخر ہم انہیں پہچانیں گے کیسے۔

''پہچاننے کی بھی خوب رہی۔ جب وقت آئے گا تو خود بخود پہچان لو گے۔''

''کیا وہ گلے میں تختی لٹکائے آئیں گے کہ ہم دولہا ہیں۔ ہم ہر ایک سے غلط توقعات باندھتے رہیں اور اس کے گلے کا ہار ہوتے رہیں۔ آخر تصویر منگوانے میں کیا حرج ہے۔ اب اتنے متقی بھی نہ ہوں گے کہ ہم سے ہی پردہ کرنے بیٹھ جائیں۔'' ہمارے برادرِ خورد بولے۔

مجبور ہو کر امی جان نے ان کی بہن کو کئی خط لکھے کہ بھئی تصویر بھیج دو۔ سب دیکھنے کے شوقین ہیں، مگر وہ صاحب بھی بلا کے شرمیلے تھے اور اوپر سے پابند شریعت بھی، ٹس سے نہ ہوئے۔ انہیں یاد کرایا گیا کہ پاسپورٹ کے لیے تو ضرور تصویر کھچوائی گئی ہوگی۔ وہاں تو پردہ نشینی سے کام نہ چلا ہوگا، وہی بھجوا دیں۔ معلوم ہوا کہ اتنی ہی تصویریں اُتروائی گئی تھیں جن کی ضرورت تھی۔ اب پاسپورٹ پر سے تو تصویر اُتار کر نہیں بھیجی جا سکتی۔

میرے بہن بھائی تو اس پر بھی رضامند تھے کہ کوئی بچپن کی انگوٹھا چوستی تصویر ہی بھیجوا دیں۔ بنیاد سے عمارت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرلیں گے۔ ہماری ہونے والی نند کو کچھ رحم آ گیا۔ انہوں نے اپنے جملہ کاغذات کھنگال ڈالے اور ایک در نایاب ڈھونڈ نکالا اور بس آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ بھجوا دیا۔ یہ تصویر اس زمانے کی تھی جب لڑکپن جوانی سے ملنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں والدہ کو حج کرانے کی سعادت بھی حاصل کی تھی، لہٰذا بال منڈاتے ہی پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ اپنی من موہنی صورت کی ایک تصویر بطور یادگار کھچوالی۔ اولے وہاں پڑتے نہیں تھے اس لیے ٹوپی پگڑی کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سر صحرائے عرب کی طرح چٹیل پڑا تھا۔ یقیناً بال تو ضرور رہے ہوں گے مگر تصویر میں ایسے کوئی آثار نہ تھے۔ پیشانی اور سر کی حدود کے درمیان خط متارکہ ٹوٹ چکا تھا۔ دھان پان سے پہلے ہی واقع ہوئے تھے۔ غلطی سے بھی ایک چھٹانک وزن کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ حج کی محنت وصعوبت سے اوریجنل وزن بھی بیس پونڈ کم ہو چکا تھا، چنانچہ اچھا بھلا سوٹ جھلنگا لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کسی سے مانگ کر پہنا ہے۔ پہنا کیا ہے بانس پر لٹکا دیا ہے اور شاید مانگ کر ہی پہنا ہو تصویر اُتروانے کے لیے۔ اس لیے کہ جو حلیہ تھا اس کے ساتھ سوٹ کی کوئی مناسبت نہ تھی۔ کرتا

پاجامہ، شیروانی اور تہمد البتہ چل سکتے تھے۔ وزن کی کمی کے باعث لمبی ناک مزید لمبی نظر آ رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں عینک میں کچھ اور ''اِن لارجڈ'' لگ رہی تھیں۔ آدمی شرع پر چلتا ہوا اور ڈاڑھی نہ رکھے۔ خواہ وہ نکلے یا نہ نکلے مگر رکھنی تو سنت تھی، چنانچہ اس سنت پر بھی عمل کیا گیا تھا۔

امی جان نے تو تصویر دیکھتے ہی فوراً چھپانے میں عافیت سمجھی۔ خواہ مخواہ چنڈالوں کے ہاتھ میں ایسی نیک صورت اور بابرکت تصویر دینے سے بے حرمتی کا شدید خطرہ تھا مگر ادھر سب کو سن گن مل چکی تھی کہ تصویر آ گئی ہے۔ چونکہ امی ٹال مٹول کر رہی تھیں۔ لہٰذا بہن بھائیوں نے خود ہی چھاپہ مارنے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز جب وہ گھر پر نہیں تھیں۔ انہوں نے مل کر ان کا سارا بکس کھنگال ڈالا۔ ہم اپنے کمرے میں کچھ پڑھ رہے تھے، یکلخت ہماری سماعت سے اپنے برادر خورد کا ایک چیخ نما نعرہ ٹکرایا، ہم لرز کر رہ گئے۔ بہن کے رونے کی آواز سن کر کتاب، ڈوپٹہ اور چپل چھوڑ کر ہم امی کے کمرے کی طرف دوڑے۔ ان دونوں کی حالت دیکھ کر ہم پر بھی سکتہ طاری ہو گیا۔ بمشکل کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا! ''کیا ہوا؟'' بھائی نے ہمارے کانپتے ہاتھوں میں تصویر تھما دی۔ پہلی نگاہ کے ساتھ ہی مارے خوف کے ایک دلدوز چیخ ہمارے حلق سے برآمد ہوئی اور ہم بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے۔ اب عالم یہ تھا کہ ہم تینوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے رو رہے تھے۔ تصویر، دوسری نظر ڈالے بغیر کہ ایک ہی کافی تھی جوں کی توں وہیں چھپا دی گئی۔

''ہائے میری آپا کی قسمت پھوٹ گئی۔ اب کیا ہوگا۔ ان شیخ چلی کو کون دولہا بھائی کہہ کر پکارنے کی ہمت کرے گا۔'' چھوٹی ہمشیرہ نے بین کیا۔

روتے روتے ہمیں بے اختیار ہنسی آ گئی۔ بھائی صاحب بولے! شیخ چلی سے زیادہ تو چچا چھکّن جونیئر لگ رہے تھے۔''

''اس نے کون سا شیخ چلی کو دیکھا ہے۔ مگر ایمان سے آپا اس تصویر سے ہرگز مختلف نہ ہوں گے۔''

''شیخ چلی ہوں یا چچا چھکّن، تم یہ بتاؤ کہ اب کیا کیا جائے۔'' ہم نے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے۔ صاف انکار کر دو کہ میں ان چچا چھکّن سے شادی نہیں کروں گی۔''

''واہ جی واہ مجھے کیا تمیں مار خان سمجھ رکھا ہے۔ میں کیسے کر سکتی ہوں انکار۔''

''تو نہ کرو، رو کیوں رہی ہو پھر۔ مزے سے شادی کر لو۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ تمہیں چچی چھکنی بننے کا اتنا شوق ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے تمہیں آپا۔ آخر تم کیسے ان جیسے شیخ چلی سے شادی کر سکتی ہو۔ حد ہو گئی۔ کیا کہیں گی تمہاری سہیلیاں اور پروفیسرز۔ کیا انہیں شادی میں نہیں بلاؤ گی اور تمہاری سہیلی مسرّت باجی وہ تو مذاق اُڑا اُڑا کر تمہاری جان ضیق میں کر دیں گی۔''

ہم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا! ''میں اپنی کسی سہیلی کو نہیں بلواؤں گی۔''

''مگر کرو گی انہی چچا چھکّن سے شادی۔'' بھائی نے لقمہ دیا۔

''تصویر دیکھ کر آپا کے تو حواس ہی جاتے رہے، بھلا دیکھو یہ اپنی سہیلیوں کو نہیں بلائیں گی آخر کیا بہانہ کریں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنی شادی پر نہیں بلا سکتی اس لیے کہ جن حضرت سے میرا ناطہ جوڑا جا رہا ہے وہ ہو بہو شیخ چلی لگتے ہیں۔''

''پتہ نہیں ان کو ڈاڑھی رکھنے کی کیا سوجھی تھی کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاڑھی سرے سے اگی ہی نہ ہو اور انہوں نے سنّت پر عمل کرنے کی خاطر چند بال گوند سے چپکا لیے ہوں'' بھائی جان بولے۔

''میں کہتی ہوں سب رشتے دار عزیز محلے والے کیا کہیں گے۔ ایک تو شکل ایسی اوپر سے یہ چار بال بھی لٹکا لیے۔ بھئی یا تو آدمی پوری ڈاڑھی رکھے یا نہ رکھے۔ یہ کہیں کہیں دو چار بالوں کی جھالر لٹکانے کی کوئی تک نہیں ہے۔''

''شرم نہیں آتی تمہیں سنّت رسول کا مذاق اُڑاتے۔'' ہم نے اور شدّت سے رونا شروع کر دیا۔

''لو بھئی ان کے تو دماغ کا علاج بھی کرانا پڑے گا'' بھائی تنک کر بولا۔

''یہ اپنی بد قسمتی کی بجائے اس بات پر بھوں بھوں کر رہی ہیں کہ ہم سنّت رسول کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ تم گھاس تو نہیں چر گئیں۔ ہم سنّت رسول کا مذاق اُڑا رہے ہیں یا ان کی مضحکہ خیز ڈاڑھی کا ذکر کر رہے ہیں۔ ارے بھئی اگر ڈھنگ کی ڈاڑھی نہیں اُگ رہی تھی اور رکھنی بھی ضروری تھی تو ایک ڈاڑھی کی وِگ بنا کر چپکا لیتے۔''

''باز نہیں آؤ گے تم لوگ۔'' ہم نے اپنی سرخ ناک کو دوپٹے سے مسلتے ہوئے کہا۔

''میں کہتی ہوں فضول باتوں کی بجائے کوئی مناسب چال تلاش کرو۔ یہ تو طے ہے کہ ان حضرت خوجی سے آپا کا نباہ مشکل ہے......''

''تصویر تم نے غور سے دیکھی تھی۔ قرولی تو نہیں ہاتھ میں۔'' بھائی نے بات کاٹی۔

''جب میں بات کرتی ہوں تم ضرور درمیان میں ٹانگ اڑاتے ہو۔ مجھے قرولی دیکھنے کا ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جب تصویر دیکھ کر یہ عالم ہے تو اگر سچ مچ وہ ساری زندگی کو سامنے آن کھڑے ہوئے تو یہ تو روتی روتی اندھی ہو جائیں گی۔''

''یہ کیا بدفال منہ سے نکال رہی ہو۔ میں کیوں ہوں اندھی۔'' ہم صاف بُرا مان گئے۔

''نہ......نہ......تم کیوں اندھی ہوگی۔ تمہارے تو دیکھتے ہی چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ آنکھ میں نور دل میں سرور پیدا ہوگا۔''

''دھیان رکھنا کہیں یوسف ثانی کو دیکھ کر بجائے انگوٹھے کے پورا ہاتھ کلائی تک نہ اُڑا دینا۔''

''ہائے۔ ہائے کیسے ستم گر بہن بھائی ہیں۔ کوئی مجھے اندھا بنائے دے رہا ہے، کوئی سرے سے ہاتھ کا دشمن ہوا ہے۔''

''تو پھر انکار کیوں نہیں کر دیتیں۔ میں کس منہ سے اپنے دوستوں کو بلا کر درشن کراؤں گا۔ لیجئے ان سے ملئے یہ ہیں ہمارے بہنوئی براہ راست ولایت سے درآمد کئے گئے ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ انہیں سعید لخت کا حافظ جی سمجھ بیٹھیں اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کریں کہ وہ کردار جیتا جاگتا دیکھ لیا جس کے بارے میں اب تک پڑھا ہی تھا۔''

''اف اللہ میری سہیلیاں بھی تو آئیں گی۔ میں کیا جواب دوں گی۔ ان کو کیسے بتاؤں گی کہ یہ میرے دولہا بھائی ہیں۔''

مارے گھبراہٹ کے ہمارے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔ اوپر سے ان ظالموں کے کھینچے ہوئے بھیانک نقشے۔ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں غائب غلا ہو گئی تھیں۔ آخر خاصی بحث وتمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہم قطعی خاموش رہیں گے۔ یہ دونوں ہمارے وکیل بن کر امی جان کے حضور جائینگے اور کیس پلیڈ کریں گے۔

امی نے سب کچھ بڑے صبر اور تحمل سے سُنا اور صاف کہہ دیا کہ شریفوں میں زبان دے کر پیچھے نہیں ہٹا جاتا۔ جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ تصویر سے کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جبکہ وہ ہے بھی چھ سات سال پرانی۔ والدہ، والد اور بہن اچھی شکل وصورت اور شخصیت کے مالک ہیں، وہ ان سے اتنا مختلف نہیں ہوسکتا اور پھر مردوں کی صورت کون دیکھتا ہے۔ شادی کرنے آئے گا۔ مقابلہ حسن میں حصہ لینے تو نہیں آرہا۔ میاں ہوتا ہے ڈیکوریشن پیس نہیں کہ ڈرائنگ روم میں سجانے یا سہیلیوں کو دکھانے کے کام آئے۔

بھائی بولا! ''آپ بھی عجیب لوگ ہیں۔ دیکھا نہ بھالا اور پٹ منگنی کردی۔ کبھی کسی نے ایسے بھی کیا ہے۔ ہماری بہن فالتو تو نہیں ہے جو اس طرح میاں خوجی کے حوالے کیا جارہا ہے۔

بہن نے مصالحت کی راہ نکالی! ''امی کیا ایسے نہیں ہوسکتا کہ اس دن دولہا کوئی اور بن جائے تھوڑی دیر کے لیے۔''

امی غضب ناک ہوگئیں۔ ''دماغ خراب ہوگیا ہے تم سب کا۔ میرا الگ خراب کئے دے رہے ہو۔ دولہا ہے یا ہاتھی کا دانت، دکھانے کا اور کھانے کا اور......''

''کھانے کا نہیں نکاحنے یا نباہنے کا لفظ استعمال کریں۔'' بھائی نے حسب معمول بات کاٹی امی نے سنی ان سنی کردی اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''نہ ایسا دیکھا نہ سنا کہ دولہا کوئی اور بنے شادی کسی اور سے ہو۔''

''کیوں نہیں ہوا۔ اپنی جوانی میں ابا جی نہیں ایک بار دولہا بن کر چلے گئے تھے حالانکہ شادی ان کے ایک چرخ کزن کی تھی؟'' بھائی نے یاد دلایا۔

''وہ تو لڑکپنے کی ایک شرارت تھی اور پھر اس کا انجام کیا بُرا ہوا۔ دلہن بے چاری نے جھانک کر دیکھا اور انہیں ہی اصل دولہا سمجھ بیٹھی اور جب بعد میں راز کھلا کہ اس سرخ سفید وجیہہ شخص کی بجائے یہ بھوندو اصل میں دولہا ہے تو پھر ساری عمر اس کے گھر نہ بس سکی۔''

''یہاں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے امی۔ آپا پہلے سے سب کچھ جانتی ہوں گی۔ وہ دیکھی، بنا سیتی میں بخوبی فرق کرلیں گی۔''

''بھاگ جاؤ یہاں سے میں اب اس موضوع پر اور کچھ نہ سنوں گی۔''

اور یہ وفد ناکام واپس آ گیا اور ہم بھی بظاہر اپنی تقدیر پر شاکر ہو گئے۔ بی اے کا امتحان دیتے ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور ہم اس غم میں سوکھنے لگے کہ ہمارے جیسی خوش مذاق اور ذوق جمال رکھنے والی کو تمام عمر شیخ چلی صاحب کی صورت دیکھ دیکھ کر گزارنی ہو گی۔ پندرہ دن پہلے سے بھوک پیاس اور نیند سب اُڑ گئی تھی۔ سب کچھ جیسے عالم بے ہوشی میں ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں ہم دلہن بنے اور رخصت بھی ہو گئے۔ برات کو جلد اور دور جانا تھا اس لیے رخصتی عجب افراتفری اور ہنگامے میں ہوئی۔ ہماری بہن اور بھائی کو موقع ہی نہ ملا کہ وہ ہمیں ان کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچا سکیں یا پھر ان کے خدشات درست ثابت ہوئے تھے اور اب ہمیں بتلا کر وہ مزید صدمہ نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔

رات گئے ہمیں حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا اور ہم مارے ڈر کے تقریباً تھر تھر کانپ رہے تھے۔ لب تھے کہ بار بار خشک ہوئے جاتے تھے۔ پھر ہمیں یوں محسوس ہوا کہ کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ ہم نے ساری شرم ورم رکھی طاق پر اور جلدی سے باریک ڈوپٹے کے گھونگٹ کے پار دیکھا تا کہ جتنی جلد صاحب تصویر کے درشن ہو جائیں بہتر ہے۔ مگر وہاں تو کوئی اور صاحب کھڑے تھے۔

''ارے یہ کون ہیں اور اندر کس خوشی میں آ گئے۔'' ہم اور گھبرا گئے۔ سیاہ گھنے بال، ایک لٹ پیشانی پر جھک کر دائیں ابرو کو چومتی ہوئی صاف ستھرا صحت مند رنگ۔ دراز قد، سمارٹ بدن سفید شلوار اور قمیص میں۔ چھوٹی سی سیاہ عربوں جیسی ڈاڑھی، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، ستواں ناک۔ وہ آگے بڑھے اور سامنے آ گئے ہم نے کانپتی آواز میں بمشکل کہا!'' آپ کون ہیں اور یہاں کہاں گھسے چلے آ رہے ہیں۔''

وہ ایک لمحے کو حیرت زدہ رہ گئے۔ کیا واقعی یہ آواز اسی گھونگٹ میں سے برآمد ہوئی تھی۔

''میں کون ہوں تم نہیں جانتیں۔''

ارے یہ تو خواہ مخواہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں تو تڑاخ پر اُتر آئے۔'' آپ یہاں سے فوراً تشریف لے جایئے ورنہ ہم کسی کو آواز دیں گے۔''

وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔'' بڑے شوق سے، جسے چاہے آواز دو۔ ویسے تمہاری

اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ کمرہ اس خادم کا ہے، البتہ تم یہاں کیوں براجمان ہو۔"

"یہ آپ کا کمرہ ہے۔ سچ مچ۔" ہم نے گھبرا کر پوچھا۔ "ہائے اللہ ہمیں ضرور کوئی یہاں غلطی سے بٹھا گیا ہے۔ ہائے اب کیا ہوگا۔ کیا کریں اب، ہم تو کسی کو جانتے بھی نہیں۔ ہمارے ساتھ ہماری خالہ آئی تھیں وہ بھی پتہ نہیں کہاں ہوں گی۔"

"براہ کرام زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کریں۔ یہ اس وقت سے کیا تم تم لگا رکھی ہے جیسے بڑی پرانی واقفیت ہو۔"

وہ صاحب مسکرائے۔ "بہتر ہے جناب والا۔ جیسے آپ کا حکم۔ ویسے آپ ہیں کون محترمہ۔"

"پہلے آپ بتایئے آپ کون ہیں۔ میرے بارے میں تو آپ جانتے ہیں۔ آخر شادی میں شریک ہوئے ہی ہوں گے۔"

"اچھا تو آپ دلہن صاحبہ ہیں؟" انہوں نے ذرا حیرت سے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تو کیا میں کوئی بندریا نظر آ رہی ہوں۔" ہم صاف بُرا مان گئے۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔ "باتوں سے تو کچھ ایسا ہی شک ہو رہا ہے۔ مگر یہ لال جوڑا اور زیور وغیرہ غالباً بندریاں تو نہیں پہنتیں۔ ہیں نا۔ خیر تو دلہن صاحبہ آپ کو کس نے غلطی سے مابدولت کے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔"

"یا پھر آپ غلطی سے اپنا کمرہ چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا گھپلا ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ سے ہی غلطی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے چلے جایئے۔ ابھی وہ آ جائیں گے۔"

"وہ کون۔"

"وہی ہمارے شیخ چلی......" اور اگلے ہی لمحے ہم نے اپنی زبان دانتوں سے کاٹ ڈالی۔ یہ کیا غضب ہو گیا۔ ہمارے منہ پر اس قدر یہ لفظ چڑھ چکا تھا کہ بے ساختہ زبان سے پھسل پڑا۔

"کون میں سمجھا نہیں۔"

"ارے بھئی کون آتا ہے کمرے میں۔ ظاہر ہے کہ دولہا ہی آئے گا نا۔"

"اچھا" انہوں نے لمبی سی اچھا کی۔ "تو آپ کے دولہا کا نام شیخ چلی ہے۔ کارڈ پر تو

کچھ اور لکھا تھا۔"

"بھئی خدا کے لیے آپ جائیے۔ کیوں میری زندگی برباد کرنے پر تل گئے ہیں۔ پہلے ہی میں کون سی بڑی....." اور ہم پھر چپ ہو گئے کہ اجنبی سے زیادہ پرسنل باتیں کرنا مناسب نہیں۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ جیسے ہی دولہا آئے گا ہم چلے جائیں گے۔"

"آخر آپ ان کے کیا لگتے ہیں جو یہاں چپک کر رہ گئے ہیں۔"

"وہ میرا ہم زاد ہے۔"

"ماموں زاد، چچا زاد تو سنا ہے یہ ہم زاد کیا بلا ہوتی ہے۔"

"ابھی تھوڑی دیر میں اس بلا کا اسرار کھل جائے گا۔"

ہم خاموش ہو گئے۔ وہ بھی خاموش بیٹھے تھے۔ ہم نے گھونگھٹ میں سے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ بڑے سکون اور اطمینان سے جیسے وہی دولہا ہوں۔

ہمیں پھر پریشانی شروع ہو گئی۔ ہمارے چچا چھکّن کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا اور یہ نہ جانے کون مزے سے بیٹھے تھے۔ اگر لوگوں کو پتہ چل گیا کہ دلہن کے کمرے میں ایک شخص گھسا بیٹھا ہے تو کیا ہو گا۔ کتنی بدنامی ہو گی۔ ہمیں پسینہ آ گیا۔ مارے گھبراہٹ کے زبان لڑکھڑانے لگی۔

"دیکھیے ہم پردہ کرتے ہیں اور آپ نامحرم ہیں۔ خدا کے لیے چلے جائیے۔ ہماری شادی بالکل غیروں میں ہوئی ہے۔ ہم یہاں کے طور طریقے رسم و رواج بالکل نہیں جانتے۔ شاید یہاں دولہا سے پہلے دولہا کا ہم زاد آتا ہو۔ مگر ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں ہے۔ آپ اگر تشریف لے جاتے تو اچھا رہتا۔"

"آپ کے شیخ چلّی آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ وہ آئیں تو ہم جائیں۔ ویسے بے فکر رہو۔ ہم زادوں سے پردہ تھوڑی ہوتا ہے۔ وہ بھی محرم ہی ہوتے ہیں۔ اگر تھک گئی ہو تو گھونگھٹ ہٹادو، لیٹ جاؤ یا جو دل چاہے کرو۔"

عجیب ڈھیٹ واقع ہوئے تھے یہ ہم زاد بھی۔ اسی اطمینان سے بیٹھے تھے بلکہ نیم دراز ہو گئے تھے۔ پھر وہ خود ہی بولے! تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں اصل دولہا نہیں ہوں۔ کیا تمہیں دولہا سے شرف ملاقات حاصل ہو چکا ہے۔"

''واہ یہ کیا بات ہوئی۔ ان سے نہ سہی ان کی تصویر کے تو نیاز حاصل ہو چکے ہیں۔''

''تو کیا اس تصویر میں اور مجھ میں کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔''

''کمال ہے۔ آپ دونوں میں مشابہت کا کیا سوال۔ کیا وہ آپ کے بھائی وائی ہیں۔''

''بھائی وائی نہیں۔ ابھی پہلے عرض کیا تھا نا کہ ہم زاد ہیں اور ہم زادوں کی شکل وصورت ایک سی ہوتی ہے۔''

''آپ میرا انداق اُڑا رہے ہیں۔ آپ دونوں کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان کے سر پر بال نہیں ہیں اور آپ کے سر پر ٹوکرا بھر بال ہیں۔''

''انہوں نے اپنے سیاہ چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔''حیرت انگیز اور کیا فرق ہے۔''

''ان کی ناک آپ سے لمبی ہے۔ وہ آپ سے دبلے ہیں اور ان کی ڈاڑھی......''

''ہاں ہاں ان کی ڈاڑھی۔''

''مختلف ہے۔''

''کیا مطلب۔ یہ کون سی تصویر ہے۔ کسی نے غلط تصویر تو نہیں بھیج دی شرارت سے۔''

''سنا ہے حج کے بعد کھچوائی تھی۔''

''اوہ!'' وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔''خاصی باریک بینی سے اس تصویر کا معائنہ کیا گیا تھا۔ میری بھولی بہن کو اور کوئی نہ ملی تو اس نے وہی بھجوادی۔ تو محترمہ آخر سات سال گزر گئے ہیں۔ اتنے عرصے میں میرا خیال ہے بال اُگ آتے ہیں اور پھر وزن بھی انسان کا کم اور زیادہ ہوتا رہتا ہے۔''

ہم نے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ آنکھیں اور منہ حریت سے کھلا ہوا تھا۔ تو یہ تھے ہمارے شیخ چلی، چچا چھکن، میاں خوجی اور نہ جانے کیا کیا۔

☆☆☆

آمنہ اقبال

پکائی تھی کھیر

اشفاق ہوائی جہاز سے اُتر کر ایئر پورٹ سے نکلا ہی تھا کہ آصف نے اپنے دوست کو خوش آمدید کیا۔ بھینچ کر گلے لگایا اور پھر اس کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لیتے ہوئے اسے اپنی کار تک لے گیا۔ کار چل نکلی تو اشفاق نے آصف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا! ''یہ دوسری دفعہ ہے کہ تم نے تار دے کر پھر اسی کام کے لیے طلب کیا ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟'' آصف بولا! ''کام بھی تو اتنا ہی اہم ہے۔ تمہارے مشورے کے بغیر کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں؟''

''میاں لڑکی چننا کہاں کا اہم کام ہے؟ بس لڑکی ہو، چہرہ مہرہ ٹھیک ہو، قد کاٹھی درست اور راضی ہو، تو پڑھالو دو بول!''

''دوست' چہرے مہرے ہی کے لیے تمہاری پسند معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔''

''مگر شادی تم نے کرنی ہے۔ پسند مجھ سے کراتے ہو۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔''

''دیکھو اشفاق۔ سیدھی سی بات ہے۔ یوں تو میں یہ کام کسی نائی یا نائن کو سونپ سکتا تھا لیکن نائیوں کے بس کا کام نہیں۔ اس کے لیے کسی تعلیم یافتہ اور ہمدرد دوست کی ضرورت ہے اور بہر حال میں تمہیں نائیوں پر ترجیح دیتا ہوں۔''

''اس نوازش کا شکریہ۔ مگر تعلیم اور ہمدردی والی خوبیاں تو تمہارے کئی دوسرے دوستوں میں بھی ہیں۔ آخر مجھے اتنی دور سے بلا کر لڑکی جانچنے میں کیا حکمت ہے؟''

''حکمت میرے پیارے دوست یہ ہے کہ لڑکی امریکن ہے اور تم پورے پانچ سال امریکہ میں پلتے اور پڑھتے رہے ہوں۔ اتنے نازک مسئلہ میں تم سے زیادہ ایکسپرٹ مشورہ کون دے سکتا ہے؟''

''تو یہ بات ہے! لیکن صاحب زادے، میں امریکہ میں انجینئرنگ پڑھتا رہا ہوں۔ دلہنوں کو پرکھنا میرے سلیبس میں شامل نہ تھا۔''

''او یار، تم اس سے میکینکی لہجے میں انگریزی تو بول سکو گے اور بہر حال میری چھٹی حس بتاتی ہے کہ اگر تم نے اسے پاس کر دیا تو میرے لیے بڑی صحیح بیوی ثابت ہوگی۔''

''تحریری نہیں، تقریری۔ اس کے ماں باپ ہماری سڑک پر ہی قریب کے بنگلے میں رہتے ہیں۔ لڑکی دیکھی تو یوں بھی جا سکتی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ انٹرویو کے لیے تم ان کے گھر ''کال'' کرو۔''

''کیا تم ''کال'' کر چکے ہو؟'' اشفاق نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''لڑکی سے علیک سلیک ہوئی ہے؟''

''نہیں بس ذرا فاصلے سے دیکھی ہے..... گویا صرف ''سلیک'' ہوئی ہے۔''

''خوبصورت ہے؟''

''بھئی سچی بات ہے تا حال اسے سامنے سے نہیں دیکھا۔''

''تو کیا اس کی پیٹھ سے عشق ہو گیا ہے۔''

''صرف پیٹھ ہی سے نہیں اس کے بالوں سے بھی جو سونے کے ڈھیر ہیں، اس کے بازوؤں سے بھی جو مرمر کی شاخیں ہیں۔ اس کے قد سے بھی جو سرو کا بوٹا ہے۔ بس، تم روبرو ہو کر اس سے دو باتیں کر کے اتنی تصدیق کر دو کہ وہ واقعی میرے خواب کی تعبیر ہے۔''

''مگر میرے شاعر یار، مجھے کیا معلوم تمہیں کیسے کیسے ٹیکنی کلر میں خواب آتے ہیں۔ میں تو زیادہ سے زیادہ تمہیں یہ بتا سکوں گا کہ وہ میرے خواب کی تعبیر ہے یا نہیں۔''

''چلو منظور!'' آصف نے وفورِ شوق سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے تمہیں بھی بڑے معیاری خواب آتے ہوں گے۔''

گاڑی آہستہ آہستہ آصف کی کوٹھی میں داخل ہونے لگی تو اشفاق بولا!

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری امریکی محبوبہ کا حریم ناز کس طرف ہے؟''

''ایک کوٹھی چھوڑ کر دوسری۔'' آصف نے ادھر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا دوربین سے دیدار کیا کرتے ہو؟" اشفاق نے پوچھا۔

"نہیں وہ دور سے بھی چمکتی ہے۔ ہیرا ہے ہیرا!"

آصف نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی تو اشفاق باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"دیکھو پہلے مجھے ذرا غسل کر لینے دو۔ پھر چائے پیتے ہیں اور پھر تازہ دم ہو کر تمہاری شادی کا بندوبست کرتے ہیں۔" میں انشاءاللہ چار بجے ان کے گھر جاؤں گا۔

ابھی تین ہی بجے تھے، لیکن آصف بے تاب ہو رہا تھا۔ اُس نے نوکر کو چائے کا حکم دیا اور خود چمن میں بیٹھ کر بے صبری سے اشفاق کا انتظار کرنے لگا۔ بلکہ ہر چند منٹ کے بعد اپنے سسرالی بنگلے کی طرف نگاہ دوڑاتا کہ شاید وہ سروِ رواں نظر آ جائے۔ کوئی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ آصف کے کان میں آواز آئی۔

"تو جناب۔ اب سنائیں اپنی داستان محبت اور ذرا تفصیل سے۔"

یہ اشفاق کی آواز تھی جو غسل سے فارغ ہو کر آصف کی طرف چمن میں آ رہا تھا۔ آصف اشفاق کی سنجیدگی اور ہمدردی پر خوش ہوا، بولا!

"معلوم ہوتا ہے اس دفعہ تم سچ مچ میری شادی میں گہری دلچسپی لے رہے ہو"

"دلچسپی تو میں نے پچھلی دفعہ بھی اتنی ہی گہری لی تھی، فقط یہ کہ لڑکی بھینگی نکل پڑی حالانکہ مجھے بلانے سے پہلے تمہیں کم از کم اس کی آنکھوں کی چال دیکھ لینا چاہیے تھی۔"

"وہ غلطی ہو گئی تھی آصف شرمندگی سے بولا۔" معافی چاہتا ہوں۔ مگر مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں کٹتا۔ یہ لڑکی ہر لحاظ سے اے ون ہے!"

"کس کس لحاظ سے؟ ذرا اس مہوش کا مزید حدودِ اربعہ بیان کرو۔"

"یار کہہ تو چکا ہوں، قد کی لمبی ہے۔ جسم کی پتلی ہے۔ بال سنہری ہیں، قومیت امریکی ہے......"

"اور چونکہ امریکی ہے۔" اشفاق نے گرہ لگائی۔ "لہٰذا سرخ ہے۔ سپید ہے، براق، برندہ ہے......"

"بالکل بالکل، آصف نے تائید کی۔ "اتنی سرخ، اتنی سپید کہ پچھلی نہ سہی، اگلی سات پشتوں کی قلعی ضرور کر دے گی۔"...... یہ کہہ کر آصف ہنس پڑا۔

''مگر تمہارا اپنا وائٹ واش کون کرے گا؟'' اشفاق نے ذرا شرارتی انداز میں پوچھا۔

''میرے امریکہ پلٹ دوست'' آصف نے طنزاً کہا! ''یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ امریکی لڑکیوں کو ڈارک Dark اور ان دھلے، ان کٹے بالوں والے کھردرے مرد اچھے لگتے ہیں۔''

''یعنی تم جیسے؟''

''بالکل!'' آصف نے کسی قدر سینہ پھلا کر کہا۔

''مگر تمہارے چہرے پر تو مونچھ ہے نہ ڈاڑھی۔''

''بھئی، مونچھ ڈاڑھی بے شک زائد کوالیفکشن ہے مگر اصل چیز سر اور سینے کے بال ہوتے ہیں۔ ذرا دیکھو میرا سینہ'' اور یہ کہہ کر آصف نے اپنی قمیص کا تیسرا اور آخری بٹن بھی کھول دیا۔

''یہ جنگل تو میں صبح سے دیکھ رہا ہوں۔'' اشفاق نے آصف کے سینے پر نظریں جماتے ہوئے کہا لیکن لڑکیاں کوئی مکھی مچھر تو نہیں ہوتیں کہ ان بالوں کے جال میں پھنس جائیں۔''

آصف مسکرایا اور بولا! ''اشفاق، میرے پیارے یار، مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ لڑکیاں مکھیاں ہوتی ہیں یا مچھر مگر آج تک اس جال سے بہت کم بچ کر نکلی ہیں۔''

''چلو مان لیا مگر ایک امکان تو باقی ہے کہ یہ امریکی مکھی تمہاری ہزار خواہش کے باوجود تمہیں کنڈم کردے اور تمہارے جال کی طرف دیکھے بھی نہ۔ اگر یہ ہوا تو بڑی سبکی ہوگی۔''

''تم فکر مت کرو، اشفاق۔'' آصف اشفاق کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''یہ جال (اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) غیر ملکی مکھیوں کے لیے بھی اتنا ہی پُرکشش ہے۔''

''داد دیتے ہیں تمہارے اعتماد کی دوست'' اشفاق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مگر اب داد کا نہیں امداد کا وقت ہے۔ دیکھو چار بجنے والے ہیں۔''

''بجنے والے ہیں، بج تو نہیں گئے۔ ذرا دم لو۔ ابھی کھٹکھٹاتے ہیں تمہاری سسرال کا دروازہ۔''

چمن کی گھاس پر سنہری دھوپ کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ اشفاق آرام کرسی پر نیم دراز تھا اور آصف پاس کھڑا، جیبوں میں ہاتھ ڈالے، حسب عادت سامنے والی کوٹھیوں کی طرف متوجہ تھا۔ دفعتاً آصف کے منہ سے نکلا۔

''وہ دیکھو سامنے ٹیرس پر۔ پھر اپنا کتا لئے کھڑی ہے مگر......'' وہ جھنجھلا اٹھا۔

"جب بھی دیکھو، واپس مڑنے کو تیار ہوتی ہے۔"

اشفاق نے فوراً اُٹھ کر دیکھا۔ واقعی ایک پتلی، نازک سی، سنہرے بالوں والی لڑکی نیلی جینز اور لال جرسی پہنے، پشت کیے، اپنے سفید بالوں والے کتے کے پیچھے بھاگتے سیڑھیاں اُترتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

"چار بج چکے ہیں۔" آصف نے اشفاق کو گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔ "اب چلو بھی۔ اس وقت وہ گھر ہی میں ہے۔"

لیکن پیشتر اس کے کہ اشفاق کوئی حرکت کرتا، وہی سفید سفید نرم بالوں والا کتا، بھاگتا ہوا کوٹھی کی باڑ سے اندر آ گیا۔

"ہیلو ڈارلنگ"۔ آصف نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے یوں لپیٹ لیا جیسے برسوں کی گمشدگی کے بعد ملا ہو۔

"Love me Love my Dog" اشفاق نے آصف کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ بھی کہو۔ یہ اچھا شگون ہے" آصف کتے کو بازوؤں میں لپٹائے، پیار کرتے ہوئے بولا۔ دفعتاً کوٹھی کے آہنی گیٹ پر نازک سی انگلیاں بج اٹھیں۔ اشفاق اور آصف نے چونک کر دیکھا۔ گیٹ کے نیچے سے نازک سی چپل پہنے گلابی پاؤں جھانک رہے تھے۔ پھر ان کی نظریں اوپر اٹھیں تو گیٹ کے کنارے سے، سفید چمکتے ماتھے کی جھلک دکھائی دی، جس پر سنہرے بالوں کی لٹ گھر آئی تھی اور دو خوبصورت نیلگوں آنکھیں، تبسم بکھیرتی، اشفاق اور آصف پر مرکوز تھیں۔ گیٹ کی اونچائی کی وجہ سے وہ امریکی حسن کا شاہکار اگرچہ پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا تاہم اشفاق یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ آصف کا انتخاب واقعی لاجواب ہے۔

"Come in" آصف نرم نرم بالوں سے سر اٹھاتے ہوئے بے ترتیب سانسوں کے درمیان بولا۔

اور پھر دھیرے سے گیٹ وا ہوا۔ اور ایک دبلا پتلا نازک سا وجود اندر داخل ہوا

I am John, I have come to fetch my dog

"(میں جان ہوں۔ میں اپنا کتا لینے آیا ہوں!)"

اور کتا اب آصف کے بازوؤں سے برسرِ پیکار تھا۔

مآخذات

افسانہ	مصنف	مآخذ
۱۔ میٹھا معشوق	چودھری محمد علی ردولوی	کشکول محمد علی شاہ فقیر چودھری محمد علی ردولوی
۲۔ گھر	آوارہ	اردو ادب میں طنز و مزاح از غلام احمد فرقت کاکوروی
۳۔ عینک اُتر جانے کے بعد	مضحک دہلوی	اردو ادب میں طنز و مزاح از غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ ولی کامل	ظریف دہلوی	خاں صاحب۔ ظریف دہلوی
۵۔ حضت وہ تو نکل گئے	سید رفیق حسین	سوغات ۵ (دورِ دوم) مدیر محمود ایاز
۶۔ یکہ	مرزا عظیم بیگ چغتائی	مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی مرتبہ صلاح الدین محمود
۷۔ خاندانی قبرستان	چراغ حسن حسرت	سدابہار مزاحیہ تحریریں مرتبہ: فاروق ارگلی
۸۔ شہید	کنہیالال کپور	آج کل اور طنز و مزاح مرتبہ: محبوب الرحمٰن فاروقی
۹۔ رضائی	شوکت تھانوی	آج کل اور طنز و مزاح مرتبہ: محبوب الرحمٰن فاروقی
۱۰۔ مینڈک کی گرفتاری	کرشن چندر	مزاحیہ افسانے۔ کرشن چندر
۱۱۔ تربوز	وجاہت علی سندیلوی	دودھ کے دھلے از وجاہت علی سندیلوی

۱۲۔ یوسفِ ثانی	کرنل محمد خاں	شگفتہ افسانے مرتبہ: خالد ندیم
۱۳۔ بلڈ پریشر	شفیق الرحمٰن	حماقتیں شفیق الرحمٰن
۱۴۔ زیبرا اسکیم	محمد خالد اختر	سوغات ۶ (دورِ دوئم) مدیر محمود ایاز
۱۵۔ ترپ چال	مسعود مفتی	سر راہے از مسعود مفتی
۱۶۔ مہمان	مظفر حنفی	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح مرتبہ: مظفر حنفی
۱۷۔ سرکار بنام سوئی مہیوال	جمال درّانی	فکاحیہ افسانے، از جمال درّانی
۱۸۔ عمر بھر کا ساتھ	پرویز یداللہ مہدی	چھیڑ چھاڑ، از پرویز یداللہ مہدی
۱۹۔ کوئے ملامت	سلمیٰ یاسمین نجمی	سدا بہار طنز و مزاح مرتبہ: ڈاکٹر صفدر محمود
۲۰۔ پکائی تھی کھیر	آمنہ اقبال	سدا بہار طنز و مزاح مرتبہ: ڈاکٹر صفدر محمود